13,126

مِلّت کے چراغ

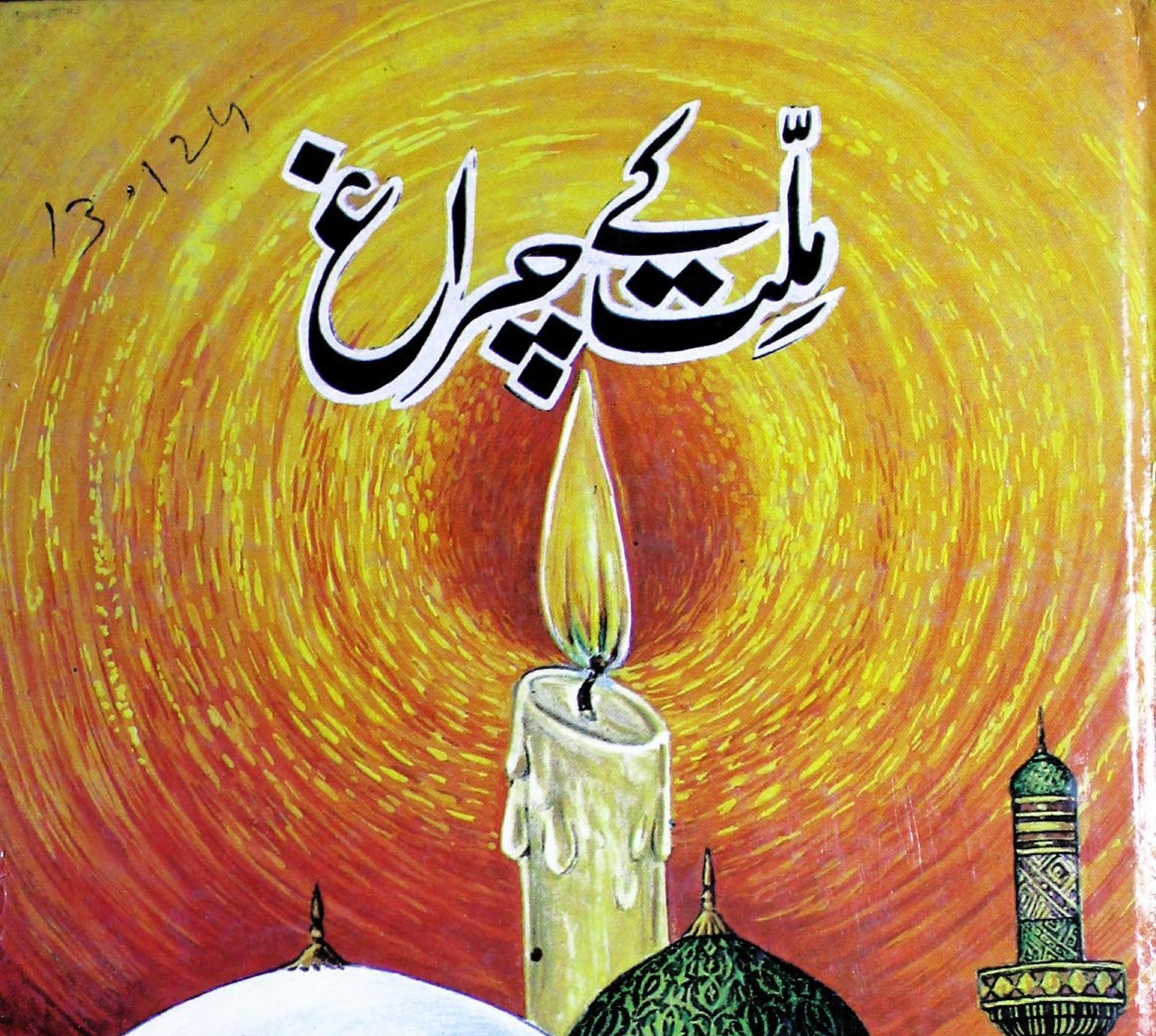

اختر حسین شیخ

ملّت کے ان روشن چراغوں کی
پاکیزہ داستان
جنھوں نے تاریکیاں دُور کیں

مِلّت کے چراغ

اختر حسین شیخ

ملّت کے ان روشن چراغوں کی
پاکیزہ داستان
جنہوں نے تاریکیاں دُور کیں

ملّت کے چراغ

اختر حسین شیخ

مَکتبہ اَلقُریش، سَرکلر روڈ، اُردُو بَازار، لاھور ۲

98229

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ☜ عبدالحفیظ قریشی
باہتمام ☜ محمد علی قریشی
مطبع ☜ نیر اسد پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ ☜ خرم آرٹس لاہور
سن اشاعت ☜ 1998
تعداد ☜ 1100
قیمت ☜ =/150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

انتساب

اتفاق فونڈری کے بانی، نیک دل انسان میاں محمد شریف کے نام جن کی حب الوطنی اور خدا خوفی شک و شبہے سے بالاتر ہے۔

ترتیب

حضرت فیض عالم رحمۃ اللہ علیہ ____ 9

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ____ 96

حضرت مادھو لال حسین رحمۃ اللہ علیہ ____ 187

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ ____ 300

پیش لفظ

زیر نظر کتاب ”ملت کے چراغ“ کی تین کہانیاں‘ فیض عالم‘ مادھو لال حسین“، حضرت میاں میر بالا پیر“ وطن عزیز کے موقر جریدے سرگزشت میں اشاعت پذیر ہو کر قارئین سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں قارئین کرام کی خواہش کے احترام میں ان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا خیال آیا تو محترم معراج رسول مدیر مسئول سرگزشت سے رابطہ کیا گیا‘ انہوں نے بکمال مہربانی و شفقت اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔ اصل میں موصوف کا مزاج‘ اپنے انداز میں زبان اردو کی خدمت سرانجام دینا ہے اس کے علاوہ یہ کہانیاں بار بار پڑھی جانے والی داستانوں کے زمرے میں آتی ہیں۔

مصنف اس نوازش پر مدیر مسئول و مالک ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کا تہہ دل سے ممنون ہے۔

اختر حسین شیخ

فیض عالم

اس ہستی کا ذکر خیر جس کی آمد سے تاریک برصغیر پاک و ہند جگمگا اٹھا۔ اندھیروں میں روشن ہونے والے اولیں چراغ کی کہانی۔ اس درویش بے ریا کا قصہ جو برصغیر میں داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہوا ــــ وہ ہستی جس کے آستانے سے حضرت معین الدین چشتی، نظام الدین اولیا، شاہ حسین جیسی ہستیوں نے فیض حاصل کیا۔ اس ولی اللہ کی داستان حیات جسے فیض عالم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

مسافر کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ دمشق سے غزنی اور غزنی سے لاہور تک کا یہ سفر بڑا طویل اور تھکا دینے والا تھا جو رہ عشق کے مسافر نے اپنے دو ساتھیوں کی ہمراہی میں طے کیا تھا۔

اس دور کے سفر کا عصر حاضر کی مسافرت سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج تو مسافروں کو کانچ کے بنے ہوئے نازک ظروف کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے جبکہ اس دور میں، قدم قدم پر دشواریاں حائل ہوا کرتی تھیں۔ یہ لمبا سفر اطاعت مرشد کی خاطر کیا گیا تھا، لہٰذا مسافر نے ہر صعوبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ سفر منفرد نوعیت کا حامل تھا تو مسافر بھی دست وفا پر، دل سجا کر پیش کرنے کی ہمت کا مالک تھا۔ اجنبی سرزمین پر ایک اور دشواری اس کی منزل تک رسائی میں حائل ہوئی۔ سورج صف لپیٹ کر غروب ہو چکا تھا اور غبار شام کے اترتے ہی شہر پناہ کے دروازے بند کئے جا چکے تھے۔ یہی اس پر آشوب زمانے کا دستور تھا۔

دوران سفر ایک الجھن سی ضرور تھی جس نے مسافر کو سپرد اضطراب کئے رکھا تھا۔ اس دیار غیر لاہور میں اس کا پیر بھائی پہلے ہی رشد و ہدایت کی شمع فروزاں کئے بیٹھا تھا، لہٰذا مرشد کامل کا حکم دل میں خلش پیدا کر رہا تھا۔

"حضور! ایک میان میں دو تلواریں؟ ایک ریاست میں دو حکمران؟ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔" ایک ساتھی حرف مدعا زبان پر لانے سے باز نہ رہ سکا، جیسے وہ بھی اپنے راہ نما کی کیفیت سے آشنا ہو۔

"عزیزم! یہ ریاست دل کی مملکت ہے۔" مسافر نے تسلی آمیز لہجے میں فرمایا "اس میں دو کیا دس حکمران بھی سما سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ریاست دل میں حکمرانوں کی حیثیت، دودھ سے لباب بھرے کٹورے میں گلاب کے پھول جیسی ہوتی ہے۔ نقل مکانی کے اس حکم کو ایک اور انداز سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔"

دونوں ساتھی سوالیہ نگاہوں سے ہم سفر کے رخ روشن کو بغور دیکھنے لگے۔

"تاریکی اگر حد سے تجاوز کر جائے تو بیک وقت وہ چراغ روشن کرنے میں مضائقہ نہیں۔"

راہ نما نے ساتھیوں کی تسلی تو کر دی مگر اس کا اپنا دل مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ پیر و مرشد

کا حکم سفر اب بھی اس کے لئے ناقابل فہم سا تھا۔ اپنے اندر کو مطمئن کرنا بڑا ہی دشوار مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ وہ شب تاریک، رہ عشق کے مسافر نے فصیل شہر کے باہر بسر کی۔ طلوع آفتاب کے بعد مرشد کے حکم سفر میں پوشیدہ حکمت آشکار ہوئی۔ غم واندوہ کی تصویر بنے چند افراد، بصد احترام جنازہ لئے فصیل شہر کے مشرقی حصے سے باہر آ رہے تھے۔

"عزیزان گرامی! یہ کس ہستی کا سفر آخرت ہے؟" مسافر نے تجسس سے دریافت فرمایا۔

"جناب! ہمارے سروں سے آج ابر رحمت کا سایہ اٹھ گیا۔" ایک شخص نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا "آج اس شہر کا روشن ترین چراغ گل ہوا۔ یہ جنازہ ولی وقت میراں حسین زنجانی کا ہے۔"

مسافر تو بس دھک سے رہ گیا۔ اس نے بغور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور چشم تصور میں، مرشد سے آخری ملاقات کا سارا نقشہ پھر گیا۔ ان کا سرزمین لاہور کی جانب حکم سفر، اپنا استفسار، ان کی مسکراہٹ بھری خاموشی پھر لیت و لعل سے گریز کی ہدایت، ساری باتیں سمجھ میں آتی چلی گئیں۔

برصغیر کے افق پر طلوع ہونے والا یہ آفتاب عالم تاب سید ابوالحسن علی بن عثمان بن علی ہجویری الجلابیؒ کی ذات بابرکات تھی جنہیں عرف عام میں داتا گنج بخشؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے دو ساتھی سید احمد حمادی سرخسی اور شیخ ابوسعید ہجویری تھے۔ یہ عہد غزنوی خاندان میں سلطان مسعود بن محمود غزنوی کا تھا۔ 431ھ میں سید علی ہجویریؒ نے سرزمین لاہور پر قدم رنجہ فرمایا تو برصغیر دور تاریکی میں مبتلا تھا۔ اس گہری تاریکی کی مناسبت سے کوئی ایسا ہی روشن چراغ مطلوب تھا جو شب سیاہ کے پرخچے اڑا سکے۔ بیت الجن دمشق میں زینت اوتار شیخ ابو الفضل محمد بن الحسن ختلیؒ نے اپنے ہونہار شاگرد رشید علی ہجویریؒ سے ارشاد فرمایا "عزیزم! سرزمین لاہور کی جانب کوچ کر جاؤ۔"

"حضور! وہاں تو برادر بزرگ حسین زنجانی شمع ہدایت روشن کئے بیٹھے ہیں۔ مجھ ناچیز کی کیا ضرورت آن پڑی؟" سید موصوف نے بصد احترام سوال کیا۔

"عزیزم! یہ لیت و لعل کا موقع محل نہیں...... رخت سفر باندھو اور کوچ کر جاؤ۔" مرشد نے متبسم لہجے میں فرمایا۔

یہاں اس مکالمت کی وجہ سے پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب دینا بے حد ضروری

ہے جو کج فہمی کی بنا پر ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ سید علی ہجویریؒ سے عقیدت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس گفتگو کی تشریح کر دی جائے۔ مرشد کے ہر حکم کی بجا آوری مرید کا فرض ارادت مندی ہے اور رہے گا۔ سلوک میں سر تسلیم خم کرنے ہی سے سربلندی نصیب ہوتی ہے تو پھر اس تناظر میں سید موصوف نے سوال کیوں کیا؟ کیا واقعی لیت و لعل سے کام لیا جا رہا تھا یا حقیقت کچھ اور تھی؟ جو ہستی رہ سلوک میں فنا فی الشیخ ہونے کا حوصلہ رکھتی ہو' جو اندوہ وفا کی کتاب میں نئے باب کا اضافہ کرنے والی ہو' اس کی زبان پر "کیوں؟ اور کیسے" واقعی مناسب معلوم نہیں ہوتے مگر اس کی گہرائی میں اتریں تو وضاحت ہو جاتی ہے اور سید موصوف کا سوال نامناسب معلوم نہیں ہوتا۔

پہلی بات جو گرہ میں باندھنے والی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے سے باخبر صرف اور صرف ذات باری تعالیٰ ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ وہ ذات' مائل بہ کرم ہو کر' مخلوق کو جتنا اور جس قدر چاہے علم عطا کر دیتی ہے۔ کائنات کی سب سے بڑی الہامی کتاب قرآن حکیم' اس علم کو بھی "قلیل" گردانتی ہے۔ گویا ولی' غوث' قطب ابدال غرض ہر نوع کی مخلوق کا علم' خالق کی عطا کے تابع ہوتا ہے اور کسی ایک مقام پر مخلوق "بے خبر" ضرور ہوتی ہے۔ بے خبری عیب ہے نہ گناہ۔ اس انسانی صفت کے خلاف بڑی بڑی ہستیوں نے جدوجہد کی جو ہر لحاظ سے جائز قرار دی جا چکی ہے۔ تجسّس کو دور کر کے اطمینان قلب کا حصول تو سنت ابراہیمی ہے۔ یہ راستہ تو جد ابنیا نے دکھایا تھا۔

"میرے معبود! ذرا چشم تماشا کی تسکین تو فرما' تو کیسے مردے کو زندہ کر دیتا ہے؟" خلیل اللہؑ حرف مدعا زبان پر لائے۔

"کیا تجھے یقین نہیں کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں؟" خالق نے پوچھا۔

"میرے معبود' ایسی تو کوئی بات نہیں' میں تیغ ایمان کا قائل تو ہوں مگر اب اس سے گھائل بھی ہو کر اطمینان قلب کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" سیدنا ابراہیمؑ نے جواب دیا۔

ثابت ہوا کہ اطمینان قلب کی خاطر تجسّس سے بھرپور سوال نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوتا ہے۔ یہ سیدھا سادہ طلب اور عطا کا معاملہ ہے۔ شدت طلب جتنی زیادہ ہو گی سوال اتنا ہی جستجو سے بھرپور ہو گا۔ یہ حقیقت کبھی بھی نظرانداز نہیں کرنی چاہئے کہ ایسے سوالات وجہ عدم ایمان یا ایمان کی کمزوری نہیں ہوا کرتے بلکہ ایمان کے درجات میں بلندی یا پختگی

مطلوب ہوا کرتی ہے۔ کائنات کی ارفع ترین کتاب اللہ سے تو اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ بھی تو حرف مدعا زبان پر لے آئے تھے۔ وہ تو جلوہ مطلق کے دیدار کے متمنی ہو بیٹھے تھے...... یہ الگ بات کہ "لن ترانی" جیسا جواب ملا۔ بد بخت سے بد بخت انسان بھی ایمان پیغمبر میں کمزوری کی جانب اشارے کی جرات نہیں کر سکتا۔

اس مکالمت سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ جواب دینا مسئول کی صوابدید پر منحصر ہوا کرتا ہے۔ مسئول جو بہر حال سوالی سے بلند درجے پر فائز ہوتا ہے اس کی بہتری کو مد نظر رکھتے ہوئے معروضی حالات کے تناظر میں جواب عطا فرماتا ہے ...... دمشق مں ابو الحسن ختلیؒ نے سوالی کو لیت و لعل سے گریز کی تلقین ہی مناسب سمجھی۔ دوسری بات جو موصوف کے پیش نظر تھی وہ برصغیر پر چھائی ہوئی ادبار کی گھٹاؤں کے لئے شیخ وقت کی رحلت سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے لئے مناسب ترین روشن چراغ کا انتخاب تھا۔ گویا اس تاریکی کی مناسبت سے کسی ایسے سنگ آفتاب کی اشد ضرورت تھی جس کے آنے سے شب سیاہی مانند آئینہ بکھر کر رہ جائے ...... اس دور میں وہ ذات علی ہجویریؒ ہی کی ہو سکتی تھی۔ اندھیرا بے مثال تھا تو چراغ بھی لاجواب ثابت ہوا۔

ایک اندھیرا وہ ہوتا ہے جس میں آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اسے بصارت سے محرومی کہتے ہیں۔ دوسری نوعیت کا اندھیرا وہ ہوتا ہے جس میں دل پر پردے پڑ جاتے ہیں اور شعور بے اثر ہو جاتا ہے۔ اسے بصیرت کا اندھیرا کہا جاتا ہے۔ برصغیر بصارت و بصیرت دونوں اقسام کے اندھیروں میں ڈوب چکا تھا......

برسبیل تذکرہ وہ ساعت سیار بڑی ہی مبارک، بڑی ہی خوش بخت تھی جب محمود غزنوی نے اپنے اسپ تازی کی لگامیں سوئے ہندوستان موڑیں۔ "ہوتی آئی ہے کہ لوگ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔" کے مصداق لوگوں نے اپنے اپنے ظرف و شرف کے مطابق اس مرد وفا کیش کو بے سروپا الزامات سے نوازا۔ لٹیرا، ڈاکو، سیم و زر کا تمنائی اور جانے کیا کیا۔ بیگانوں کے ساتھ ساتھ چند اپنے بھی اس گروہ ملامت گراں میں پیش پیش نظر آتے ہیں مگر صداقت پسند نقادوں کے نزدیک ایسے "لقمانوں" کا تعلق تر لقمے اور محققوں کا، حقہ نوشوں سے ہونا چاہئے جو کج نظری کے طفیل بے پر کی ہانکتے ہیں۔

محمود غزنوی وہ مجاہد تھا جس نے سرزمین ہند کو نخل حرمت بونے کے لئے ہموار کیا۔ اس

سچائی سے البتہ انکار کی گنجائش نہیں کہ اس نخل روشن ضمیری کو سینچنے اور پروان چڑھانے والے زیادہ تر صوفیائے کرام تھے۔ اس نیک سرشت حلقے میں سید علی ہجویریؒ سرفہرست دکھائی دیتے ہیں۔ یہ حق پرستی کے علمبردار، شمشیروسناں کی زباں کے برعکس ہمدردی و شفقت کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے جو دلوں کی سلطنتیں تسخیر کرنے کا تیربہدف نسخہ ہے۔ سنت نبویؐ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے سید علی ہجویریؒ نے خلق خدا کے اندر کی سلطنت تسخیر کی...... بنیادیں کھودنے اور تعمیر و آرائش کے باقی مراحل میں جو واضح فرق موجود ہوتا ہے وہی افواج غزنوی اور گروہ صوفیا میں تصور کیا جانا چاہئے۔ دونوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

برصغیر کا شمال مغربی حصہ یا شمالی ہند ہی بیرونی تہذیبوں کی گزرگاہ رہا ہے۔ گویا ہر تہذیب کی آمد موجودہ پاکستان کے راستے برصغیر میں ہوتی رہی۔ بیرونی ہر تہذیب جب مقامی تہذیب سے ٹکرائی تو دونوں کے اتصال سے ایک نئی تہذیب جنم پزیر ہوئی۔ یہ تو تھی ایک کلئے قاعدے کی بات۔ برصغیر میں یہ عمل ذرا مختلف طریقے سے ہوتا رہا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو انکشاف ہوگا کہ برصغیر ہر تہذیب کے لئے کان نمک ثابت ہوا۔ آریائی تہذیب نے اپنا رنگ جمایا لیکن دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ساسانی، یونانی تہذیبیں بھی حملہ آور ہوئیں اور اپنے اپنے رنگ دکھا کر برصغیر میں دم توڑ کر رہ گئیں۔ البتہ ایک اسلامی تہذیب ایسی سخت جاں ثابت ہوئی جس نے اپنا الگ تشخص، ہر مقام پر قائم رکھا۔ اسلامی تہذیب کا ارتقا کن مراحل سے گزرا اور سید علی ہجویریؒ کی مساعی جمیلہ کا اس میں کس قدر اہم کردار تھا اس کی تفصیل میں جانے سے پیش تر ”تہذیب“ کی تشریح پیش خدمت ہے۔

سادہ الفاظ میں تہذیب سماجی اقدار کے نظام کا نام ہے۔ یعنی

"System of Social Values"

گویا تہذیب جغرافیائی یا سیاسی حقیقت سے الگ ایک سماجی حقیقت ہے۔ ریاست کی جغرافیائی سرحدیں با آسانی بدل جاتی ہیں مگر قومی تہذیب کی سرحدیں اتنی جلدی نہیں بدلا کرتیں۔ انگریزی زبان میں اس وحدت کے لئے لفظ ”کلچر“ مستعمل ہے جو لاطینی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معانی ہیں، زراعت کا عمل، کھیتی باڑی، ریشم کے کیڑوں کی افزائش نسل وغیرہ۔ اردو زبان میں اس کا متبادل لفظ ثقافت رکھا گیا۔

بنیادی لحاظ سے ”تہذیب“ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مفہوم پودوں کی تراش خراش

ہے تاکہ ان سے نئی کونپلیں پھوٹ سکیں۔ یہی لفظ جب فارسی میں آیا تو اس کا مفہوم ہوا "پاک و درست کردن و اصلاح نمودن" اردو میں عام طور پر یہ لفظ شائستگی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پنجابی میں "رہتل بہتل" دو الفاظ تہذیب کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔

دیگر ممالک کی طرح برصغیر میں بھی مختلف تہذیبوں کلا ٹکراؤ ہوتا رہا۔ مقامی طور پر اصلاحی تحریکیں جنم لیتی رہیں مگر مفاد پرست عناصر کے ہاتھوں ہر رفاہی تحریک رفتہ رفتہ معاشرے اور عوام الناس کے لئے وبال جان بنتی گئی۔ یہی وہ حالات ہیں جن کو بصیرت کا اندھیر قرار دیا جاتا ہے اور ان حالات ہی میں اجالے کی تمنا کی جاتی ہے۔

کرہ ارض پر امن و سکون سے زندگی بسر کرنا ہر ذی روح کا سہانا خواب رہا ہے۔ اس کے لئے اہل دانش راہ نمائی تجویز کرتے رہے ہیں۔ الہامی کتابوں کے نقطہ نظر کے مطابق راہ نمائی اوپر سے یعنی منجانب اللہ آتی رہی ہے مگر اہل غرض ابتدائے آفرینش ہی سے ان روحانی‘ دنیاوی راہنماؤں کی مخالفت میں اپنی انانیت کا اعلان کرتے رہے ہیں‘ اس لئے کہ ہر مصلح عدل و انصاف کا داعی رہا ہے‘ جب کہ مادہ پرست حکما بھی خلوص نیت سے اصلاح معاشرہ میں کوشاں رہے ہیں۔ تاہم اپنے نظریات کو دوسروں سے برتر ثابت کرنے میں وہ ایسے ایسے اصول تراش لیا کرتے تھے جو دوسروں کی حق تلفی کا جواز مہیا کرنے میں لاجواب ہوا کرتے تھے۔ ان ہی اصولوں کو اہل غرض نے مذہب کا لبادہ اوڑھایا۔ اپنے تئیں معاشرے کو پر سکون رکھنے کی سعی کرتے رہے۔ جن اصولوں کی بنیاد ہی ناانصافی پر استوار ہو وہ کبھی بھی امن و سکون کا ضامن نہیں ہو سکتے۔ یہی بات کرہ ارض پر وجہ فساد رہی ہے اور شاید تاقیامت رہے۔ برصغیر میں بوجوہ یہ فساد دوسرے ممالک کی نسبت زیادہ رہا ہے۔

آریاؤں کی برصغیر میں آمد سے پہلے‘ سماجی اقدار کا وہ نظام جو شمالی ہند بلکہ پورے برصغیر میں رائج تھا اس میں وادی سندھ کی تہذیب سرفہرست قرار دی جا سکتی ہے۔ دانش وروں کے بقول ہر ایسے سماجی نظام کی ترکیب چار عناصر پر استوار ہوتی ہے۔ کسی خطے کے طبعی حالات‘ انسانی گروہ کے زیر استعمال آلات ضرب و حرب اور کھیتی باڑی‘ نظام فکر و احساس اور سماجی قدروں کی نوعیت۔ ان چار عناصر ترکیبی کے طفیل ہر تہذیب ترقی کی منازل طے کرتی رہی یا تنزل و جمود کا شکار ہو کر صفحہ ہستی سے مٹتی رہی ہے۔

وادی سندھ کی تہذیب محتاط الفاظ میں امن و آشتی کی تہذیب تھی۔ افزائش فصل و

نسل کو وہ لوگ ہر چیز پر فوقیت دیتے تھے گویا یہی حیات انسانی کا محور تھا۔ روحانی راہنمائی کے فقدان کے نتیجے میں انسانی ذہن نے اپنی آسودگی کی خاطر چند قوانین بنا رکھے تھے جن کو وہ مذہبی حیثیت اور مقام عطا کرتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ معاشرہ "مادری" کہلاتا تھا۔ یعنی عورت کا مقام و مرتبہ، تخلیق کا سرچشمہ ہونے کی بنا پر سب سے بلند تھا۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ لوگ "وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" سے کئی قدم آگے بڑھ کر کارخانہ قدرت کو جسم انسانی کے حوالے سے دیکھنے کے عادی تھے۔ یعنی جس طرح مرد و زن کے ملاپ سے نئے وجود کی تخلیق ہوتی ہے اسی طرح کائنات کی دوسری اشیا معرض وجود میں آتی ہیں۔ اس تخلیقی عمل میں چونکہ نسوانی وجود کا کردار زیادہ اہم ہوتا ہے لہٰذا وجود زن کا مقام ارفع و اعلیٰ قرار دیا گیا۔ یہی "تنترک عقیدہ" ہے اور سانکھیہ فلسفے کی بنیاد بھی اسی عقیدے پر ہے (وادی سندھ میں محکمہ آثار قدیمہ کی کاوشوں سے جو ڈھیروں مورتیاں دستیاب ہوئی ہیں ان کے گہرے مطالعے کے بعد، ماہرین نے انہیں تنترک رسوم کی عکاسی قرار دیا) "تنتر" سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کا مفہوم پیدا کرنا، افزائش، پھیلانا وغیرہ ہے۔ اس فلسفے کی رو سے ساری کائنات، شکتی یعنی عورت اور پیروش یعنی مرد کے جنسی ہیجان کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی۔ بنابریں تنترک رسوم میں جسمانی حرکات اور وجود زن کے نقوش کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

سوانی (پوٹھوہار) کی قدیم ترین تہذیب کے متعلق البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس معاشرے میں دیوی، دیوتاؤں کی پرستش کا رواج نہیں تھا اور نہ وہ کسی مافوق الفطرت طاقت پر ایمان رکھتے تھے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک "حضری" معاشرہ تھا یعنی لوگ مل جل کر ایک جگہ رہنے کو ترجیح دیتے تھے گویا وادی سندھ کی تہذیب میں ریاست یا جغرافیائی حدود کا احساس زندہ تھا۔ آریاؤں سے پہلے کی یہ تہذیب کوئی دو ہزار پانچ سو برس پہلے عروج پر تھی۔ رفتہ رفتہ آریاؤں کی آمد سے نئے فساد کا آغاز ہوا۔ آریہ کسی خاصل نسل یا قوم کا نام نہیں۔ یہ وہ انسانی گروہ تھے جو خوارزم اور بخارا کی سرزمین پر خانہ بدوشوں ایسی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ انہوں نے دو ہزار ق۔ م کے لگ بھگ اپنی چراگاہوں سے نکل کر وسطی ایشیا سے جنوب مغربی ایشیا کا رخ کیا۔ ان خانہ بدوشوں کی زبان سنسکرت تھی اور سنسکرت میں بلند مرتبت اور آزاد انسان کو آریہ کہتے ہیں لہٰذا بھیڑ بکریاں پالنے والے یہ بدوی، آریہ کہلائے۔

ان کا معاشرہ ہندی معاشرے کے برعکس بدوی (یعنی حضری کے برعکس) ادھر ادھر نقل مکانی کرنے والا تھا۔ دوسرا بنیادی فرق ان کے ہاں رائج نظام کا تھی یعنی گھر اور قبیلے کا سربراہ مرد تھا۔ ذات پات کی تمیز تو ان میں بھی نہیں تھی مگر معاشرہ تین طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ چھتری یعنی جدال و قتال کے ماہر، برہمن مذہبی رسوم ادا کرنے والے اور ویش صنعت و حرفت کے ماہرین ان طبقات میں نسلی امتیاز ہرگز نہیں تھا۔ آپس میں شادی بیاہ جائز تھا۔ خاندانی وحدت کو گراما اور گھر کے بزرگ کو "گرامنی" کہتے تھے۔ (پنجابی کا گرائیں یا اردو زبان میں گھر، گھرانا آریاؤں کے گراما اور گرامنی سے ملتے جلتے الفاظ ہیں) ان لوگوں کی بود و باش کا تقاضا تھا کہ مستقل عبادت گاہیں نہ بنائیں چنانچہ ان میں مورتی پوجا یا بت پرستی کا رواج بھی مفقود تھا۔ یہ لوگ مظاہر قدرت کی پرستش کیا کرتے تھے۔ ان کے پانچ دیوتا بڑے اہم تھے۔ درونا (آسمان) اگنی، (آگ)، وایو (ہوا) مترا سورج اور اندرا (دیوتا جنگ)

یہ لوگ ہند میں بیک وقت وارد نہیں ہوئے بلکہ یہ سلسلہ کوئی ایک ہزار برس تک چلتا رہا۔ پہلے آنے والے قبائل اور بعد میں آنے والوں میں جنگیں بھی ہوئیں۔ یہ تماشا برصغیر میں جوبن پر رہا۔ ان کی چار دھرمی کتب مشہور ہیں یعنی رگ وید، سام وید، اتھروید اور یدھروید جن میں قدیم ترین کتاب رگ وید ہے جو 1500 ق م سے 1200 ق م میں لکھی گئی۔ بدوی معاشرے کی بناء پر یہ لوگ حضری معاشرے کی بہ نسبت زیادہ جفاکش اور جنگجو تھے لہٰذا قدیم ہندی اقوام پر غالب آ گئے۔ حد یہ کہ بعد میں آنے والے قبائل نے اپنے پیشرو قبائل کو وسطی ہند یعنی گنگ و جمن کے علاقے میں دھکیل دیا۔ ویدک تحریروں میں سات دریاؤں کی زمین ستلج، بیاس، راوی، چناب جہلم، سندھ اور اٹک کو سپت سندھو دیش کہا گیا ہے۔ یہی سات دریاؤں کی زمین بعد میں پانچ دریاؤں کی زمین یعنی پنجاب کہلائی۔ آریہ لوگ ریاست کو "راشٹر" کہتے تھے۔

بدوی طرز زندگی کو خیرباد کہہ کر جب یہ لوگ حضری طرز زندگی کی جانب لوٹے تو مقامی تہذیب کے ملاپ سے ان کے مذہبی عقائد میں زمین و آسمان کا فرق آ گیا۔ پہلا فرق تو یہ ہوا کہ اندرا جو جنگ و جدل کا دیوتا تھا ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ ان لوگوں نے شکتی دیوی، دھرتی ماتا اور شیوا کی پوجا کا آغاز کر دیا۔ یہ عقیدہ مقامی تہذیب سے اپنایا گیا جس میں شکتی دیوی پردھان تھی۔ شیوا کو مہالنگم کے مقام پر فائز کر کے درگا، پاروتی اوما وغیرہ کو اس کی زوجیت

میں دے دیا۔ یہ سب شکتی کے روپ تھے جو مقامی تہذیب نے اسے عطا کر رکھے تھے۔ اس طرح ہندی معاشرے میں بت پرستی کا رواج ہوا۔ مادری معاشرے کا نشان ہلال ہوا کرتا تھا جبکہ پدری معاشرے کی علامت سورج تھا۔ ہندوؤں کی پوجا کی موروتی کے تین چہرے ہیں یعنی برہما، وشنو اور شیوا جو گویا قوت واحدہ کے تین روپ ہیں۔ آسان الفاظ میں یہ تین چہرے تخلیق، تحفظ اور تخریب کی نمائندگی فرماتے ہیں۔

آریاؤں نے امتداد زمانہ کے ساتھ اپنے پرانے دیوتاؤں درونا، وایو اور اندرا کو یکسر بھلا دیا اور ان کی جگہ شیوا اور درگا کو مقام پرستش پر فائز کردیا۔ اس کے بعد لنگ (عضوتناسل) اور بیل کی پوجا کا آغاز بھی ہوگیا۔ یہ مرد و زن کے ملاپ والا قدیم مقامی عقیدہ تھا جو آریاؤں نے اپنالیا۔ بیل مردانہ تخلیقی قوت کی علامت تھا۔ وہ آزاد لوگ جو کسی دور میں مظاہر قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کیا کرتے تھے اب درگا، شیوا، لنگ وغیرہ کے بت بنا کر ان کی پوجا کرنے لگے۔ برہمنوں نے اپنے تحفظ کی خاطر ذات پات کے نظام کی ترویج و ترقی میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ایک چوتھی ذات شودر یعنی پنچ ذات کو اپنے معاشرتی نظام کا حصہ قرار دیا جسے برہما کے پاؤں کے میل سے تخلیق بتایا گیا اور انسانیت کی تذلیل کا باب کھول دیا۔

انسانی بصیرت کا یہ اندھیرا کس قدر گھناؤنا تھا اس کا مزید جائزہ لینے سے پیشتر اس لنگ یا لنگم پوجا کی وضاحت اشد ضروری ہے تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ آخر اس سرزمین کو روشن چراغ یا طلوع آفتاب کی کیوں ضرورت تھی۔

شکتی دیوی اور شیوا یا شو کے ملاپ سے افزائش نسل و فصل کا ترجمان عقیدہ لنگ پوجا پہ منتج کیسے ہوا؟ اس کے متعلق ہندو پران (مذہبی کتب) میں ایک عجیب و غریب ہیجان انگیز کہانی مرقوم ہے۔ سمپر دائے Hindu Sects کے مولف پروفیسر بی رائے صاحب نے ہندوؤں کے مختلف فرقوں پر مدلل بحث کی ہے۔ لنگ پوجا کی تفصیل بقول رائے صاحب کچھ اس طرح ہے۔

”شو اور دیگر دیوتاؤں کی پوجا میں ایک بنیادی فرق موجود ہے وہ یہ کہ شو جی کی پوری مورتی نہیں بنائی جاتی محض ان کے لنگ (عضوتناسل) کو لوگ پوجتے ہیں۔ لنگ پران میں (وہ مذہبی کتب جن میں لنگ کی تفصیل درج ہے) دو طرح کے شیو کا بیان ہے۔ النگ اور لنگ النگ شیو، نرگن اور اکرتا ہے۔ (نرگن، بمعنی ذات سرگن کا نقیض وہ ذات جو صفات انسانی

سے مبرا اور منزہ ہو۔ صفات ربی' پرمیشور جوست' رج اور تم' تینوں گنوں سے پاک ہے) پر لنگ شو جگت کا کارن ہے اور لنگ شیو' النگ شو سے نکلا ہے۔ (جگت کا کارن' **بمعنی** باعث تخلیق دنیا)"

لنگ کا **مہمہ** (عظمت بزرگی) کرنے کے لئے لنگ پران میں یہ قصہ مرقوم ہے۔ "پر لئے (دوسری دنیا پرلوک) کے سمندر میں ایک مرتبہ برہما اور وشنو میں سخت بحث ہو رہی تھی۔ برہما کہتا تھا کہ میں خلقت کا بانی ہوں اور وشنو کہتا تھا میں اس کا بانی ہوں۔ اس جھگڑے کو رفع کرنے کے لئے ایک نہایت حیرت افزا لنگ ظاہر ہوا جو فنا کرنے والی آگ کے مانند تھا اور جو ہزار ہا شعلوں کے مانند چمک رہا تھا۔ اس لنگ کے نظارے سے برہما اور وشنو دونوں حیران و پریشان ہو گئے اور اس کے آد' اور انت (ابتدا و انتہا) ڈھونڈنے کے لئے وشنو برہ کا روپ بدل کر پاتال کی طرف اترا اور برہما' ہنس روپ لے کر اوپر کی طرف اڑا۔ پر نہ نیچے نہ اوپر' اس لنگ کا آد' انت کہیں نہ ملا۔ سو دونوں پریشانی کی حالت میں واپس آئے اس لنگ کے آگے تھرتھرانے لگے۔ اتنے میں اچانک آکاش بانی ہوئی (فضا میں آواز گونجی) "اوم........اوم" اور لنگ کے پہلو میں اونکار کے تین حروف یعنی ا' و' م نظر آئے جس کا مطلب یہ ہے کہ لنگ ہی سرشٹی' **سھتیتی** اور ناش کا بانی ہے (یعنی تخلیق' تحفظ اور تخریب کا) اہل ہنود و شو اور شکتی دونوں کو اکٹھے ایک جھتی علامت میں پوجتے ہیں۔ لنگ پران میں لکھا ہے کہ ویدی یعنی جونی مہادیوی ہے اور لنگ خو **مہیشور**۔ سو اس لنگ اور جونی کی پوجا سے شو اور دونوں کی پوجا ہو جاتی ہے۔ لنگ ارجن تنتر میں لکھا ہے کہ شو اگر شکتی کے ساتھ ملا نہ رہے تو وہ مانند ایک مردہ کے ہے۔ شکتی کے ساتھ ملنے سے شیو کرم کرتا ہے سو شکتی کے ساتھ شو لنگ کی پوجا ضروری ہے۔"

تنتر میں لنگ کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں' ایک اصلی اور دوسری نقلی۔ اصلی لنگ انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے نہیں ہوتے یہ پتھر کے وہ ٹکڑے ہوتے ہیں جو موسموں کے تغیر و تبدیل سے لمبوتری شکل اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ انہی اشکال کو انسانی کج نظری' لنگ (اور وہ بھی شو کا) تصور کر لیتی ہے۔ لنگ کی دوسری قسم انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کی تخلیق مٹی اور دھات وغیرہ سے کی جاتی ہے۔ سکند پران کے کاشی کھنڈ میں بارہ مشہور لنگوں کے نام درج ہیں جن کو جوترلنگ کہتے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک لنگ کو محمود غزنوی نے

ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا یعنی ''شوم ناتھ لنگ''۔

اس شرمناک فعل کی مدافعت، اہل ہنود نے تلاش بسیار کے بعد دیگر ممالک میں لنگ پوجا والی رسم کو کھوج کر مفصل بیان کیا ہے یعنی یہ رسم فلاں ملک اور فلاں خطہ ارض پر بھی جاری و ساری رہی ہے۔ لیکن اگر کسی فعل کا ارتکاب زیادہ لوگ کر رہے ہوں تو یہ اس کی سچائی کی دلیل ہرگز نہیں اور نہ اسے سودمند قرار دیا جا سکتا ہے۔ برائی فیل بے زنجیر بن کر بھی رقص کرے تو وہ برائی ہی رہتی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ اگر ہماری ناک کٹی ہوئی ہے تو کیا ہوا فلاں فلاں کی ناک بھی تو کٹ چکی ہے۔

رائے صاحب سمپردائے میں رقم طراز ہیں۔ ''بعض مفکرین کہتے ہیں کہ لنگ پوجا ہندوستان ہی میں نہیں زمانہ قدیم میں اس کا رواج دیگر ممالک میں بھی تھا مثلاً ملک مصر میں بڑے معبود ''اسیرس'' کا لنگ بھی بکثرت پوجا جاتا تھا۔ اسیرس دیوتا اور اس کی جورو آئسس دیوی کے ساتھ ہند کے شو اور شکتی کی بہت سی باتوں میں مشابہت پائی جاتی ہے مثلاً شو کی شکتی بھگوتی کو بشو اروپنی قرار دیتے ہیں۔ مصری لوگ آئسس دیوی کو زمین کے ساتھ ہم وجود مانتے ہیں۔ تنتر میں شکتی کی علامت ایک مثلث ہے اسی علامت کی حامل آئسس دیوی ہے۔ شو کا کار خاص ناش (تباہ) کرتا ہے اور اسیرس دیوتا بھی فنا کرنے والا ہے۔ شو کی سواری قابل تعظیم و اکرام بیل ہے۔ اسیرس دیوتا کے **ایپس** نامی کالے سانڈ کو مصری پوجتے تھے شو اور اسیرس دونوں کے سروں پر سانپ لپٹے ہوتے ہیں، شو کے ہاتھ میں ترشول ہوتا ہے، اسیرس کا ہتھیار بھی اسی نوعیت کا ہوا کرتا تھا۔ شو کا مقدس درخت بیل ہے۔ اسیرس کا درخت بھی اس سے ملتا جلتا تھا۔ شو کا خاص دھام کاشی ہے، اسیرس کا **میمفس** دونوں پر دودھ ڈالا جاتا ہے البتہ اسیرس کا رنگ سیاہ اور شو کا سفید ہے لیکن مہاکال شو کا رنگ بھی سیاہ ہوتا ہے۔''

''ملک یونان میں بھی لنگ پوجا کا رواج رہا ہے، اکثر شہروں کے مندر لنگ مورتیوں سے مزین ہوا کرتے تھے اور ان کے لئے جلسوں کا رواج بھی تھا۔ بیکاس دیوتا کے لئے فیلی فوریا نامی جلسہ منعقد ہوا کرتا تھا لوگ اسی انداز میں ناچا کرتے تھے جیسے بنگال میں چڑک پوجا کے موقع پر رقص ہوا کرتا تھا'' (یونانی لوگ ستائش دیوتا کے دوران میں جو کچھ کہا کرتے تھے وہ ناقابل اشاعت ہے)

حیران کن بات یہ ہے کہ لنگ پوجا میں رسومات کی ادائیگی کنواری کنیاؤں کے ہاتھوں

افضل ترین گردانی جاتی تھی، کھل کر ناچنے کا خوب اہتمام ہوا کرتا تھا۔ انسانی گمراہی کی حد ہے نہ انتہا۔ بیکاس دیوتا کا لنگ تو خیر ایک سو بیس ہاتھ لمبا ہوا کرتا تھا مگر بابل ہندی اسوری دیوتاؤں کے لنگ تین تین سو ہاتھ لمبے ہوا کرتے تھے۔ اہل ہنود کی ہر پوجا کے لئے پردہت کی موجودگی ضروری ہے مگر لنگ پوجا کے لئے ایسی کوئی شرط نہیں۔ مرد و زن کو لنگ پوجا کے مساوی حقوق حاصل ہوا کرتے تھے (اور آج بھی ہیں) خواتین شودوارے جا کر بیل کے پتے اور پانی چڑھایا کرتی تھیں یا اپنے گھروں میں گوشتہ تنہائی میں خود ساختہ لنگوں کی پوجا کر لیا کرتی تھیں۔

دکن میں شولنگ کی پرست کو ہر نوع کی پوجا پر فوقیت حاصل تھی۔ ہندوؤں کا ایک فرقہ لنگایت، لنگونت یا جنگم کے نام سے مشہور تھا جس نے دیگر تمام دیوتاؤں کو پس پشت ڈال کر اس رسم کو اپنا شعار بنایا۔ باسب نامی شخص نے اس فرقے کی تنظیم نو کی۔ جین مت کو نیست و نابود کر کے شیومت کو پھیلانے والا یہی شخص تھا۔ اس فرقے نے تو سورج دیوتا، اگنی پوجا، تیرھ یاترا، گنگا جل، برہمن بھوجن ہر شے کا انکار کر دیا۔ باسب نے چھوٹے چھوٹے لنگ بنا کر مرد و زن کے ہاتھوں میں تھما دیئے اور ان کو گلے میں حمائل کرنے کا اپدیش بھی دیا۔ مردوں کو سپرد چتا کرنے کے خلاف مہم چلائی اور تدفین کو رائج کیا۔ چنانچہ رسم ستی میں چتا پر جلنے کے بجائے بیوہ کو زندہ در گور کیا جانے لگا۔

دکن میں شادی کی ایک رسم تو بڑی ہی واہیات قسم کی تھی۔ شادی شدہ عورت کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ بیاہ تو ایک شخص سے رچا لے مگر گھر کسی دوسرے کا آباد کرے۔ یہ لوگ شمالی ہند میں بھی پائے جاتے تھے اور لاہور کے گردونواح میں بھی۔ اس علاقے میں سانڈوں کو سجا کر پھرنے والے لوگوں کا تعلق جنگم قبیلے سے ہوا کرتا تھا۔

ساسانی، یونانی حضرات بھی ہند میں وارد ہوئے تو اپنی رسومات ساتھ لے کر آئے مگر ہندی رسم و رواج نے رفتہ رفتہ ان سب کو نگل لیا۔ کہیں کہیں بیرونی رسوم کے آثار ہندی معاشرے میں ضرور پائے جاتے تھے مگر بحیثیت مجموعی اب یہ معاشرہ خالص ہندی آریائی تھا جو برہمنوں کے قبضہ قدرت میں تھا۔

شودر، نچلی ذات کے لوگ چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے تھے۔ برہمن اور دیگر بلند مرتبت لوگوں پر ان کا سایہ پڑ جانا بھی ناقابل برداشت تھا البتہ ان کی محنت کا پھل اونچی ذات

98229

کے لوگوں کے لئے ہوا کرتا تھا۔ یہ لوگ شودر گویا پیدائشی بدبخت قرار دیئے جا چکے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ برہمنوں نے اپنی مذہبی کتب کا بھی لحاظ نہ کیا اور اپنے من پسند قوانین کو رائج کر دیا۔ شریمد بھگوت گیتا اہل ہنود کی مقدس ترین پستک ہے جس کا مطالعہ ہر سیدھی مت والے کو ورطہ حیرت میں ڈبو دیتا ہے۔ اس کی اہمیت اور اس کے تقدس کو کوئی ہندو نظر انداز کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ یہ ان کی قدیم روحانی کتاب ہے۔ اصل میں یہ مذہبی کتاب ان اپدیشوں پر مشتمل ہے جو شری کرشن مہاراج نے پانڈوؤں کے سالار، ارجن کو کورد کیشتو کے میدان میں مہابھارت کی جنگ کے وقت دیئے۔ گویا یہ بلند مرتبہ پستک مہا بھارت کا خلاصہ ہے۔

سری کرشن نے اپنے اپدیش میں انسان، روح، خدا، بھگتی کی تفصیل بیان کر کے وصال خدا کا طریقہ بیان کیا ہے۔ انسانی فرائض میں نشکام کرم (عمل بے لوث) کو وصال کی پہلی شرط قرار دیا ہے۔ اس میں کل سات سو اشلوک ہیں۔ پرم آتما یا پرماتما یعنی خدا کی ہستی کے متعلق گیتا کا فیصلہ ہے کہ خدا موجود ہے بلکہ "خدا ہی موجود" ہے۔ گویا گیتا وحدت وجودی کی تعلیم دیتی ہے۔ فطرت، نیچر، پرکرتی ہر شے ہر عالم میں اسی کا نور و ظہور ہے۔ ملاحظہ ہو پندرہواں ادھیائے اور بارہواں شلوک یعنی............

یہ سورج کی تابش مرا نور ہے
جہاں جس کے جلوں سے معمور ہے
رہے چاند رخشاں مرے نور سے
تو آتش درخشاں مرے نور سے
جو ہر سمت پاتا ہے میرا ہی نور
مجھی میں جو ہر شے کا دیکھے ظہور
کبھی مجھ سے منہ موڑ سکتا نہیں
کبھی میں اسے چھوڑ سکتا نہیں
جو کثرت میں وحدت کا دیکھے سماں
جو پوجے مجھے ہوں میں سب میں عیاں

کائنات کی شیرازہ بندی اسی پرم آتما کے دم قدم سے ہے۔ وہ نابود ہو جائے تو سارا

شیرازہ ہی بکھر کر رہ جائے۔

سن ارجن نہیں کچھ بھی میرے سوا
نہ ہے مجھ سے بڑھ کر کوئی دوسرا
پرویا ہے سب کچھ مرے تار میں
کہ ہیرے ہوں جیسے کسی ہار میں

گیتا کے مطابق وہ آنکھ سے نہیں بلکہ آنکھ اس سے دیکھتی ہے۔ اسی طرح کان اس سے سنتے اور زبان قوت گویائی کا اظہار اسی کے طفیل کرتی ہے۔ وہ جان کی جان اور دل کی دھڑکن ہے۔ گیتا کے انوسار سانکھیہ فلسفہ بھی غلط ہے۔

اس فلسفے کے مطابق دنیا کی ہر شے دو مختلف خود مختار ابدی عناصر سے معرض وجود میں آئی مگر گیتا وحدانیت کی تعلیم دیتی ہے۔ سانکھیہ کہتا ہے کہ بے جان پر کرتی مادہ سے پیدا ہوئی اور جان دار پرش روح سے، مگر گیتا اس پر خط تنسیخ کھینچ دیتی ہے۔ اس کے مطابق مادہ اور روح ایک پر میشور کا ظہور ہیں۔ اول الذکر خدا کی اپرا پر کرتی یعنی ادنیٰ فطرت ہے اور روح پر اپر کرتی یعنی اعلیٰ فطرت۔ پھر گیتا اس ادنیٰ فطرت کے آٹھ روپ دکھاتی ہے۔

اس کتاب کے 10 ویں ادھیائے کا 20 واں شلوک تو واقعی حیران کن ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ مذہب کے برہمن ٹھیکے داروں نے اپنی ہی تعلیم کا حلیہ کس انداز میں بگاڑا۔

سن ارجن میں ہوں آتما بالیقیں
جو ہے جانداروں کے دل میں مکیں
میں ہوں مثل جاں اہل جاں میں نہاں
میں اول میں آخر میں ہوں درمیاں
مری ذات ہے مالک کائنات
نہ اس کو ولادت نہ اس کو ممات
ازل سے تھی موجود ہستی مری
ازل سے تھی موجود ہستی تری

گیتا انسان کو مکتی یعنی نجات کے تین راستے دکھاتی ہے کرم مارگ (راہ عمل)، بھگتی مارگ (رہ عشق) اور گیان مارگ (رہ عرفان)۔ ان پر ہر شخص چل کر مکتی حاصل کر سکتا ہے۔

ذات پات، ادنیٰ اعلیٰ کی کوئی قید نہیں۔

سمجھ دل سے یہ بات کنتی کے لال
مرا بھگت پائے نہ ہرگز زوال
بشر پاپ کے پیٹ سے ہو کوئی
وہ ہو ویش شودر یا ہو استری
مجھے آسرا جب بنائے گا وہ
تو اعلیٰ منازل پہ جائے گا وہ

مگر سب سے عجیب بت یہ ہے کہ گیتا بت پرستی کی سخت مخالفت کرتی ہے اور اصنام پجاریوں کو گمراہ قرار دیتی ہے۔ یہ اشعار بلا تبصرہ پیش خدمت ہیں۔

ہوا و ہوس سے جو مجبور ہیں
ہوئے گیان سے جن کے دل دور ہیں
نکالیں طبیعت سے پوجا کی ریت
کریں دوسرے دیوتاؤں سے پریت
منائیں جو پتروں کو پتروں تک آئیں
جو بھوتوں کو پوجیں وہ بھوتوں کو پائیں
صنم کے پجاری صنم سے ملیں
ہماری پرستار ہم سے ملیں

گیانی کو جب عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو ہر ذی روح اس کے لئے مساوی درجے کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی چنڈال اور برہمن میں کوئی امتیاز نہیں۔ اصل عرفان یہی ہے کہ اونچ نیچ کا امتیاز مٹ جائے۔

جو گیانی ہے یکساں نظر اس کو آئے
وہ ہو کوئی کتا کہ ہاتھی کہ گائے
کوئی برہمن عالم و بردبار
کہ چنڈال ناپاک مردار خوار

یہ ہندو دھرم کا آغاز تھا۔ نہ بت پرستی نہ ذات پات کی تقسیم، عمل بے لوث کی تلقین

البتہ ہر قدم پر کی گئی۔ حق تلفی مہاپاپ قرار دی گئی........ لیکن ہوا کیا؟ اس دھرم میں شرمناک رسوم در آئیں، انسانیت کی تذلیل کو مذہبی قوانین کا درجہ دیا گیا۔ ظلم و ستم کو شعار گردانا اور دستور مانا گیا۔ یہ بصیرت و بصارت کا اندھیرا نہیں تو اور کیا تھا" یہی وہ دور تھا جب ویدک مذہب کو برہمنوں نے برہمن مت میں تبدیل کر دیا۔ عوام الناس تو رہے ایک طرف عظیم الشان راجے مہاراجے بھی برہمنی شکنجے سے عاجز آگئے اور اس سے نجات کی تمنا کرنے لگے۔ ان حالات کے نتیجے میں دو آوازیں بلند ہوئیں یعنی بدھ مت و جین مت معرض وجود میں آئے۔ بدھ مت کا بانی گوتم بدھ اور جین مت کا بانی مہاویر ہم عصر تھے۔ دونوں حضرات نے اپنے اپنے ظرف و شرف کے مطابق اصلاح معاشرہ کا بیڑا اٹھایا۔

موجودہ صوبہ بہار کی دکنی سرحد کے قریب کپل وستو کی راجدھانی تھی جہاں ساکیہ قوم کا سربراہ سدھودن حکمران تھا۔ 523 قبل از مسیح میں اس کے ہاں گوتم شہزادہ پیدا ہوا جو بڑا حساس اور دردمند دل کا مالک ثابت ہوا۔ یہ تھا تو راجکمار مگر اپنے مقام و مرتبے والی کوئی بات اس میں نہ تھی۔ معروضی حالات تو اس کے زخموں پر کچوکے ہی لگاتے رہتے۔ عدم مساوات، ناانصافی، انسانی دکھوں پر وہ ہمیشہ سپرد اضطراب رہتا۔ اولاد کا دکھ بھرا چہرہ ہر ماں باپ کے لئے وجہ رنج الم ہوتا ہے۔ اس میں شاہ و گدا کی کوئی قید نہیں۔ راجا سدھودن نے بھی اپنی فہم و فراست کے مطابق راجکمار کے دکھ کا مداوا کیا۔ اسے ایک حسین و جمیل دوشیزہ یشودھرا سے رشتہ ازدواج سے منسلک کر دیا........ گوتم کے ہاں ایک بیٹا بھی تولد ہوا مگر یہ ریشمی بندھن گوتم کو زیادہ دیر تک اسیر نہ رکھ سکا۔ ایک رات جب کہ وہ عمر عزیز کے 29 ویں برس میں تھا حسین و جمیل شریک حیات اور پھول ایسے بچے پر نگۂ حسرت ڈالتے ہوئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ بے چین آوارہ کونج سارے رشتے توڑ کر کسی اجنبی منزل کی جانب پرواز کر گئی۔

اس دشت نوردی کے عالم میں وہ بے قرار دل کے لئے تسکین کا متلاشی تھا مگر یہ جنس نایاب اسے نصیب نہ ہو سکی۔ آخر اس کی ملاقات ایک مہاتپسوی رشی الاراکلاما سے ہوئی۔ رشی نے اپنشد کے درس کا آغاز کیا مگر ویدوں کے اس خلاصے نے بھی گوتم کو تسکین قلب سے محروم رکھا۔ راجکمار نے اپنے آپ کو ریاضت و عبادت کی چکی میں گویا پیس ڈالا۔ مسلسل فاقہ کشی سے وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ بس سلسلہ تار نفس بحال رہا مگر دل بے قرار کو قرار پھر بھی نہ آیا۔ پھر اس نے طویل سفر کی ٹھانی۔ دربدر خاک بسر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بھوک ستاتی تو

دست طلب دراز کر کے آتش شکم بجھالیتا۔ رات ہوتی تو کسی پیڑ تلے جا سوتا "فرش زمیں کا چھت آسماں کی" والا معاملہ ہو گیا.......... گیا شہر کے قریب شوجاتا نامی خاتون سے اس کی ملاقات ہوئی.......... راجکمار جانے کتنے دنوں کا بھوکا تھا۔ امیر اور غریب انسان میں بغور دیکھا جائے تو فرق صرف ایک دو وقت کی روٹی ہی کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دونوں ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ شوجاتا بھی شاید گوتم ہی کے قبیل کی ہستی تھی۔ گداز دل انسانوں کو دوسروں کے دکھ کا احساس بہت جلد ہو جاتا ہے۔

"کیا کھو بیٹھے ہو جس کی تلاش میں یہ حالت بنا رکھی ہے؟" شوجاتا نے ہمدردانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"دل کا سکون۔" گوتم نے لرزیدہ لہجے میں جواب دیا "انسانی دکھوں کا مداوا تلاش کرتا پھرتا ہوں۔"

"کس برتے پر؟ تمہاری فصیل جاں میں تو توانائی کی رمق تک نہیں۔" خاتون نے گوتم کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا "دکھوں کا مقابلہ ناتوانی سے نہیں کیا جاتا' پہلے اپنی توانائی بحال کرو۔ ٹھہرو میں تمہارے لئے بھوجن لاتی ہوں۔"

گوتم کے پاؤں تلے مضبوط شاخوں والی گھاس اگی ہوئی تھی اور وہ برہنہ پا تھا۔ پیپل کے قریبی درخت کی جانب اس نے پیش قدمی کی تو پاؤں' تندی نما شاخ میں الجھ گیا۔ اس طرح ہڈیوں کا ڈھانچا گوتم زمین پر منہ کے بل گرا.......... اپنی ناتوانی کا احساس اس کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ شوجاتا اس کے لئے چاولوں کی کھیر لے کر آئی جسے گوتم نے دلی رغبت سے کھایا اور چھتناور درخت تلے اونگھنے لگا۔ اس نے اپنی حالت زار پر غور کیا۔ اسی ارتکاز کے دوران اسے "گیان" حاصل ہوا وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اب وہ گویا جاننے والا (عارف) تھا۔ گوتم بدھی والا یا گوتم بدھ۔ اب اسے اپنے عرفان کا پرچار کرنا تھا۔

گوتم نے اپنے پرچار کا آغاز بنارس کے قریب سارناتھ کے مقام پر ایک باغ سے کیا جو ہرن باغ کے نام سے مشہور تھا۔ گوتم کا انداز بیاں سیدھا سادہ دل نشیں قسم کا تھا۔ برہمنوں کی الجھی ہوئی مکارانہ باتوں کے بالکل برعکس لوگوں نے اس کی سچی پر خلوص باتیں سنیں تو بڑے متاثر ہوئے۔ پانچ آدمیوں نے اپنے تن من گوتم کے سپرد کر دیئے' یہ بدھ مت کے اولین پیرو تھے۔ آج بھی اس واقعہ کی مناسبت سے بدھ مت کے ماننے والے پانچ کے عدد کو قدر و

منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اس نئے مذہب میں داخل ہونے لگے۔ یہ برہمن مت کے خلاف گویا عملی احتجاج تھا۔

گوتم نے ساٹھ مخلص چیلے چن کر انہیں "سنگھ" کا نام دیا اور اس طرح اس کے سادہ سے دھرم کی ترویج و ترقی ہونے لگی۔ وہ کپل وستو بھی گیا اس کا بیٹا راہولا اب سیانا ہو چکا تھا۔ یشودھرا دل و جان سے محو انتظار تھی۔ بیوی اور بیٹے کو بھی اس نے اپنے دھرم میں شامل ہو جانے کی دعوت دی۔

"میری جان و دل کے مالک' میرا دھرم تو آپ ہیں۔" یشودھرا نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا "میں تو آپ کی ہم سفر ہوں للذا میری منزل بھی وہی ہے جو آپ کی ہو گی۔"

کپل وستو کے لوگ اس مت میں شامل ہو گئے۔ پھر یہ مت مگدھ (بہار) میں پھیل گیا۔ برہمن مت کے بر عکس گوتم کی تعلیم سیدھے سادے چار اصولوں پر مبنی تھی۔ (1) دنیا دکھ نگری ہے۔ (2) دکھوں کی وجہ انسانی خواہشات ہیں۔ (3) ان خواہشات پر قابو پانے سے دکھ مٹ سکتے ہیں۔ (4) ان خواہشات کو مارنے کے لئے اشٹ مارگ Eight Fold Path) پر چلنا ضروری ہے۔

اشٹ مارگ کے آٹھ اصول ہیں۔ (1) درست سمجھنا۔ (2) سچا اعتقاد۔ (3) نیک عمل۔ (4) خوش گفتاری۔ (5) پاکیزہ زندگی۔ (6) نیک کوشش۔ (7) درست سوچ۔ (8) درست گیان۔

گوتم نے نہ صرف سینکڑوں دیوی دیوتاؤں پر خط تنسیخ کھینچ دیا بلکہ ذات پات کی غیر فطری تقسیم کو بھی پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راندہ درگاہ قسم کے لوگ جو برہمنی ظلم و ستم کے شکار ہو رہے تھے' گوتم کے گرد جمع ہونے لگے۔ ڈوم' چنڈال' نائی' بڑھئی' دھنئے' جولاہے' غریب دہقان اس کے والا و شیدا ہو گئے۔ وہ اسی برس تک ان پسے ہوئے لوگوں کی دل جوئی کرتا رہا اور ان ہی میں رچ بس گیا...... کشی نگر کے مقام پر جب وہ فوت ہوا تو بدھ مت برصغیر میں چاروں طرف پھیل چکا تھا۔

اس دور میں صرف بدھ مت ہی نہیں' ایک محتاط اندازے کے مطابق کم و بیش ساٹھ عدد سماجی اصلاح کے نظریات پیش کئے گئے۔ ان میں بدھ مت کے بعد جین مت قابل ذکر ہے۔ یہ بھی برہمن سماج کے خلاف ایک زبردست تحریک تھی۔ اس کا بانی وردھمان مہاویر'

وسالی (صوبہ بہار) کے راجا سدھارت کا لخت جگر تھا۔ یہ شخص بھی گوتم کی طرح بے حد گداز دل کا مالک اور غور و فکر میں کھویا رہنے والا انسان تھا۔ راج پاٹ کو لات مار کر جنگلوں کا وسنیک ہوا اور سوامی پارشوناتھ کے چیلوں میں شریک ہو کر اس نے اپنے پیکر خاک کو تپسیا کی بھٹی میں جھونک دیا۔ یہ سلسلہ 12 برس پر محیط رہا۔ اس طویل مدت کے بعد اسے گیان کی روشنی دکھائی دی اور وہ ارہت اور جن بن گیا۔ (ارہت اور جن بمعنی سب پر غالب اور سب کچھ جاننے والا)۔

اس کے پیرو جینی کہلائے اور یہ مذہب جین مت کے نام سے مشہور رہا۔ مہاویر جب بہتر برس کی عمر میں صوبہ بہار کے دارالحکومت راج گڑھی کے قریب 'پاوا کے مقام پر فوت ہوا تو اس کے چیلوں کی تعداد چودہ ہزار کے قریب تھی۔ مہاویر کی آواز برہمن مت کے خلاف غیر معمولی نوعیت کی تھی۔ گوتم اور مہاویر دونوں نے اہنسا پر مودھرما (جان دار کو ایذا رسانی سے گریز) کی تعلیم دی۔ یہ ویدک جنگ جویانہ رجحان اور بلیدان کے برعکس تعلیم تھی جسے مہاویر نے انتہا تک پہنچا دیا چنانچہ جین مت کے پیرو سانس لینے کے دوران میں بھی اپنی ناک اور منہ کپڑے سے ڈھانپ کر رکھا کرتے تھے مبادا ہوا میں محو پرواز جراثیم کی ہتیا...... ہو جائے۔

اس دور خرابی میں ان دو آوازوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی اس میدان میں اصلاح معاشرہ کی خاطر اترے۔ مثلاً اور **کشیلپ** تھا جو اس بات کا مدعی تھا کہ انسانی اعمال کا پاپ پن سے کوئی تعلق نہیں...... یہ سب برہمن مہاراج کے ڈھکوسلے ہیں۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار اجی ویکا' سانچیہ' پرسوا' ادکا' اتارا اور دوسرے بھگتوں نے کیا۔ ان سب میں قدر مشترک تھی' ویدک تعلیم کی مخالفت' دیوی دیوتاؤں کا انکار' جنگ و جدل اور بلیدان (قربانی) سے نفرت کا اظہار اور اہنسا کا پرچار............ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان اصلاحی تحریکوں میں کامیاب ترین گوتم کی تحریک تھی۔ یعنی بدھ مت اور دوسرے نمبر پر جین مت تھا۔

مہاراجا اشوک (273 ق م سے 232 ق م) نے جب بدھ مت اختیار کیا تو یہ گویا راج مت بن گیا۔ خلق خدا حکمرانوں کے راستوں پر چلتی ہے کے مصداق تیسری صدی ق م میں اسے بڑا عروج حاصل ہوا۔ اشوک کی کوششوں سے اس دھرم کا برصغیر سے باہر بھی پرچار

کیا گیا جو بڑا کامیاب رہا۔ رفتہ رفتہ برہمن لنگر لنگوٹ کس کر بدھ اور جین مت کے خلاف میدان میں کودنے لگے۔ ان کی خوش قسمتی سے دوسری صدی عیسوی میں راجا کنشک کے عہد حکومت میں سنسکرت کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا۔ وہ اگرچہ بدھ مت کا سرگرم پیرو تھا مگر سرکاری زبان ہونے کے ناتے جب سنسکرت کی ترویج و ترقی ہوئی تو برہمن مت بھی دوبارہ ابھرنے لگا۔ بدھ مت کے عالم بھی سنسکرت اپنانے پر مجبور تھے پھر برہمنوں نے ایک ایسا داؤ آزمایا جس کا حریفوں کے پاس کوئی توڑ نہ تھا۔ انہوں نے بصد احترام گوتم بدھ کی مورتی کو مندروں کی زینت بنا کر اسے بھگوان کا اوتار تسلیم کر لیا۔

اب بدھ بھکشو عجیب و غریب الجھن کا شکار ہو گئے۔ ان کے لئے تو گوتم بدھ ہی سب کچھ تھا۔ المختصر وہ برہمن کے اس داؤ سے چت ہو گئے اور گوتم کے چیلوں میں بت پرستی کا رواج ہو گیا۔ یہ بدھ مت کے زوال کا آغاز تھا۔ اس داؤ کے علاوہ گپت خاندان کے راجاؤں نے جب ہندو مت قبول کیا تو رہی سہی کسر پوری ہو گئی۔.......... عہد گپت خاندان کو ہندو مت کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ یعنی چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی۔

سمدر گپت کے عہد میں لنکا کے راجا نے گیا کے مقام پر مہاتما بدھ کی مورتی پرتش کے لئے رکھی۔ یہ مورتی سونے چاندی اور جواہرات سے بنائی گئی تھی جو بدھ یاتریوں کے خوابوں کی تعبیر تھی......... کہتے ہیں جب لنکا کے راجا نے سمدر گپت سے اس کی اجازت طلب کی تو درباری برہمنوں نے گھی کے چراغ جلائے۔ اب گویا ان کا حریف چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔

ہندو دانش وروں نے ان الفاظ کا اظہار ہزار بار اور برملا کیا ہے کہ "ہم سے' ہمالہ پہاڑ سے بڑی غلط سرزد ہو گئی۔ ہمیں چاہئے تھا کہ اپنے مندروں میں امت مسلمہ کے راہنما حضرت محمدؐ کی مورتی بھی......... رکھ دیتے اور پھر دیکھتے کہ مسلمان اس داؤ سے کیسے بچ پاتے۔ ہم مسلمانوں کے دین کو میٹھی چھری سے ذبح کر کے انہیں اپنے دھرم میں شامل کر لیتے۔"

ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ برہمن نے ہم پر یہ داؤ نہیں آزمایا ورنہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ نفرت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر بناوٹی محبت کا وار بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ زہر سے بچا جا سکتا ہے لیکن زہر آلود شے دھوکا دے جاتی ہے۔

جین مت اور بدھ مت دونوں کا تشخص برہمن مت میں گم ہو کر رہ گیا۔ اس میں برہمنوں کی شاطرانہ چال کے ساتھ بدھ مت کے بھکشوؤں کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ مت جو سیدھا سادہ انسانی مساوات کا علم بردار تھا، اہل ہوس کا شکار ہو گیا۔ وہ جو سنسار کو سروم دکھم (ہر سمت دکھ ہی دکھ) کا پرچار کیا کرتے تھے۔ سنسار کو سکھ سیج میں بدلنے کی حرکات کے مرتکب ہونے لگے۔ یعنی سکھ اپنی جھولی میں اور دکھ دوسروں کے کھاتے میں ڈالے جانے لگے۔ بدھ بھکشوؤں کے استوپے تک عشرت کدوں میں تبدیل ہو گئے۔ وہ جو انسان کو طاقت، مال و دولت، عیش و عشرت، جنسی لذتوں کی ہوس سے گریز کی تلقین فرمایا کرتے تھے خود ان میں مبتلا ہو گئے۔ گوتم کی تعلیم میں کسی مافوق الفطرت کی پوجا پاٹ کا کہیں تذکرہ نہیں تھا۔ بھگوان، برہما کا وجود تھا نہ آتما پرماتما، نہ **بیکنٹھ** اور نرکھ کا۔ لیکن اب بدھ مت کے چیلے خود گوتم کی پوجا کرنے لگے۔ سیم و زر کے کھلونوں سے کھیلنے لگے۔ اشوک سے **کنشک** تک جس مت کی دھوم مچی رہی وہ اپنی موت آپ مر گیا۔

اشوک سے پہلے اس مت کے پیرو بھکشو (بھکاریوں) کی صورت میں خجل خوار ہوا کرتے تھے۔ اشوک نے ان کے لئے آٹھ عالی شان استوپے بنوائے ٹیکسلا کا استوپا "**دھرم راجیکا**" ان سب میں عظیم الشان درس گاہ کا مقام رکھتا تھا۔ اشوک نے ان استوپوں میں شاکیہ منی کی پیدائش سے نروان تک اور نروان سے سفر آخرت تک کے تبرکات محفوظ کر دیئے، ان کے مصارف کے لئے زمینیں وقف کر دیں۔ بھکشوؤں کے کھانے پینے کا تسلی بخش انتظام کیا، مگر ہوا یہ کہ دھرم سیوکوں کو لالچ نے آگھیرا۔ گوتم کی پیدائش، نروان وغیرہ کے متعلق افسانوی انداز میں داستانیں لکھی گئیں۔ عجیب و غریب رسوم معرض وجود میں آنے لگیں۔ بھکشوؤں نے ان تبرکات کی زیارت کے ضابطے مرتب کئے۔ اب وہ جاتریوں کی پرارتھنائیں مہاتما بدھ کے حضور پہنچانے کا واحد وسیلہ تھے۔

رفتہ رفتہ گوتم کے چیلوں کی بھی مورتیاں بننے لگیں۔ چڑھاوے، نذرانے، منتیں ہر کام کے قاعدے وضع کئے گئے، دولت کے انبار تھے کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔ استوپاؤں کے قریب بت تراشوں، زرگروں، کوزہ گروں، ساہو کاروں کے بازار کھل گئے۔ چھو منتر کرنے والوں کے کاروبار چمکنے لگے۔ بھکشو تو پنڈتوں کو بھی مات کر گئے...... برہمنوں کی مسرت دیدنی تھی۔ آٹھویں صدی میں ہندو مت کی تشکیل نو ہوئی۔ شنکراچاریہ جیسے دانش

ورنے' ہندومت کے تن مردہ میں نئی روح پھونک دی۔ فرسودہ رسومات کے اس مجموعے کا از سرنو طوطی بولنے لگا۔

شنکر چاریہ نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر ہر مت کے عالموں کو چت کر دیا۔ کھوٹے سکے ایسے چلے کہ سچائی کی قوت گویائی ہی چھن گئی۔ سچائی اگر مطلق سچائی نہ ہو تو اس کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ بہرحال خلق خدا ایک بار پھر تہ سنگ آسیا ہوئی۔

یہ شنکر چاریہ کون تھا اور اس نے کیا گل کھلایا؟ اس کی تفصیل بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ یہ بلا کا ذہین' حاضر جواب' جھوٹ کو سچ اور سیاہ کو سفید کر دکھلانے والا شخص مالا بار کا برہمن تھا جو 788ء میں پیدا ہوا۔ بتیس برس کی مختصر سی عمر میں تاریخ ہند کا سب سے بڑا چمتکار..... دکھا کر صفحہ ہستی سے غائب ہو گیا۔ اس چرب زباں شخص کے مسلک میں مطلب براری کی خاطر ہر حربہ جائز اور ہر حیلہ وسیلہ روا تھا۔ ہندو دھرم کی بدقسمتی تھی کہ یہ شخص زیادہ عرصہ جی نہ سکا مگر بتیس برس کی عمر ہی میں جو کارنامہ اس نے سرانجام دیا وہ ہندو اتہاس میں ناقابل فراموش ہے۔ ہندو قوم شنکر اچاریہ کو شیو شنکر کا اوتار تسلیم کرتی ہے۔

کیرالا کے قریب چیدم برم ایک غیر معروف مقام پر شنکر اچاریہ پیدا ہوا۔ اس کی ماں سری مہادیوی پر کشش نسوانی پیکر کی مالک تھی۔ پنڈتانی کے مقابلے میں پنڈت جی (پنڈتانی کا پتی) "ٹھنڈے مزاج" کے انسان تھے جو اپنی مردانہ کمزوری سے واقف تھے۔ مہادیوی نے جب اس غیر معمولی بچے کو جنم دیا تو برادری میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں' مگر سری دیوی یا مہادیوی نے زبان خلق کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے بچے کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ مبذول کر دی۔ اس کے نتیجے میں برادری والوں نے اس گھرانے سے قطع تعلق کر لیا۔ ہندو مورخ کیرل اتپتی تو صاف الفاظ میں شنکر اچاریہ کو نطفۂ ناتحقیق لکھتا ہے۔ اس حقیقت سے کسی نے انکار نہیں کیا کہ سری دیوی کو برادری سے خارج کر دیا گیا تھا۔ سمپر دائے کا مصنف بی بی رائے صرف اس قدر کہتا ہے کہ "بے راہ روی" کا یہ الزام پنڈتوں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر لگایا ہو گا۔"

بہرحال حسب دستور آٹھ برس کی عمر میں اس بچے کے گلے میں جنیو ڈالا گیا اور تعلیم و تربیت (ویدک تعلیم) کا آغاز کیا گیا۔ بچہ تو اپنے پنڈٹ پتاجی کے بھی کان کترنے لگا۔ باپ نے تو اپنی شفقت سے اپنے سپوت کو محروم ہی رکھا مگر سری دیوی کی جان بچے میں تھی۔ بچے نے بھی اپنی ماتا کو کسی کمزور یا منہ زور لمحے کے ہاتھوں شکست کھا جانے پر معاف کر دیا تھا اور پوری توجہ سے وید ازبر کرنا زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ وہ ایسی ایسی موشگافیاں کرتا کہ اس کے اساتذہ انگشت بدندان رہ جاتے۔ بارہ برس کی عمر میں شنکر اچاریہ کے پتاجی کا دہانت ہو گیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ اس المیے کا اس کی تعلیم پر الٹا اثر پڑا، یعنی وہ مزید تن دہی سے تعلیمی مراحل طے کرنے لگا۔ دھرم کے متعلق اس کا ایک اپنا نظریہ تھا۔ وہ مروجہ فرقوں سے ہرگز مطمئن نہیں تھا۔ چھوٹی سی عمر میں وہ ایک بڑا پنڈت بن گیا۔ ویدک تعلیم اختتام پذیر ہوئی تو وہ سنیاس کی جانب متوجہ ہوا مگر سری مہادیوی نے اس خیال کی سخت مخالفت کی۔ بیوہ کی تاریک زندگی میں مسرت کی ایک ہی تو کرن تھی۔ اس سے محروم ہونا وہ کیسے پسند کر سکتی تھی۔ اس مرحلے پر شنکر اچاریہ نے اپنی زندگی بھر کے رویے کا اعلان کر دیا۔

“ماتا جی! آپ کی آگیا کے بغیر کوئی کام کرنا میں مہاپاپ سمجھتا ہوں” ایک روز نوجوان شنکر نے بڑی سنجیدگی سے کہا “آپ مجھے آگیا دیں یہ میری اوشنا ہے۔”

“بیٹا جی! اس منوکامنا کا پالن میرے بس میں نہیں” سری دیوی نے دو ٹوک فیصلہ سنا دیا۔

“ماتا جی، آپ خود مجھے سنیاس کی آگیا دیں گی بلکہ اس پر مجبور ہو جائیں گی” شنکر نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

“کیا اس میں میری خوشی بھی شامل ہو گی؟”

“اوش ایسا ہی ہو گا۔”

“یہ شنکر اچاریہ کا عجیب رویہ تھا۔ حصول مقصد کے لئے وہ ہر حربہ جائز تو سمجھتا ہی تھا مگر حربے کا استعمال وہ اتنی فراست سے کرتا کہ سب کو حیران کر دیتا۔ کہتے ہیں جہاں چاہ وہاں راہ۔ یہ موقع اسے بہت جلد ہاتھ آ گیا۔ ایک روز وہ اپنی ماتا کے ہمراہ کسی آشنا گھرانے میں مدعو تھا۔ واپسی میں موسلا دھار بارش کے سبب راستے میں حائل ندی باڑ پر آ گئی۔ ماں بیٹا پانی کا بہاؤ کم ہو جانے کا انتظار کرنے لگے۔

شنکر بغور پانی کا جائزہ لینے لگا اور اپنے ذہن میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔

“ماتا جی! آیئے اب ہم باآسانی اس پار جا سکتے ہیں” اس نے بصد احترام کہا۔

“پانی کے بہاؤ سے مجھے تو ڈر لگ رہا ہے” سری دیوی نے ندی کا جائزہ لیتے ہوئے تشویش ظاہر کی۔

“اس داس کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی خطرے سے خائف نہیں ہونا چاہئے” شنکر نے دست بستہ عرض کی “آپ کے چرنوں میں تو سورگ ہے' میں ان چرنوں کو خطرے میں کیسے ڈال سکتا ہوں؟”

سری دیوی احترام و محبت کے جھانسے میں آ گئی۔ جو کھچڑی شنکر کے ذہن میں پک رہی تھی اس کا تو دیوی جی کو سان گمان تک نہ تھا۔ دونوں پانی میں اترے اور دوسرے کنارے کی جانب قدم قدم چلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد پانی ان کے گلے گلے تک آ گیا۔

“شنکر بیٹا' اب کیا ہو گا؟ میں تو ڈوبنے لگی ہوں کوئی اپائے کرو۔”

“ماتا جی' گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں ابھی ایشور سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں سلامتی سے پار لگا دے” شنکر زیر لب بڑبڑانے لگا مگر پانی کے بہاؤ میں کمی واقع ہونی تھی نہ ہوئی۔

“بیٹا جلدی کرو میں ڈوبنے لگی ہوں” سری دیوی نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

“وہ یوں ہے ماتا جی کہ میں پورے دھیان سے پرارتھنا نہیں کر پا رہا” شنکر نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا “میرے ذہن پر سنیاس لینے کا بھوت سوار ہے' آپ کی اچھیا کا پالن بھی میرا دھرم ہے۔ آگیا مل جاتی تو پرارتھنا میرے من کی آواز ہوتی اور ایشور مجھے نراش نہ کرتے۔”

سری دیوی اپنے لاڈلے کا مفہوم پا گئی۔ اس نے فوراً جواب دیا “بیٹا جی! میں دل و جان سے تمہیں سنیاس لینے کی آگیا دیتی ہوں۔ مجھے تمہاری خوشی چاہئے۔ جب چاہو سنیاسی بن جاؤ۔”

شنکر نے لپک کر ماں کو اپنے کندھوں پر بٹھایا اور باآسانی دوسرے کنارے جا پہنچا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی' دوسرے کنارے پہنچ کر اس نے باقاعدہ ماتھا ٹیک کر اپنی پوجا سمان ماتا کو ڈنڈوت کیا اور اسے تنہا چھوڑ کر اپنی راہ لی......

سنیاس لینے کے متعلق ایک اور روایت یہ ہے کہ وہ ماتا کی موت تک گھر میں رہا اور اس کے آں جہانی ہو جانے کے بعد جنگلوں کی طرف چل نکلا۔ سری دیوی کے کریا کرم کے متعلق یہ بات البتہ وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شنکر اچاریہ کے عزیز و اقربا نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ چتا پھونکنے کے لئے آگ تک مہیا نہ کی۔ معاونت تو دور کی بات ہے۔ برادری کا یہ رویہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ سری دیوی واقعی زندگی کے کسی دور میں بے راہ روی کے رستے پر چلی ضروری تھی مگر اس کے لئے شنکر کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اپنی پیدائش میں کسی فرد بشر کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

شنکر اچاریہ کے علمی کارناموں کے تذکرے سے پیشتر اس کی زندگی کا ایک عجیب و غریب واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا جو اس کی سوچ کا مکمل ترجمان ہے۔ وہ عموماً برہنہ پا گھوما کرتا تھا۔ ایک بار وہ مضبوط لمبی شاخوں والی گھاس کے جڑوں میں شکر بکھیر رہا تھا۔ اس کے ایک چیلے نے حیران ہو کر گرو کے اس عمل کی تشریح چاہی۔ کیونکہ مہاراج دان پن کے ایسے کاموں میں وقت برباد نہیں کیا کرتے تھے۔

"گرو جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"میرا کوئی کام وچار سے خالی نہیں ہوتا' شنکر نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ مت سمجھو کہ مجھے کیڑے مکوڑوں سے پریم ہو گیا ہے یا میں چیونٹیوں پر دیا کی وجہ سے زمین پر شکر ڈال رہا ہوں کہ وہ انند سے بھوجن کر لیں۔ پرنتو یہ بھی سچ ہے کہ یہ میٹھا میں چیونٹیوں ہی کے لئے بکھیر رہا ہوں۔"

چیلا ہونقوں کی طرح گرو جی کی جانب دیکھنے لگا وہ واقعی گرو دیو کی گفتگو اور ان کی اس حرکت کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔

"مورکھ! دھیان سے سن اور میرا یہ ایدیش پلے باندھ لے" شنکر نے وضاحت کی "ننگے پاؤں گھومنا مرد کے لئے اچھا ہوتا ہے اسی لئے میں ننگے پاؤں رہتا ہوں۔ مگر جلمی گھاس پاؤں میں الجھ الجھ کر میرا پینڈا اکھوٹا کر دیتی ہے۔ اس واسطے یہ میری دشمن ہے۔ مجھے چیونٹیوں سے بھی کوئی ہمدردی نہیں مگر گھاس کی جڑوں میں مٹھاس کے کارن چیونٹیاں جڑوں پر ہلہ بولیں گی اور ان کو کھوکھلا کر دیں گی' اس طرح وہ گھاس کی بیری بن جائیں گی۔ یاد رکھو بیری کا بیری اپنا دوست ہوتا ہے کیونکہ وہ تمہاری لڑائی لڑ رہا ہوتا ہے۔ اس طرح میں چیونٹیوں کو گھاس کا

بیری بنا رہا ہوں۔"

چیلا' گرو کی ذہانت بھری باتوں پر اش اش کرنے لگا۔ یہ تھا شنکر اچاریہ کی طرز استدلال .... ویدک تعلیم کے مطابق اس دور میں ہندو جاتی کے چار مشہور سمپر دائے تھے مگر شنکر اچاریہ نے انہیں بہتر شاخوں میں تقسیم کر دیا۔ سنیاس گرہن کرنے کے بعد وہ ہند کے طول و عرض میں گھومنے لگا اور ویدک تعلیم میں مناسب رد و بدل کر کے اس نے ویدانت مت کی تشکیل کی اور پھر اس کی ترویج و ترقی میں دن رات ایک کر دیئے۔ موجودہ ہندو مت کی تشکیل اسی نے کیا۔ ویدانت شاستر کو پھیلانے کے لئے اس نے چار مٹھ قائم کئے۔ لوگ اس کے جادو اثر بیان کے ایسے اسیر ہوئے کہ اسے اوتار ماننے اور گردانے لگے۔ شمالی ہند سے ہوتا ہوا وہ کشمیر جا پہنچا........ جین مت' بدھ مت کے علاوہ ہر مخالف کو مناظروں میں شکست سے ہمکنار کرتا ہوا سرسوتی کے آسن پر براجمان ہو گیا۔

شنکر اچاریہ جب کسی حریف دانش ور کو دعوت مناظرہ دیتا تو عجیب و غریب شرط عائد کر دیتا۔ اس کے رخت سفر میں ایک بہت بڑی کڑاہی ہوا کرتی تھی جو دہشت کی علامت بن گئی۔ مناظرے کے آغاز سے پیشتر اس کے چیلے آہنی کڑاہی کو چولہے پر چڑھا دیتے اور اسے گھی سے لبالب بھر دیتے' چولہے میں آگ دہکا دی جاتی۔ کھولتے ہوئے گھی کی جانب اشارہ کر کے شنکر مہاراج سنجیدگی سے اعلان فرماتے "ہارنے والے کو اس کھولتے ہوئے گھی میں دھکیل دیا جائے گا۔"

حریف دانش ور حیران رہ جاتا۔ راہ فرار اختیار کرتا تو اپنے ساتھ اس کے اپنے دھرم کی بھی سبکی ہوتی۔ مجبوراً اسے سر دھڑ کی بازی لگانا پڑتی۔ اس طریقہ واردات سے شنکر اچاریہ نے مخالف دھرم کے لاتعداد مخالفین کو ٹھکانے لگایا....... اس عملی مظاہرے سے دوسرے دھرم کے ماننے والے اس سے کنی کترانے لگے...... اس طرح ہندو مت کی "صداقت" کا سکہ بیٹھ گیا...... یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے ایک چرب زبان وکیل بے گناہ کو تختہ دار تک لے جاتا ہے...... اس طرح برصغیر میں ہندو مت کا طوطی بولنے لگا۔

ہندو تصوف کو شنکر اچاریہ نے مرتب کر کے اسے ویدانت کا نام دیا۔ گویا وہ ویدانت فلسفے کا بانی تھا۔ اس فلسفے کا اہم ترین باب وہ ہے جس میں شنکر' ایشور کی ذات کے متعلق بحث کرتا ہے۔ بعد میں اس کے تشکیل دیئے ہوئے فرقے پر بھی "شیو پرستی" کا رنگ غالب آ گیا۔

برصغیر میں دھومیں مچانے کے بعد کشمیر کے کیدارناتھ مقام پر اسے موت نے آلیا۔ اس وقت وہ عمر عزیز کے 32 ویں برس میں تھا۔ بدھ مت کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ ایک شاکیہ منی کے سچے بھکشو سے اس کا مقابلہ ہوا تھا اور وہ شکست سے دوچار ہو کر اپنی ہی تیار کردہ کڑاہی میں جل مرا۔

شنکر اچاریہ کی تصانیف زیادہ تر بھاشیہ (تفاسیر) پر مشتمل ہیں۔ یہی وہ میدان ہے جس میں ایک زیرک انسان متن کو اپنی حسب منشا ڈھال سکتا ہے۔ ان تفاسیر میں "شاریک ممانسہ" بڑی مشہور ہوئی اس کے علاوہ بھگوت گیتا بھاشیہ "گیارہ اپنیشد' اس کی ایک مختصر سی کتاب "موہ مدگر" اہل ہنود میں بڑی مقبول ہوئی جو جوگ کے موضوع پر ہے...... اسی طرح درگا ماتا کی ستائش میں "سوندایا لہری" کو اہل ہنود نے الہامی کتب کا درجہ دیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ویدانت کے مطابق بت پرستی جائز نہیں مگر شنکر اچاریہ یہاں بھی ڈنڈی مار گیا اور خود اپنے مت کی مت ماردی۔ یعنی خود اس کے چیلوں نے اپنے گرو کے حکم سے مختلف مقامات پر شیو اور وشنو کے بت بنوائے اور ان کی پوجا کا اہتمام کیا۔ ہندوؤں نے اپنے اس مہاپنڈت کو پہلے تو اوتار کا درجہ عطا کیا پھر اس کی کج روی کو بڑا دلکش رنگ دیا۔ یہ قصہ امروشتک AMRU-SHATAK نامی کتاب میں بالتفصیل درج ہے۔ متن ملاحظہ ہو۔

"شنکر مہاراج کو جنسی باتوں کا تجربہ نہیں تھا۔ راجا امرو کی حسین و جمیل رانی مدن سر نے اسے اس موضوع پر بحث کی دعوت دی اور صاف شکست دے دی۔ شنکر کو اپنی شکست بڑی گراں گزری اور اپنی ناتجربہ کاری پر سخت شرمندہ ہوا۔ اس نے رانی سے کہا کہ وہ اس بحث کو آخری مت سمجھے۔ کچھ عرصہ بعد بحث کے دوسرے دور کا آغاز ہو گا۔ رانی نے چیلنج قبول کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ ہر گھڑی' ہر جگہ' اس موضوع پر بحث کرنے کو تیار ہے۔

کچھ عرصے بعد راجا امرو کا انتقال ہو گیا۔ شنکر مہاراج نے اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے پیکر خاکی کو چھوڑ کر راجا کے تن مردہ میں حلول کر گیا۔ راجا کے جی اٹھنے پر رانی نے گھی کے چراغ جلائے اور دلی رغبت سے اپنے خاوند کی "پزیرائی" کرنے لگی۔ اس طرح سری شنکر نے جنسی موضوع پر عملی تعلیم حاصل کی۔ جب وہ اپنے تجربے میں کامل ہو گیا تو اس نے راجا کا جسم چھوڑ دیا اور اپنے پیکر میں از سرنو واپس آگیا۔ رانی جب راجا کے کریا کرم سے فارغ ہو گئی تو شنکر مہاراج نے اسے بحث کی دعووت دی اور اپنے علمی دلائل سے

اسے چت کر دیا۔

اس کہانی کے من گھڑت ہونے میں شبہ نہیں مگر یہ کہانی شنکر مہاراج کے متعلق اہل ہنود کے جذبات اور اندھی عقیدت کی ترجمان ضرور ہے۔ ویدانت فلسفے کے مطالعے سے ایک بات البتہ کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ شنکر اچاریہ نے اس بھگتی تحریک کا سنگ بنیاد رکھنے کی موہوم سی کوشش ضرور کی تھی جس کا آغاز 13ویں صدی عیسوی میں سوامی رامانند نے کیا لیکن اس کی شخصیت کا تعصب بھرا پہلو اس کے فلسفیانہ خیالات سے لگا نہیں کھاتا۔ جہاں تک ہندومت کی ترویج کا تعلق ہے اس کے مقابلے میں وہ کسی مت کو برداشت نہیں کرتا تھا۔

☆☆------☆☆------☆☆

کیا اسے ایک تاریخی اتفاق سمجھ لیا جائے کہ ہندومت کی احیا 9ویں صدی عیسوی کے آغاز سے بہت پہلے' آٹھویں صدی عیسوی میں ہندوستان اسلامی تعلیم سے روشناس ہو چکا تھا؟ تعارف کا یہ سلسلہ محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے سے بہت پہلے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت سے باقاعدہ شروع ہوا تھا۔ ویسے تو ظہور اسلام سے صدیوں پہلے عرب تاجروں کے بحری جہاز تجارتی اغراض سے چین جاتے ہوئے سندھ کی بندرگاہوں پر قیام کیا کرتے تھے۔ تجارتی ضرورتوں کے تحت وہ مقامی زبان سے بھی آشنا ہو چکے تھے۔ عرب ظہور اسلام سے پیشتر چول' کلیان اور سوپارا میں آباد تھے.........

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں ایران و عراق کی سلطنتیں سرنگوں ہوئیں۔ خلافت کی سرحدیں ساحل مکران تک جا پہنچیں۔ اس طرح عرب اور ہند کے معاملات میں سیاسی عنصر شامل ہوا...... عمان اور بحرین کا گورنر عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ ضرورت سے زیادہ جوشیلا ثابت ہوا۔ مرکز خلافت کی اجازت کے بغیر اس نے اپنے ہی جیسے جوشیلے فرد مغیرہ بن ابی العاصؓ کی سرکردگی میں ایک بحری مہم دیبل کی جانب روانہ کی۔ سندھ پر راجا چچ کی حکمرانی تھی جس کا عہد حکومت 622ء سے 666ء تک ہے۔ 15 ہجری (637ء) میں مغیرہ کے مٹھی بھر جوان دیبل سے ٹکرائے اور مہم بری طرح ناکام ہوئی۔ اس مہم میں مغیرہ کو جان عزیز سے ہاتھ دھونا پڑے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو خبر ہوئی تو انہوں نے ابو موسیٰ اشعریؓ

گورنر عراق مقرر کیا اور عثمان بن ابی العاصؓ کو بھرپور سرزنش کی اور آئندہ ایسی حرکات سے باز رہنے کا حکم دیا۔ جلال فاروقیؓ نے باڑ پہ آئی ہوئی ندی کو کناروں میں مقید کر دیا۔ مرکز کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ چھوٹے بڑے کو دم مارنے کو جرات نہ تھی۔

دور عثمانی میں خشکی کے راستے مہم جوئی کا جائزہ لیا گیا۔ مکران کا حاکم عبداللہ بن عامر بیدار مغز حکمران تھا۔ اس نے حالات کا جائزہ لے کر دربار خلافت میں رپورٹ پیش کی۔ ”سندھ کا پانی میلا اور گدلا ہے۔ پھل کسیلے اور ترش۔ تھوڑی تعداد پر مشتمل لشکر بھیجا گیا تو تباہی کا خدشہ ہے۔ بڑی لشکر کے لئے سامان رسد دشوار ہو گا۔“

یہ ایک حقیقت پسندانہ رپورٹ تھی، حضرت عثمان غنیؓ نے عبداللہ کو لشکر کشی کی اجازت نہ دی۔ امیر معاویہؓ کے دور میں سنان بن سلمہ نے جدوجہد کا آغاز کیا اور پیش قدمی کرتا ہوا مدھیہ (مغربی جیکب آباد) تک آ گیا مگر ایک سازش کا شکار ہو گیا۔ اس کے قتل کے بعد اموی فوج کو واپس جانا پڑا۔

694ء میں حجاج بن یوسف ثقفی عراق کا گورنر ہوا تو حالات نے نئی کروٹ بدلی۔ وہ حجاج جس کے متعلق مورخوں کا فیصلہ ہے کہ وہ شقی القلب اور جابر حکمران تھا۔ اگر سارے بدبختوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے میں صرف حجاج کو، تو حجاج والا پلڑا جھک جائے گا۔ اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں، مگر اس حجاج نے دو ایسے کارنامے سرانجام دیئے کہ ساری امت مہر بہ لب ہو گئی۔ یعنی قرآن حکیم پر اعراب لگوا کر تاقیامت آنے والے غجمی مسلمانوں پر احسان عظیم کر ڈالا اور سندھ کو سرنگوں کر کے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈبو دیا...... چند مظلوم مسلمان قیدیوں کی صدائے ”المدد یا حجاج“ کے جواب میں یہ سخت گیر حکمران دہاڑتے ہوئے شیر کی طرح لبیک کہتا ہوا اٹھا اور سترہ سالہ نوجوان محمد بن قاسم کی زیر سرکردگی اس نے راج چچ کے بیٹے راجا داہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ حجاج واقعی مجموعہ اضداد قسم کی شخصیت تھا۔ اس کی یہ مہم اگر سلیمان بن عبدالملک کی ذاتی رنجش وکدورت کی نذر نہ ہوتی تو برصغیر کی تاریخ یقیناً کچھ اور ہوتی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ حجاج کے وضع کردہ قوانین اور رائج کردہ اصول سندھی حکمرانوں کے لئے مشعل راہ رہے؟ جس حکمران نے بھی ان سے انحراف کیا وہ کہیں کا نہ رہا۔

یہ روشنی لاہور تک نہ پہنچ سکی۔ اس سرزمین پر اجالا پہنچنے کی تفصیل سے پہلے خطہ لاہور

کا تعارف بے حد ضروری ہے۔

برصغیر کی مجموعی کیفیت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لاہور ایک شہر ہی نہیں زمانہ قدیم سے سپت سندھو، سات دریاؤں کی زمین کا دل رہا ہے بلکہ شمالی ہند کے سیاسی خد و خال پر جس قدر لاہور...... اثر انداز ہوتا رہا کوئی اور شہر اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ اسی وجہ سے اسے شمالی ہند کا دروازہ کہا گیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ مسلمان جب سرزمین پنجاب سے روشناس ہوئے تو ان کے لئے یہ سارا خطہ 'لاہور کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ گویا یہ ایک شہر ہوتے ہوئے بھی صوبے کے مقام و مرتبے پر فائز تھا۔ پورے برصغیر میں صرف دہلی کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ سیاسی تناظر میں اس کا مقابلہ کر سکے۔ لاتعداد شہنشاہوں کے دور میں یہ دوسرا پایہ تخت رہا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ غزنوی خاندان سے لے کر آخری مغل شہنشاہ تک، لاہور کا حکمران شہزادہ ہی تخت دہلی پر رونق افروز ہوتا رہا اور لاہور کا صوبے دار، دربار دہلی میں دیگر امرا میں بلند مرتبت قرار دیا جاتا رہا۔

اہل ہنود کے بقول رام چندر جی کے سپوت "لو" نے اس شہر کی بنیاد رکھی اور اسے "لوپور" کا نام دیا۔ رام چندر کے دوسرے بیٹے کش نے کشور کے نام سے دوسرا شہر اباد کیا جو امتداد زمانہ کے ساتھ قصور ہوا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق پانڈوؤں کی نسل میں سے راجا پربجھت نے اس شہر بے مثال کی داغ بیل ڈالی جسے لوہار چندر راجا نے از سر نو تعمیر کیا۔ ہندوؤں کی معتبر کتاب 'ویش و بھاگ' میں لاہور کا نام بہرحال لوپور ہی ہے۔ ایک تیسری روایت میں لاہور کو دو الفاظ کا مرکب کہا گیا ہے۔ یعنی لو...... آورنا (آورنا سنسکرت میں قلعہ کو کہتے ہیں) لو آورنا سے وقت نے اسے لو آور بنایا اور کثرت استعمال سے لہاور ہوا جو بگڑیا سنور کر لاہور بنا۔ روایات کی اس کھینچا تانی کو فہم و فراست کی نگاہ سے دیکھا جائے تو لوپور با آسانی لاہور بن جاتا ہے جیسے پرش پور پشاور بنا۔

اسلامی عہد کے قلم کاروں نے لاہور کو مختلف ناموں سے پکارا۔ مثلاً لہور 'لوہاور 'لوہور' لہانور' لاؤہور' لانہور وغیرہ ہم...... روایات کے دھندلکے سے نکل کر تاریخ کے اجالے میں نگاہ دوڑائیں تو دوسری صدی عیسویں میں تاریخ میواڑ ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ اس تاریخ میں لاہور کا ذکر صاف الفاظ میں آیا۔ جب راجا کنک سین لاہور سے نقل مکانی کر کے میواڑ میں جا آباد ہوا۔ راجا کنک کو لاہور سے اتنا لگاؤ تھا کہ ریاست میواڑ میں بھی ایک لاہور معرض

وجود میں آیا۔ یہ جذباتی لگاؤ کی باتیں ہیں...... شہر..... اور لٹین (فرانس) کے باشندے جب ملک بدر کئے جانے کے بعد امریکا میں جا بسے تو انہوں نے نیو اور لٹین شہر بسایا۔ راجا کنک کی آمد 144ء کا واقعہ ہے۔ بہرحال روایات اور تاریخی شواہد سے یہ بات پایہ ثبوت تک ضرور پہنچتی ہے کہ لاہور ایک قدیم ترین شہر ہے جو نشیب و فراز سے گزرا۔ کئی غارت گر ہاتھوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ اس کی قسمت میں غبار شام کی تاریکی بارہا آئی اور بارہا روشن اجلی صبحیں طلوع ہوئیں۔ تخت دہلی کی جانب پیش قدمی کرنے والے صبار فتار گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندا گیا۔ خزاؤں کے زیر تسلط رہا۔ اس کی روٹھی ہوئی بہاریں واپس آئیں۔ 982ء تک یعنی محمود غزنوی کی فتح سے 39 برس پیشتر تک مورخین اسے خالص بت پرستوں کا شہر قرار دیتے ہیں۔ روشنی کی کوئی ایک آدھ کرن کسی گوشے کونے میں ہو تو اسے مورخ قابل توجہ نہیں گردانتے۔

جج بن بھندرا جسے لاہور کا بانی بھی کہا گیا ہے' اس خطے کا حکمران تھا۔ اس کا مسلک آفتاب پرستی تھا۔ اس کا راج کمار بھرت بھی آبائی مسلک کا پرجوش حامی تھا۔ بھرت نے ایک نفیس عبادت گاہ میں سورج کی مورتی رکھوائی جس کے متعلق افسانوی باتیں مشہور ہوئیں۔ اس سورج پرست نے لاہور میں 75 برس حکومت کی۔ جب اس کی عمر 99 برس کی ہوئی تو اس کا راج کمار تھنوت اپنے پتا جی کی طویل عمر سے اکتاہٹ کا شکار ہو گیا۔ پرانے خشک پتے گرنے کے بعد ہی نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں مگر یہاں خزاں رسیدہ پتا تھا کہ گرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تھنوت عیش و عشرت کا دلدادہ تھا مگر عمر رسیدہ باپ کی موجودگی میں من مانی نہیں کر سکتا تھا۔ ہوس بے لگام ہوئی تو تھنوت نے شفیق باپ کی ناز برداری کو نظرانداز کرتے ہوئے اسے لاہور کے قلعے میں پابند سلاسل کر دیا۔ ضعیف باپ کی کمر ہمت تو عرصہ ہوا ٹوٹ چکی تھی' وہ نوجوان بیٹے کو دیکھ دیکھ کر سانسوں کا تسلسل سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے بیٹے کو صرف اتنا کہا "میرے ہونہار سپوت' مجھے اتنی ہی تکلیف پہنچاؤ جتنی خود میں برداشت کرنے کی ہمت ہو۔"

"پتا جی' میں تو بہت کچھ برداشت کر سکتا ہوں" تھنوت نے زہریلی مسکراہٹ سے جواب دیا۔"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا" باپ نے سر جھکا لیا۔

تھنوت نے تخت لاہور پر بیٹھتے ہی گنبد سر کا استعمال ختم کر دیا اور اپنی سلطنت میں وسعت کے خواب دیکھنے لگا۔ دریائے چناب کے اس پار کا علاقہ تا کیشھو راجا جے پال کی عمل داری میں تھا۔ آبیل مجھے مار کے مصداق تھنوت نے اپنے لشکر کو آراستہ کیا اور جہلم تک کا علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی خاطر طبل جنگ بجا دیا۔ دریائے چناب کو عبور کر کے جب تا کیشھو کی سرزمین پر اس نے قدم رکھا تو حیران و ششدر رہ گیا۔ کیل کانٹے سے لیس ایک لشکر جرار اس کے سواگت کو سامنے کھڑا تھا۔ تھنوت کی فوج کے حرکت میں آتے ہی راجا جے پال کو خبر ہو گئی تھی اور اس نے اپ نے بیٹے آنند پال کی زیر کمان یہ ٹڈی دل فوج حریف کی مزاج پرسی کو بھیجی تھی۔ فرار کے تمام راستے بند تھے۔ آنند پال کے لشکر میں برہمنوں کا ایک خصوصی گروہ تھا جو بھیانک انداز میں نقارے بجایا کرتا تھا۔ یہ راجا جے پال کا امتیازی نشان تھا۔ طلوع آفتاب کی پہلی کرن کے ساتھ جب نقارے پر چوٹ پڑی تو لاہوری لشکر کے ہوش اڑ گئے۔ سب کی زبانوں پر ایک ہی فقرہ تھا جے پال آگیا' جے پال آگیا.......

ادھر آنند پال نے یلغار کا حکم دیا۔ اس کی ٹڈی دل فوج لاہوری لشکر کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگی۔ تھنوت کا لشکر بے یقینی کی دیوار کا نقشہ پیش کر رہا تھا جو آزمائش کے وقت ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہے۔ دوپہر سے پہلے پہلے جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ تھنوت کی فوج سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھی۔ آنند پال نے حریف کو گرفتار کیا اور دریائے چناب عبور کر کے اس کے گھر تک آپہنچا۔

"مہاراج! آپ نے ہم سے ٹکرانے کا نتیجہ دیکھا؟" آنند پال نے لاہور پہنچ کر طنز بھری مسکراہٹ سے پوچھا۔

"جب برے دن آتے ہیں تو مت جاتی رہتی ہے" تھنوت نے شدت خجالت سے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے جواب دیا۔ لاہور کے بارسوخ پنڈت' آپس کی ایسی چپقلش کو بنظر حقارت دیکھ رہے تھے کہ غزنی سے اٹھنے والا طوفان سب کی نگاہوں مین تھا۔ وہ وقت نفاق کا نہیں اتفاق کا تھا' لہٰذا دین دھرم کے نام پر سب نے بیک زبان آنند پال سے درخواست کی کہ اس مورکھ کو شما دی جائے۔

ادھر تھنوت نے بھی ملتجی لہجے میں تاعمر تابع داری کا یقین دلایا۔ آنند پال نے سیاسی مصلحت کے پیش نظر بھاری تاوان کے عوض تھنوت کی جان بخش دی۔ اسے خلعت بھی

عطا کی اور از سر نو لاہور کا راجا بنا دیا۔ تھنوت نے تاوان جنگ کی ہامی تو بھرلی مگر بہت کچھ ادا کر کے، تہی دست ہو جانے کے بعد بھی وہ مطلوبہ رقم پوری نہ کر سکا۔ اس طرح اہل لاہور کو جرمانے کی رقم ادا کرنا پڑی۔ یہاں سے ایک نئی کہانی کا آغاز ہوا۔ تھنوت نے عذاب کا جو بیج بویا تھا وہ توقع سے بہت پہلے پھوٹ نکلا۔

راجا بھرت، زندان میں زندگی کے دن پورے کر چکا تھا، تھنوت کا لاڈلا بیٹا چندرت باپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا، اسے اپنے دادا کا پابند سلاسل ہونا یاد تھا۔ اس نے بھرے دربار میں اپنے پتا کو سرزنش کی "آپ نے کس برتے پر راجا جے پال سے ٹکر لی تھی؟ رسوا ہونے سے بہتر تھا کہ آپ سر کٹوا دیتے!"

اہل دربار بھی زر جرمانہ ادا کرنے کے غم میں بھرے بیٹھے تھے۔ سب نے چندرت کی ہاں میں ہاں ملائی۔ باپ نے گرج کر راج کمار کو خاموش ہو جانے کی تلقین کی مگر بیٹا بھی پورا انتظام کئے بیٹھا تھا "آپ راج گدی کے اہل نہیں" اس نے اپنے حواریوں کو اشارہ کیا۔ راج سنگھاسن کے پائے ہل گئے۔ چندرت نے اپنے باپ کو اسی انداز میں اور اسی قلعے میں قید کر دیا جہاں اس کے دادا نے زندگی کی دن پورے کئے تھے۔ فلک کج رفتار اس مکافات عمل کو بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔ اب چندرت لاہور کی قسمت کا مالک و مختار تھا۔

راجا جے پال کو خبر ہوئی تو وہ آتش زیرپا ہو گیا "تھنوت ہمارا وفادار تھا" اس نے گرج کر کہا "ہم اسے قید میں ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔"

"حکم دیں پتا جی!" آنند پال نے سعادت مندی سے کہا۔

"لشکر تیار کرو اور لاہور کی اینٹ سے اینٹ بجا دو" جے پال نے حکم دیا "چندرت کو گرفتار کرتے ہی موت کے گھاٹ اتار دو اور شہر لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں اپنا اہل کار مقرر کرو" راجا جے پال نے اپنے بیٹے اور سیناپتی کو حکم دیا۔

آنند پال ایک بار پھر لشکر جرار لے کر عازم لاہور ہوا۔ اس نے ساموتلہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔

ادھر چندرت بھی لاؤ لشکر کے ہمراہ لاہور سے نکلا۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو چندرت نے آنند پال سے سوال کیا "مہاراج! یہ شتر بے مہار کی طرح منہ اٹھائے ہمارے علاقے گھس آنے کا مطلب؟"

”ایک ناخلف کپوت کو اس کے اعمال کی سزا دینا“ آنند پال نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”میرا باپ احمق تھا جو بغیر کسی جواز کے غیروں کے علاقے پر حملہ کر بیٹھا“ چندرت نے وضاحت کی ”وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ اس وقت فوج کے پاس جنگ کا کوئی مقصد نہ تھا۔ سربراہ کی ہوس ملک گیری کوئی مقصد نہیں ہوتا لہٰذا فوج بے دلی سے لڑی اور پٹ گئی۔ مگر آپ تو مجھے احمقوں کے بھی سردار دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کے پاس اس حملے کا کوئی جواز نہیں، لہٰذا اپنی موت کو آواز نہ دیں۔“

”جواز ہے اور بہت بڑا“ آنند پال نے حریف کی ہرزہ سرائی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”مجھے اپنے پتا جی کا حکم ماننا ہے اور ان کا حکم ہے کہ تمہیں سزا دی جائے۔ میں تمہاری طرح اولاد ناخلف نہیں۔ تم نے اپنے باپ کی تذلیل کر کے اپنی راہ میں کانٹے بو لئے۔ جس طرح تمہارے باپ نے اپنی راہ میں کانٹے بوئے تھے اور ذلیل و رسوا ہوا تھا۔“

چندرت چرب زبان ہونے کے ساتھ ساتھ مکار بھی تھا۔ اس نے حریف سیناپتی کو دغا و فریب سے گرفتار کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ مگر آنند پال بھی رزم و بزم دیدہ سپہ سالار تھا۔ چندرت نے حسب منصوبہ ایک خاص اشارہ کیا۔ اس کی فوج سے چار مستعد جوان آنند پال پر جھپٹے مگر آنند پال نے اس کا توڑ بھی سوچ رکھا تھا۔ ادھر چندرت کی فوج سے چار نوجوان میدان میں کودے، ادھر سے آٹھ سپاہی برق اجل بن کر ان کے سر پر گرے۔ آنند پال کے سیوکوں نے چندرت کے حواریوں کا کام تمام کر دیا۔ چندرت نے اپنے ہی قتل ہونے والے سپاہیوں کو لتاڑنا شروع کیا گویا اس بزدلانہ حرکت میں اس کی منشا شامل نہیں تھی۔

”ہم تم کو سوچنے کا ایک موقع دیتے ہیں“ آنند پال نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پرجا کا خون بہانے سے کوئی فائدہ نہیں، لاہور ہمارے حوالے کر دو۔“

چندرت کو طاقت کا توازن حریف کے حق میں دکھائی دے رہا تھا، لہٰذا اس نے جنگ کے بجائے فراست و سیاست سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور کچھ مہلت طلب کی جو آنند پال نے بخوشی دے دی۔ دونوں لشکر اپنے اپنے پڑاؤ میں واپس آ گئے۔ چندرت نے روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے آنند پال کے قتل کا منصوبہ بنایا جس کی بھنک آنند پال کے کانوں میں پڑی تو اس نے بھی حریف کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے اپنے لشکر میں سے پانچ سو سورماؤں کو ہدایت کی کہ وہ چندرت کی نقل و حرکت

پر نگاہ رکھیں اور موقع ملتے ہی اسے گرفتار کر کے لے آئیں۔ کامیابی کی صورت میں سب کو مالا مال کر دیا جائے گا۔ انعام کے لالچ نے وفاداری کو مزید تقویت بخشی۔ ادھر شومی تقدیر سے ایک روز چندرت کو شکار کھیلنے کا شوق چرایا اور وہ تکمیل شوق میں شکار کھیلتے کھیلتے اپنے پڑاؤ سے دور نکل گیا۔ یہ سراسر حماقت تھی۔ آنند پال کے آدمی تو پہلے ہی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سنہرا موقع پا کر اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ چندرت نے، مٹھی بھر ساتھیوں نے مقابلہ کیا مگر بے دلی سے...... آنند پال نے حریف کو پابہ زنجیر کر کے اپنے باپ کی خدمت میں بھیج دیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔

چندرت کا عہد حکومت 9 برس پر محیط ہے۔ حکومت ہاتھ سے نکلی تو چندرت کے دونوں بیٹے راہ فرار اختیار کر کے حاکم جالندھر کے ہاں پناہ گزیں ہوئے۔ یہ اس سال کا واقعہ ہے جب عباسی خلیفہ القادر باللہ نے محمود غزنوی کو خلعت فاخرہ سے نوازا تھا۔ عراق‘ خوارزم‘ نیمروز‘ خراسان‘ کے علاوہ ہند کے مفتوحہ علاقوں پر اس کی حکومت تسلیم کر لی تھی۔ یعنی 389 ہجری بمطابق 998ء۔ یہ علاقے القادر باللہ نے فتح نہیں کئے تھے بلکہ محمود غزنوی کے زور بازو کا نتیجہ تھے۔ خلیفہ نے صرف مہر خلافت ثبت کی تھی۔

اس زمانے میں سلطنت لاہور دریائے بیاس سے دریائے چناب تک پھیلی ہوئی تھی۔ چناب کے اس پار راجا جے پال کی وسیع و عریض حکومت تھی۔ اب جے پال کی حکومت کی مشرقی حد دریائے بیاس قرار پائی اور لاہور نے جے پال خاندان کے سارے خسارے پورے کر دیئے...... وہ خسارے جو جے پال کو محمود غزنوی سے ٹکرانے کے نتیجے میں ہوئے تھے۔

داستان میں مزید پیش رفت سے پیشتر جے پال کا تعارف پیش خدمت ہے۔ اس کی ذات کے متعلق مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہرحال وہ برہمن نہیں پنجاب کا راجپوت بھٹی تھا۔ لہٰذا اسے برہمن شاہی خاندان کا فرد کہنا غلط ہے۔ البتہ ہندو شاہی کہنے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ وہ متعصب ہندو ضرور تھا۔ ہندو شاہی خاندان کی وسیع سلطنت‘ ملتان سے دریائے چناب کے مغربی علاقے‘ کابل قندھار تک پھیلی ہوئی تھی مگر وہ غزنی میں سبکتگین کی طاقت سے مرعوب ہو چکے تھے۔ ان کے حوصلے اس قدر پست ہو چکے تھے کہ ان کو اپنا دارالسلطنت ”وی ہند“ بھی ڈولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سبکتگین نے اپنی سیاسی بصیرت سے افغان قوم کی تشکیل کی تو ہندو شاہی خاندان کے سر پر منڈلانے والا خطرہ اور بھی شدید ہو گیا۔

جے پال بن اشت پال 960ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے اس خطرے کا تدارک کرنے کی ٹھانی۔ ہندو شاہی خاندان کے ہاتھ سے کابل قندھار نکل جانے کے باوجود شہر کابل ابھی تک ان کے زیر تسلط تھا۔ جے پال نے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے کی خاطر پنجاب کے جنگ جو قبائل اکٹھے کئے۔ گوالیار، قنوج اور کالنجر کے راجگان کو ”دھرم یدھ“ کا واسطہ دیا اور ایک ٹڈی دل لشکر لے کر غزنی پر چڑھ دوڑا۔ وادی لمغان میں افغان اور ہندو شاہی افواج میں خونریز معرکہ آرائی ہوئی جس میں سبکتگین کامیاب و کامران رہا۔ محمود اس معرکے میں اپنے باپ کے ہمرکاب تھا۔ غزنی کے گرد و پیش کا سارا علاقہ اور زر کثیر تاوان جنگ ادا کرنے کے بعد جے پال معافی کا خواستگار ہوا۔ سبکتگین نے اپنے بیٹے کی منشا کے خلاف راجا کو معاف کر دیا۔ محمود غزنوی اپنے حکمران باپ کو صرف مشورہ دے سکتا تھا جو اس نے دیا۔ جے پال اپنے علاقے گنوانے کے باوجود خسارے میں نہیں رہا۔ افغانیوں نے اوپر سے دھکیلا تو اس نے لاہور پر قبضہ کرلیا۔

محمود غزنوی کا اندازہ درست نکلا۔ راجا جے پال اپنی راجدھانی پہنچ کر تاوان جنگ ادا کرنے سے صاف مکر گیا۔ **سبکتگین** کو خبر ہوئی تو وہ آندھی طوفان کی طرح اپنے لشکر کے ہمراہ پشاور پہنچا۔ لاہور سے جے پال ایک لاکھ کی فوج لے کر میدان میں اترا مگر ستاروں نے ایک بار پھر بے وفائی کی اور جے پال کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح وادی **لمغان** سے دریائے سندھ تک کا سارا علاقہ جے پال لاہوری کے ہاتھ سے نکل گیا۔

997ء میں محمود غزنوی باپ کی وفات کے بعد برسر اقتدار آیا تو جے پال نے ایک بار پھر قسمت آزمانے کا ارادہ کیا۔ (391ھ 1001ء) 27 نومبر کا دن تھا جب دونوں لشکر معرکہ آرا ہوئے۔۔۔۔۔ وہی میدان تھا، وہی حربے آزمائے گئے۔ سر کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ بے سروں کے لاشے تڑپنے لگے۔ جے پال کی یہ آخری شکست تھی۔ پندرہ بیٹوں اور پوتوں سمیت وہ پابند سلاسل ہوا۔ اڑھائی لاکھ دینار ادا کر کے جاں بخشی کی درخواست کی جسے محمود نے شرف قبولیت بخشا مگر اب اس کی راجپوتی انا جاگ اٹھی۔

کوئی نسبت کوئی رشتہ اس کا راستہ نہ روک سکا اور اس نے جیالوں کی طرح اپنے آپ کو دہکتی چتا کے حوالے کر دیا۔ کہتے ہیں لپکتے ہوئے شعلوں کا اس نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ اس کا یہ عمل ہندو ہونے کے باوجود اہل دل مسلمانوں کے ہاں قابل صد ستائش ٹھہرا۔ یہ اور بات ہے کہ زندہ جل مرنے کی رسم راجپوتوں میں رائج تھی۔

باپ نے اپنے آپ کو چتا کے سپرد کیا تو آنند پال تخت پر متمکن ہوا۔ اس وقت وہ لاہور کا گورنر تھا۔ اس گورنری کا آغاز 997ء فتح لاہور کے دن سے ہوا تھا۔ اس نے نندنہ کو اپنا پایہ تخت قرار دیا اور اپنے خاندان کی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنے کی تدابیر سوچنے لگا۔ سرفہرست مسئلہ طاقت کا حصول تھا جس پر اس نے بھرپور توجہ دی۔ اس زمانے میں ملتان کا حاکم داؤد قرامطی تھا جو محمود غزنوی کی توجہ کا مرکز تھا۔ پشاور کا علاقہ تاحال محمود نے اپنی قلمرو میں شامل نہیں کیا تھا لہٰذا داؤد پر حملے کے لئے اس نے دریائے سندھ کو رازداری کے پیش نظر پشاور کے قریب سے عبور کرنا چاہا۔ محمود غزنوی نے آنند پال کے سے دریا عبور کرنے کی اجازت طلب کی مگر آنند پال کے تو ارادے ہی کچھ اور تھے۔ ادھر داؤد ملتانی نے اسے اکسایا اور وہ محمود سے ٹکرانے پر تیار ہو گیا۔

پشاور کے قریب دونوں فوجیں آپس میں ٹکرائیں۔ آنندی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور

آنند پال راہ فرار اختیار کر کے سودرہ کی جانب نکل گیا۔ محمود، نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ کشمیر کی پہاڑیوں میں روپوش ہو گیا۔ محمود نے تعاقب ترک کر دیا اور غزنوی لوٹ گیا۔

غزنی میں ترکوں نے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ لہٰذا اندرونی شورش کی جانب متوجہ ہونا آنند پال کے تعاقب سے زیادہ اہم تھا۔ اس دور خرابی میں اسے چومکھی لڑنا پڑ رہی تھی۔ اپنے ناراض، بیگانے، ناخوش۔ اس مقام پر آنند پال کی زندگی کا عجیب و غریب رخ سامنے آیا۔ محمود جب بیم و رجا کی کشمکش میں مبتلا تھا تو آنند پال اپنی راجدھانی میں واپس آ چکا تھا۔ اس نے اپنے حریف کو بڑا منفرد خط لکھا جس کا متن یہ تھا۔

”عالی جاہ! آپ نے مجھے شکست سے ہمکنار کیا۔ اب آپ سنا ہے ترکوں سے جنگ میں مشغول ہیں۔ میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ مجھے شکست سے ہمکنار کرنے والا کسی دوسرے سے شکست کھا جائے۔ یہ میرے بھرم کا سوال ہے، لہٰذا میں سچے دل سے آپ کے دوش بدوش لڑنے کو تیار ہوں۔ جب آپ کا دشمن نیست و نابود ہو جائے گا تو ہم اپنے جھگڑے کا فیصلہ خود کر لیں گے۔“

اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ آنند پال کشادہ دل اور وسیع ظرف والا دشمن تھا۔ کمینہ ہوتا تو محمود کی مجبوری سے ضرور فائدہ اٹھاتا اور پیٹھ میں خنجر گھونپ دیتا۔ یہی راجپوتی انا تھی جس کی بنا پر جے پال رسم جوہر ادا کر کے پرائشچت (کفارہ ادا کرنا) پر مجبور ہوا۔

محمود نے اپنی مشکلات پر قابو پا لیا۔ ادھر آنند پال داغ شکست دھونے کو بے چین تھا۔ اس نے ہندوستان کے تمام راجاؤں سے دھرم کے نام پر اپیل کی۔ ہند کے دھرم سیوک لبیک کہتے ہوئے اس کے گرد آ جمع ہوئے۔ ایک ناقابل شکست قسم کا ٹڈی دل لشکر اس کی راجدھانی میں حاضر ہو گیا۔ یہ 399ھ بمطابق 1008-9ء کا واقع ہے جسے تاریخ میں محمود کا ہند پر چھٹا حملہ یا فتح پنجاب کہتے ہیں۔ اس دور تک اہل ہنود مسلمانوں کو ملیچھ یعنی پنچ اور حقیر قرار دے چکے تھے۔ یہ شودروں سے بھی نچلا درجہ تھا۔ شودروں کی ناگفتہ بہ حالت کے متعلق دنیا جانتی ہے۔ کالنجر قنوج، اجین اور گوالیار کے مہاراجگان نے بطور خاص اس دھرم یدھ (جہاد) میں حصہ لیا کیوں کہ ان کو بخوبی علم تھا کہ آنند پال ان کی ڈھال بن رہا تھا اور ڈھال ٹوٹ جائے تو پیکر جاں پر وار روکنا پڑتا ہے جو حیات کش بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

اس دھرم یدھ میں ہندو خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کنیاؤں نے اپنے زیورات اتار کر نذر کیے۔ عمر رسیدہ خواتین نے سوت کات کات کا سپاہیوں کے عیش و آرام کا اہتمام کیا۔ اب فوج ظفر موج کی کمان آنند پال کے نوجوان راج کماتری لوچھن پال کے ہاتھ میں تھی۔

محمود غزنوی پشاور کی جانب سے آیا، آنند پال لاہور سے نکلا ویہنڈیا ہنڈ کے قریب سے افغانوں نے دریائے سندھ عبور کیا، آنند پال نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

“بیٹا! دشمن خود بخود جال میں آ رہا ہے” آنند پال نے سیناپتی کو سمجھایا “اس کے آگے ہم اور پیچھے دریا، بھاگ کر جائے گا کہاں؟”

چالیس رو تک دونوں افواج آمنے سامنے ڈٹی رہیں۔ ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک روز طلوع آفتاب سے ذرا پہلے پنجاب کے تین ہزار کھوکھروں نے جنگلی درندوں کی طرح مسلمانوں پر ہلہ بول دیا اور پہلے ہی ہلے میں چار ہزار سر تن سے جدا کر دیے۔ یہ افتاد تو مسلمانوں کے سان گمان میں بھی نہ تھی۔ تب دونوں فوجیں گتھم گتھا ہو گئیں۔ محمود غزنوی کو اپنی شکست کے آثار صاف دکھائی دینے لگے۔ وہ عین میدان جنگ میں، شمشیر و سناں کے سائے تلے سر بہ سجود ہو گیا۔ پھر وہ اسپ تازی پر نئے عزم کے ساتھ سوار ہوا اور جاں نثاروں کے ہمراہ آگ اور خون کے سمندر میں کود گیا۔ غیر متوقع طور پر ہندی سپاہ کے قدم اکھڑنے لگے۔ آنند پال ایک فیل مست پر سوار تھا جو عین وقت پر دھوکا دے گیا۔ میدان جنگ سے منہ موڑ کر ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ، ہندی سپاہ بھی حوصلہ ہار بیٹھی۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

آنند پال کے حشر کے متعلق دو آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کشمیر کی جانب روپوش ہو گیا اور تاحیات منظر عام پر نہیں آیا۔ دوسری یہ کہ اس نے دل سے سلطان محمود غزنوی کو فاتح تسلیم کر لیا اور آخری دم تک خراج ادا کرتا رہا۔ کشمیر میں روپوش ہو جانے والی رائے قرین قیاس اس لئے نہیں کہ وادی کشمیر پر اس دور میں ایک سفاک قسم کی شہوت پرست ویدا ارانی حکمران تھی۔ جس کا تعلق پروہ گپت خاندان سے تھا۔ وادی کشمیر پر اس خاندان کا تاریک دور 922ء سے 1017ء تک چھایا رہا۔ اس خاندان کی ابتدا پروہ گپت اور انتہا ویدا ارانی پر ہوئی۔ اس دور کو عہد بے شرمی ہی کہا جا سکتا ہے۔

برصغیر کی سرزمین بشمولیت کشمیر ننگ انسانیت کے مقام پر فائز ہو چکی تھی۔ دور محمود غزنوی کے وقت کشمیر کی حالت زار کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ کشپ میر' کیشر یا کشمیر کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں صرف اس دور خرابی کی نشان دہی مطلوب ہے۔

922ء میں وادی کشمیر پر راجگان مالوہ کا راجا سنگرام دیو حکمرانی کر رہا تھا۔ سنگرام دیو نابالغ ہونے کے ساتھ ناتجربہ کار اور سادہ لوح قسم کا لڑکا تھا مگر اس کے دربار کا معزز وزیر پروہ گپت پرلے درجے کا مکار اور ہوس پرست انسان تھا۔ ابلیسی ذہانت کا مالک ہونے کی بنا پر دربار میں اسی کا طوطی بولتا تھا۔ پہلے تو اس نے بے مثال منصوبہ بندی سے پانچ پر خلوص اور باوفا وزرا کو ٹھکانے لگایا۔ ایک روز اپنے نابالغ ولی نعمت کو دریائے وتستا (جہلم) کی سیر کرانے لے گیا۔ سنگرام کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ - - - - پروہ گپت اس کی جان کا دشمن ہے۔ جب ہوش آیا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ پروہ نے سنگرام کی مشکیں کس کر اس کے سینے پر بھاری پتھر باندھا اور اسے دریائے جہلم کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

سنگرام کو دریا برد کرنے کے بعد پروہ گپت تخت کشمیر پر براجمان ہوا۔ اس کی حیا سوز حرکات کی فہرست بڑی طویل ہے جس کی سزا اس کی نسل کو بھگتنی پڑی۔ اس عذاب کا زمانہ پچاس سال پانچ ماہ اور ایک دن پر محیط ہے۔ پروہ گپت تخت نشین ہوا تو گویا شیطان آزاد ہو گیا۔ بلا امتیاز ادنیٰ و اعلیٰ خلق خدا پر زمین تنگ ہو گئی۔ کسی معزز فرد کی عزت محفوظ تھی نہ پاک دامن دوشیزہ کی عصمت۔ پروہ گپت پر تو گویا جنسی بھوت سوار تھا۔ تیرہ عدد درانیوں کے جھرمٹ میں بھی وہ ہوس پوری نہیں ہو رہی تھی۔ راجا یوششکو (جسے اس نے زہر دے کر ہلاک کیا تھا) کی ایک بیوہ حسن و جمال میں لاثانی تھی۔ پروہ گپت اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا مگر بیوہ نے وصل کی ایک شرط عائد کر دی۔

”جب تک میرے سٹور گباشی جیون ساتھی کی سمادھی اور اس سے ملحق مندر پایہ تکمیل تک نہ پہنچے میں ”ہاں“ نہیں کر سکتی“ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر پروہ گپت نے یہ دونوں کام اپنے ہاتھ میں لئے اور بیگار پکڑے گئے ہزاروں مزدوروں کو دن رات مشقت کی چکی میں پیس کر دونوں عمارتیں تعمیر کروائیں۔ بیوہ نے ”سپردگی“ پر موت کو ترجیح دی اور شب وصال سے ایک روز پیشتر سولہ سنگار کر کے اپنے آپ کو چتا کے حوالے کر دیا۔ پروہ گپت کی تو گویا بنیاد ہی ہل گئی۔ جس انداز میں وہ دھتکارا گیا تھا' وہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا

اور ہوس کا غلام شدت خجالت سے ایک سال تین ماہ بعد دنیا سے چلا گیا۔ کہتے ہیں شدت خجالت سے زیادہ اس کی بداعتدالیوں نے اس کی جان لی۔

پروہ گپت کے بعد اس کا عیاش بیٹا **کھیمہ** گپت تخت پر بیٹھا تو وہ باپ سے بھی دو ہاتھ آگے کی چیز ثابت ہوا۔ وہ طوائفوں اور ہیجڑوں کا دلدادہ تھا۔ نسوانی لباس و زیورات پہن کر دربار سجاتا۔ اس نے رعایا پر اتنے ٹیکس عائد کر دیئے کہ خلق خدا کی کمر ہمت ٹوٹ گئی' درمیانہ طبقہ پس کے رہ گیا' سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔ بھانڈ' سوانگ رچانے والوں' ہیجڑوں اور طوائفوں کی بن آئی۔ اس نے قانونا" اپنے درباریوں کو نسوانی لباس پہننے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہوس پرست' ویدارانی پر فریفتہ ہوا جو وادی کشمیر کی رسوا ترین حکمران بنی۔ **پھلگن** نامی وزیر نے بھی اپنی دختر نیک اختر پیش کی مگر اسے ویدارانی جیسی "قبولیت" حاصل نہ ہو سکی۔ ظلم و ستم کے اس نمائندہ حکمران کو منفرد نوعیت کے شکار کا شوق تھا۔ گھوڑے پر بیٹھ کر بلیوں کا شکار کھیلتا۔ بارہ مولا کے قریب ایک روز اپنے شوق کی تسکین کر رہا تھا کہ عجیب و غریب حادثہ پیش آیا۔ ایک خوف ناک شکل و صوت کا گیدڑ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا جس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ راجا کا خوف سے برا حال ہو گیا۔ اسی دہشت نے اس کا کام تمام کر دیا۔

976ء میں **کھیمہ** گپت کا نابالغ بیٹا ابھی مینو' ویدارانی کی نگرانی میں تخت نشین ہوا۔ ویدارانی نے چند برس تو صبر سے کام لیا مگر آخرش اپنا اصل رنگ دکھانا شروع کیا۔ یہی وہ دور ہے جب راجا جے پال اور **سبکتگین** کا آپس میں ٹکراؤ ہوا۔ ابھی مینو کے عہد حکومت میں سری نگر شہر میں آگ لگی اور مکمل شہر جل کر راکھ ہوا۔ یہ برائے نام راجا فوت ہوا تو ویدارانی نے اپنے پوتے نندی گپت کو تخت پر بٹھایا اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ غیر متوقع طور پر نند گپت اپنی دادی ماں پر نکتہ چینی شروع کر دی گویا ایک پیدل نے شہ کو للکارا۔ ویدارانی نے اپنے پوتے کو زہر دے کر کشمکش حیات سے آزاد کر دیا۔ یہی حشر اس نے اپنے دوسرے پوتے تربھون گپت کا کیا' یعنی اس کے سر پر تاج سجایا۔ پوتے نے دادی اماں کی منشا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

اس بار ویدارانی نے تربھون گپت کے شیر خوار بیٹے کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا۔ اس کا نام **بھیمہ** گپت تھا۔ ویدارانی کی عمر تو بھگوان سے لو لگانے کی تھی مگر ایک روز عجیب اتفاق

ہوا۔ ایک مردانہ وجاہت کا گبرو نوجوان گوجر، رانی کے دربار میں ریاست پونچھ کا ایلچی بن کر آیا۔ اسے دیکھ کر باسی کڑھی میں گویا ابال آ گیا۔ ویدا رانی تو بس مسلسل اسے قربان ہو جانے والی نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ پہلے تو درباریوں نے ان نگاہوں کو "ممتا" گردانا مگر نگہ ہوس کب چھپی رہ سکتی ہے؟

"نوجوان! ایک بار دربار سے باہر جاؤ اور پھر اسی قاتلانہ انداز میں چلتے ہوئے میرے سامنے آؤ" ویدا رانی نے عجیب و غریب حکم دیا۔ حکم تو حکم ہوتا ہے۔

پہلے تو نوجوان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر جب وہ بات کی تہ تک پہنچا تو حیرت میں ڈوب گیا۔ اس انداز دل ربائی پر ویدا رانی مر مٹی اور دربار برخاست کر کے نوجوان کو گوشہ تنہائی میں لے گئی۔ چند روز کی غیر حاضری کے بعد رانی ماتا نے دربار لگایا تو ایلچی نوجوان اس کا پتی بن چکا تھا۔

بھیم گپت نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی پردادی پر بڑا غصہ آیا مگر ویدا رانی نے ایک ہی پھونک سے یہ چراغ بھی گل کر دیا اور خود کشمیر کے تخت پر بیٹھی۔ یہ 998ء کا ذکر شر ہے۔ اس رانی نے اٹھارہ برس مزید حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں بقول روایت، آنند بال نے کشمیر میں پناہ لی تھی۔

محمود غزنوی نے البتہ 1015ء میں اس پر حملہ ضرور کیا تھا۔ محمود غزنوی کے خیال میں کشمیر، پال خاندان کی جائے پناہ تھی اور وہ اس کا تدارک کرنا چاہتا تھا۔ حملے کی دوسری وجہ، خلق خدا کی دکھ بھری صدائیں اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی تھیں۔ بہرحال یہ مہم کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ ایک تو افغانی فوج راستہ بھول گئی، دوسرے برف باری کا آغاز ہوا تو تمام راستے مسدود ہو گئے۔ فوج کے کئی سپاہی لقمہ اجل ہوئے اور محمود غزنوی کو یہ مہم ترک کرنا پڑی۔

آنند پال کے بعد اس کا جوشیلا بیٹا ترلوچن پال تخت نشین ہوا تو اس نے محمود کو خراج دینا بند کر دیا، لہٰذا ایک بار پھر میدان کارزار گرم ہوا۔ نندنہ کا قلعہ محمود کی یلغار کا سامنا نہ کر سکا۔ ترلوچن نے قلعے کی حفاظت اپنے بیٹے بھیم پال کو سونپی اور خود کشمیر کی جانب کوچ کر گیا۔ نندنہ کا قلعہ خوں ریز جنگ کے بعد سر ہوا۔

ترلوچن کی معاونت کے لئے کشمیری لشکر دریائے جہلم کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے

تھا۔ محمود نے اس کشمیری لشکر کو بھی مار بھگایا۔ ترلوچھن کی کمر ہمت ٹوٹ چکی تھی اور کشمیری مددگار بھی بھاگ چکے تھے۔ آخر اس نے اپنی بچی کھچی طاقت سمیٹی اور لاہور کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ بھیم پال بھی باپ کی ڈھارس بندھاتا رہا۔

قیام لاہور کے دوران اگر یہ دونوں باپ بیٹے عقل سے کام لیتے تو شائد بچاؤ کی صورت پیدا ہو جاتی مگر وہ مسلسل محمود غزنوی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ مثلاً 410ھ بمطابق 1019ء انہوں نے والی کالنجو کی بھرپور امداد کی۔ آخر 412ھ یعنی 1021ء میں محمود غزنوی نے اپنے راستے کے یہ دونوں کانٹے ہٹا دیئے۔ ترلوچھن پال تو اجمیر کی طرف بھاگ چکا تھا‘ اس کا نڈر بیٹا بھیم پال لاہور کا مالک و مختار تھا مگر وہ غزنوی سیلاب میں خشک تنکے کی طرح بہہ گیا۔ اور لاہور کو سلطنت غزنویہ میں شامل کر لیا گیا۔ لاہور میں دو نائبین مقرر کئے گئے۔ ایک قاضی شہر (یا صوبے دار) دوسرا سپہ سالار۔

اندرونی انتظام و انصرام قاضی کا شعبہ ہوا کرتا تھا جب کہ سپہ سالار کے فرائض میں بیرونی معاملات تھے۔ دونوں صرف مرکز کو جواب دہ ہوتے تھے۔ آپس میں گویا دونوں ہم مرتبہ تھے۔ یہ دستور سلطان مسعود بن محمود کے زمانے تک رہا۔

لاہور کا پہلا قاضی ابوالحسن علی المعروف قاضی شیراز تھا اور پہلا سپہ سالار عبداللہ قرآتگین۔ اس کے بعد ابوالفتح وافغانی اور تیسرے نمبر پر ابوالفرج کرمانی‘ اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوا۔ قاضی شیراز مزاج سلطان سے آشنا تھا۔ یہ آشنائی اس کی مقبولیت کا سبب تھی جس کی بنا پر وہ خود پسند اور مغرور ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کی کسی بھی سپہ سالار سے بن نہ آئی۔ اس طرح لاہور مسلسل عذاب میں رہا۔ سپہ سالار کرمانی تک تو معاملہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا مگر چوتھا سپہ سالار لاہور‘ اریارق تھا جو قاضی شیراز سے بھی زیادہ منہ زور ثابت ہوا۔ قاضی موصوف جو سپہ سالار کو اپنے سے کمتر سمجھنے کا عادی تھا‘ اریارق پر قابو نہ پا سکا۔

1030ء میں سلطان محمود غزنوی کے سفر آخرت اختیار کرنے کے بعد اس کا بیٹا محمد مختصر سی مدت کے لئے تخت نشین ہوا (یعنی صرف چھ ماہ) تو اریارق اس کے احکام کو بھی بالائے طاق رکھ کر اپنی مان مانی کرتا رہا۔ لیکن جب محمود غزنوی کا دوسرا بیٹا مسعود تخت غزنی پر رونق افروز ہوا تو اس نے اریارق کے کس بل نکال دیئے۔ اسے پابہ زنجیر کر کے غور بھیج دیا۔ ظلم و تعدی سے جمع کی ہوئی اس کی ساری دولت بحق سرکار ضبط کر لی۔ اس کی جگہ احمد نیالتگین کو

تزک و احتشام سے نیا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔

لاہور کے مصائب کا پھر بھی ازالہ نہ ہو سکا۔ احمد نیالتگین اور قاضی شیراز نئے سرے سے سرد جنگ میں مصروف ہو گئے۔ لشکر سپہ سالار کا حامی تھا مگر قاضی نے مرکز کو یقین دلایا کہ نیالتگین پنجاب میں خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ مسعود نے قاضی شیراز کی باتوں میں آکر اپنے ہی فرستادہ سپہ سالار پر بغاوت کا الزام لگا دیا اور اس کی سرکوبی کو ناتھ نامی ایک ہندو سالار کو بھیجا۔ نیالتگین کو خبر ہوئی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا اور شرارت کی جڑ قاضی شیراز کو سبق سکھانے اپنی مہم کو ادھورا چھوڑ کر لاہور کی جانب لپکا۔ اس طرح آتش فساد بھڑک اٹھی۔ قاضی صاحب قلعہ بند ہو گئے۔ نیالتگین نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ بڑی ہی واہیات صورت حال تھی۔ سلطان محمود غزنوی کو آنکھیں بند کیے ابھی دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ صرف چار برس اور اس کے جانشین یہ گل کھلا رہے تھے۔

محاصرے کے دوران ہی ناتھ لاہور پہنچ گیا مگر احمد نیالتگین نے مرکزی فوج کو مار بھگایا۔ اس کی جگہ ایک اور ہندو سالار تلک نے نیالتگین کی سرکوبی کا بیڑا اٹھایا جو ابھی تک قاضی صاحب کا محاصرہ کیے بیٹھا تھا۔ تلک نے نیالتگین پر قابو پا لیا اور اس کے ساتھیوں کو عبرت ناک سزا دی۔ نیالتگین کا سر کاٹ کر سلطان مسعود کی خدمت میں بھیج دیا۔ 1021ء سے 1037ء تک لاہور میں فساد بپا رہا۔ آخر 1037ء میں سلطان محمود کا چہیتا غلام ایاز لاہور کا صوبے دار مقرر ہو کر آیا تو اہل لاہور نے سکھ کا سانس لیا۔ ایاز کا لاہور جیسے صوبے کا حاکم مقرر ہونا اچھوتوں یا شودروں کے لئے اس دور میں واقعی باعث حیرت تھا کیوں کہ رعایا ایاز کی ساری زندگی سے مکمل طور پر آشنا تھی۔

وہ ایک تہی دست غلام کی حیثیت سے محل میں آیا۔ محمود غزنوی نے اس میں پوشیدہ صلاحیتوں کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ رفتہ رفتہ وہ عروج کے اس مقام پر پہنچا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ یہ اسلامی اخوت و مساوات کا وہ روشن پہلو تھا جس میں بلا امتیاز ادنیٰ و اعلیٰ ہر فرد کیلئے عزت و توقیر کے مواقع موجود تھے۔ سب سے بڑی سفارش انسان کا نیک عمل اور اس کی صلاحیت مانی اور گردانی جاتی تھی۔ موروثی یا پیدائشی لحاظ سے نہ کوئی بد بخت کہلاتا تھا نہ سوختہ ساماں۔ یہ اسلام یعنی دین فطرت کی بڑی موثر تبلیغ تھی۔ یہ گویا لاہور کے گرد و پیش چھائے ہوئے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی بڑی جان پرور کرن تھی۔

ایاز سے پہلے محمود غزنوی کا نافذ کردہ قانون کہ ایک صوبے میں دو ہم مرتبہ حکمران ہوں گے اور وہ صرف مرکز کو جواب دہ ہوں گے۔ (یعنی قاضی اور سپہ سالار) وقتی ضرورت کے تحت بے شک ٹھیک تھا مگر مرکز کی گرفت کمزور ہوتے ہی یہ قانون باعث فساد بن چکا تھا، جیسا کہ سپہ سالار اریارق نے پر پرزے نکالے۔ قاضی شیراز کی ہوس جاہ و حشم کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مگر بنیادی فتور، قانون میں تھا۔ بہر کیف ایاز کی آمد سے اس نقصان کا ازالہ بھی ہوا اور تبلیغ دین بھی ہوئی۔ اس دور میں لاہور، شہر اور صوبہ دونوں حیثیتوں سے مشہور تھا۔ بحیثیت صوبہ اس کا اپنا پایہ تخت بھی تھا یعنی مندھوکور جو دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر آباد تھا اور اسی کے قلعے میں قاضی شیراز نے پناہ حاصل کی تھی۔

ایاز نے لاہور آتے ہی شہر کی دگرگوں حالت کی جانب توجہ مبذول کی۔ فساد مسلسل کی بنا پر نصف سے زیادہ عمارات نذر آتش ہو چکی تھیں، تین روز تک غزنوی افواج نے اس شہر کا حلیہ بگاڑا تھا۔ لوگ خوف و ہراس کا شکار تھے۔ ابن الوقت قسم کے حضرات دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک گروہ قاضی شہر کی خوشنودی حاصل کرنے میں مصروف تھا اور دوسرا سپہ سالار کی۔ کدورتیں، نفرتیں عروج پر تھیں۔ ایاز نے امن و امان بحال کیا۔ پرانے شہر کی تعمیر نو کے ساتھ ساتھ موجودہ جگہ پر نیا شہر آباد کیا۔ قدیم شہر کا محل وقوع موجودہ اچھرے کی جانب تھا۔ لاہور کی تعمیر نو سید علی ہجویریؒ کی آمد سے پہلے یعنی 432ھ میں پایہ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔

ایاز اپنے تشکیل نو کردہ شہر لاہور میں دم آخر تک مقیم رہا اور اسی شہر میں وہ زیر زمیں ابدی نیند سویا ہوا ہے۔ چوک رنگ محل اندرون شاہ عالمی، بزاز ہٹہ کی جانب چند فاصلے پر ایک گم نام احاطے میں اس کا مدفن ہے۔

محمود غزنوی کے جانشین پرلے درجے کے احمق ثابت ہوئے بہر حال جیسا کہ اشارتاً بیان کیا جا چکا ہے محمود نے دین فطرت کا بیج بونے کے لئے سرزمین برصغیر کو ہموار کیا۔ ہند کی صورت حال تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔ محمود نے ہند پر سترہ بار چڑھائی کی جسے نام نہاد ‘سیکولر حضرات بنظر حقارت دیکھتے ہیں، مگر وہ اس حقیقت کو نظرانداز کر جاتے ہیں کہ سرزمین ہند پر چھائی ہوئی تاریکی کی گھٹائیں کس قدر گھناؤنی تھیں اور یہ صورت حال کس شے کی متقاضی تھی۔

جب اس نے 26-1025 میں سولھواں حملہ سومنات پر کیا تو وہاں کیا ہو رہا تھا؟ ہم صرف یادداشت تازہ کئے دیتے ہیں۔ اس میں اہم ترین شے شوجی کا لنگ تھا جسے تمام دیوتاؤں پر فوقیت حاصل تھی۔ لوگوں کا اعتقاد تھا مرنے والے کی روح، موت کے بعد اس مندر میں آ جاتی ہے۔ مندر کی گھنٹیاں بیس من وزنی طلائی زنجیروں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک ہزار برہمن مندر کی آرائش و زیبائش پر متعین تھے۔ مندر کے اخراجات کے لئے دس ہزار گاؤں وقف تھے۔ ان تمام باتوں کو جو چاہے نظر انداز کر دے مگر انسانیت کی توہین ایک اور انداز سے بھی ہو رہی تھی۔ پانچ سو منتخب کنواری دیوداسیاں شولنگ کے سامنے رقص کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر مندر میں مقیم تھیں۔ ان دیوداسیوں کے اضافی فرائض میں اس طلائی لنگ کو گنگا جل سے روزانہ اشنان کرانا بھی شامل تھا۔

سید علی ہجویریؒ کی آمد سے پہلے دین فطرت کی روشن کرنیں جو لاہور یا اس کے گرد و پیش کے ماحول کو منور کر چکی تھیں، ان کا تذکرہ بے حد ضروری ہے۔ ان پاک ہستیوں میں سر فہرست "بی بی پاک دامناں" ہیں جن کو بامر مجبوری سرزمین لاہور پر قدم رنجہ فرمانا پڑا۔

ایک روایت کے مطابق سید الشہدا حضرت امام حسینؓ سوئے کوفہ روانہ ہوئے تو اہل قافلہ میں بی بی حاج، بی بی تاج بی بی حور، بی بی نور، بی بی گوہر اور بی بی شہناز بھی تھیں۔ حضرت امامؓ نے ان چھ خواتین کو رخصت ہونے کو کہا اور وہ عازم لاہور ہوئیں۔ یہاں انہوں نے راجوں کی بستی **ٹھٹھی** میں قیام کیا۔ اجنبی سرزمین، نا آشنا لوگ کوئی پرسان حال تھا نہ شناسا۔ چند خدام البتہ ہمراہ تھے۔ صنم کدوں میں ہل چل سی مچی تو ہندی جوتشیوں نے حساب لگا کر اعلان کیا کہ چند پاک ہستیاں اس سرزمین پر آ چکی ہیں۔ اس علاقے پر راجا برماستری کی حکمرانی تھی جس کے راجکمار کا نام بکرما سہائے تھا۔ ایک روایت میں راجا کا نام مہارین بھی آیا ہے۔ راجا موصوف نے اپنے راجکمار کو ایلچی بنا کر ان خواتین کی خدمت میں بھیجا اور ان کو دربار میں طلب کیا مگر پردہ دار خواتین نے اس حاضری سے معذوری کا اظہار کیا۔ راج کمار کو بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ نہ وہ خواتین کو مجبور کر سکتا تھا نہ راجا کی حکم عدولی کا مرتکب ہو سکتا تھا۔ اس نے یہ مسئلہ خواتین کے گوش گزار کیا تو بی بی حاج نے اسے اپنے حضور طلب فرمایا اور نظر توجہ سے دیکھا۔ بکرما کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ اندر کی دنیا روشن ہو گئی، اس طرح اس نے دین فطرت کی روشنی کو قبول کیا۔ یہ ساکن جھیل میں پتھر پھینکنے والی بات تھی۔ راج

سنگھاسن تھرتھرانے لگا۔ خواتین کی جائے قیام کے گرد لوگ آ جمع ہوئے۔ یہ آسمان سے گرا اور **کھجبور** میں اٹکا والی بات تھی۔ خواتین اس قدر خائف ہوئیں۔ کہ خدام کو انہوں نے لوٹ جانے کا اذن دیا اور خود سر بہ سجود ہو کر پردہ پوشی کی دعائیں مانگنے لگیں۔ صدق دل سے کی ہوئی دعائیں قبول ہوئیں۔ زمین میں وسیع و عریض شگاف نمودار ہوا اور ساری خواتین اس میں روپوش ہو گئیں۔ چار خدام اذن کے باوجود واپس نہیں گئے تھے یعنی حافظ ابوالفتح، ابوالفضل، ابوالمکارم اور عبداللہ۔ یہ حضرات بھی "مزار بی بی پاک دامناں" لاہور ہی میں مدفون ہیں۔ ان حفاظ کو بھی زمین نگل گئی تھی۔ یہ لاہور کے اندھیرے میں روشنی کی پہلی کرن تھی جو فوراً ہی بجھ گئی۔ آج اس کے آثار صرف ایک مزار کی صورت میں اس سرزمین پر موجود ہیں۔

جب خواتین زمین میں سما گئیں تو ان کی رداؤں کے پلو باہر رہ گئے۔ موجود قبور ان پلوؤں کی نشان دہی پر بنائی گئیں۔ راج کمار کا اسلامی نام محمد جمال تجویز ہوا تھا جو "بابا خاکی" کے نام سے مشہور ہوا۔ بابا خاکی، بابو نامی **بلیھم** جاٹ کی دختر سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا۔ یہ لڑکی اپاہج تھی مگر بابا خاکی کی زوجیت میں آنے کے بعد وہ بھلی چنگی ہو گئی۔ چند لوگ یہ دیکھ کر مسلمان بھی ہوئے۔ جمال کی اولاد ایک عرصے تک اس مزار کی مجاوری کرتی رہی ۔۔۔۔۔ مسلمان ہونے والے رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے، چند ایک کے ناموں کا سراغ ملتا ہے **مثلاً** "شیخ حاجی عزیز، شیخ دھاتو، شیخ دادو وغیرہ ۔۔۔۔ امتداد زمانہ کے ساتھ سب نسیاً" **منسیا** ہو گئے۔ رہے نام اللہ کا۔

سید علی ہجویری کے ورود لاہور سے پہلے جو چراغ رشد و ہدایت یہاں روشن تھا، ان کا اسم گرامی شاہ حسین زنجانیؒ ہے۔ زنجان، اندجان اور سنجان یہ خراسان کے مشہور قصبے ہیں۔ موصوف کا تعلق چونکہ قصبہ زنجان سے تھا لہٰذا زنجانیؒ ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ آپ سید الشہداء امام حسینؓ کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے۔ حسینی خاندان کے چند افراد عراق میں قیام پذیر ہوئے۔ تیسری صدی ہجری میں امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد میں سے ابو جعفرؒ برقعی بغداد سے نقل مکانی کر کے زنجان میں آ بسے۔ موصوف شاہ حسین زنجانیؒ کے دادا تھے۔ 347ھ میں زنجان کے سید علی محمود کے ہاں مریم صغریٰ کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا جو راہ حق کا مینارۂ نور ثابت ہوا۔ اس کا نام حسین تجویز کیا گیا۔ قصبے کے امام مسجد سے ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا

مگر رفتہ رفتہ باطنی اسرار سے واقفیت کی تڑپ نے سپرد اضطراب کیا تو آستانہ ختلیؒ پر حاضر ہوئے اور جنیدیہ سلسلے کے ہو کر رہ گئے۔ یہ سلسلہ حیدر کرارؓ تک جا پہنچتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ راہ سلوک کے مسافر نے احکام شریعت ادا کرنے میں تسہل پسندی سے کام لیا ہو گا۔ حسین زنجانیؒ کا معمول تھا کہ اکثر نماز عشا اور فجر ایک ہی وضو سے ادا کرتے۔ سجدوں کی لذت کے طفیل مرشد نے میراں کا لقب عطا کیا جو رموز ولایت میں ایک بلند مقام ہے۔

خرقہ ولایت حاصل کرنے کے بعد اندر کی روشنی دو چند ہوئی تو مرشد نے حکم دیا " حسین! بلاد ہند کی طرف کوچ کر جاؤ۔ اور وہاں کی شب تاریک میں شمع ہدایت روشن کرو۔ تعمیل ارشاد میں حسینؒ واپس زنجان آئے اور مختصر سے قافلے کی صورت میں تبلیغی سفر کا آغاز کیا۔ یہ 375ھ کا واقعہ ہے۔ حقیقی برادران یعقوب زنجانیؒ اور موسیٰؒ بھی شریک سفر تھے۔ یہ قافلہ ایک طویل مسافت طے کر کے قذوین' رے' سبزوار' نیشاپور' ہرات' کاکاخیل' جنجوعہ' مہمند' چنبہ' غزنی' کابل' جلال آباد' پشاور' **ککھڑ** کے مقامات سے ہوتا ہوا 387ھ میں لاہور پہنچا اور موجودہ شاہ عالم دروازے کے قریب چند روز کے لئے قیام پذیر ہوا۔ حب اختیاری کے گرفتار نے ظلمت شہر کا جائزہ لیا۔ یعقوبؒ کو جنوبی حصہ اور موسیٰؒ ستی کو دروازے کے گردونواح کا علاقہ عطا کیا اور خود ساحل دریا سے دور مشرقی علاقے میں بسیرا کیا۔ اسی سکونت درویش کی مناسبت سے وہ علاقہ آج "چاہ میراں" کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ جس نے نورِ ازل سے اپنی نسبت جوڑلی' نام اسی کا زندہ رہا سیم و زر کے پرستار' سگ دنیا والوں نے یکسر نظر انداز کیا اور درویشان بے ریا کو دل گہرائیوں میں جگہ دی۔ پہلا کام جو حسین زنجانیؒ نے سرانجام دیا۔ وہ مقامی زبان سے مکمل آشنائی تھی۔ آپ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ بلند آواز میں چیخنے چنگھاڑنے سے کام نہیں بنے گا کیونکہ قرآنی الفاظ میں گدھے کی بلند آواز کو مکروہ کہا گیا ہے جو اہل دل کے نزدیک حرام کے زمرے میں آتی ہے۔ اوپر والا تو اندھیری رات میں پہاڑ کی چوٹی پر رینگنے والے کیڑے کے قدمیوں کی آواز بھی بخوبی سن سکتا ہے۔ لہٰذا حسین زنجانیؒ نے دل میں اتر جانے والے مدھم اور خوش گوار لہجے کو اپنایا۔ لاہور کی اکثریت سورج پرست تھی۔ آپ گلی کوچوں میں گھومتے رہتے اور پیغام حق کی دستک ہر مناسب گھر پر جا دیتے۔ بے شک بادی النظر میں یہ دیوانگی تھی مگر اہل جنوں ہی تو کارہائے نمایاں سرانجام دیتے آئے ہیں۔ عقل تو لب بام ہی رہ

جاتی ہے۔ جیسے دو گھڑی تماشا کرنے والے تماشائی۔۔۔۔

حسب توقع سورج دیوتا کے پرستار اٹھ کھڑے ہوئے "یہ دیوانہ تو سنجیدہ ہے۔ ہمارے دیوتا کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے۔" انہوں نے حسب روایت رکاٹیں کھڑی کیں مگر حسینی لہجہ اتنا مدلل‘ اتنا رسیلا ہوتا تھا کہ مخالفین آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے۔۔۔۔۔ بس کچھ نہ بن پڑا تو لونڈوں لپاٹیوں کو پیچھے لگا دیا۔ وہ آوازیں کستے‘ تالیاں پیٹتے اور سنگ زنی کرتے مگر رفتہ رفتہ پتھر میں جونک لگنے لگی۔ لوگوں کا رویہ ضرور بدلا لیکن تین برس تک کوئی ایک شخص بھی آپ کی بات نہ سمجھ سکا۔ جب مبلغ کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی تو مرشد نے بذریعہ کشف صرف جمعے والے دن تبلیغ کا حکم دیا۔ یہ سلسلہ مزید اکتالیس برس جاری رہا۔ کچھ لوگ بنیادی اصولوں سے واقف ہو کر مسلمان بھی ہوئے۔

اس ماحول میں تو بس چمتکاروں کا چرچا تھا۔ جادو ٹونے‘ ٹوٹکے اور دیگر خرافات ایمان و عقیدے میں شامل تھیں۔ ایک جمعے کو آپ حسب معمول دعوت حق دے رہے تھے کہ ایک نحیف و نزار سورج دیوتا کا عاشق چیخنے چلانے لگا "بند کرو یہ جھوٹی باتیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ان میں تاثیر کیوں نہیں؟" عاشق آفتاب نے دلیل پیش کی "میں دو برس سے کسی مرض میں مبتلا ہوں سورج دیوتا کی کرنوں سے مجھے سکون ملتا ہے کیونکہ وہ سچا ہے۔ تم سچے ہو تو میرا روگ دور کر کے دکھاؤ۔"

یہ گویا دعوت مبارزت تھی۔ درویش نے مسکرا کر اسے قریب آنے کا اشارہ کیا اور خلق خدا محو تماشا تھی۔

"میرے محترم بھائی! ہمارے مرشد اول رحمت دو عالمؐ کا فرمان ہے کہ خلاف عقل چمتکار کی باتیں ایمان کے زمرے میں نہیں آتیں اور نہ ہی یہ کوئی دلیل ہے۔" حسین زنجانیؒ نے پوری توجہ سے مریض کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو اسی دلیل سے قائل ہو سکتا ہوں۔ اس قابل ہو تو قائل کر لو ورنہ خاموش ہو جاؤ۔" مریض نے درشت لہجے میں کہا۔

"اچھا میرے بھائی! اگر ایسا ہی ہے تو ایک گلاس پانی لے آؤ۔" درویش نے ہتھیار ڈال دیے۔

ان کی خدمت میں پانی پیش کیا گیا۔ درویش نے ایک گھونٹ پیا اور وہی پانی مریض کو

پیش کر دیا "صرف ایک گھونٹ تم بھی بھرلو۔" اب درویش کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا "اس انسانی گروہ میں اگر کوئی اور مریض بھی موجود ہے تو اسے بھی ایک گھونٹ پلا دو اور میرے رب کی بارگاہ میں سر جھکا دو۔"

پانچ آدمیوں نے اسی گلاس میں سے ایک ایک گھونٹ بھرا۔ پانی جس حلق سے اترا پیکر خاک کے روگ دور کرتا چلا گیا۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات تھی۔ مریض شفایاب ہو چکے تھے۔ درویش کی یہ کرامت جنگل کی آگ بن کر شہر میں پھیل گئی۔ یہ بات ان لوگوں کے مزاج کے مطابق تھی۔ حسین زنجانیؒ کی صداقت کا چرچا گلی کوچوں میں ہونے لگا۔ وثوق سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے سورج پرست حلقہ بگوش اسلام ہوئے مگر کچھ لوگوں نے اسلام کی حقانیت کو صدق دل سے تسلیم ضرور کیا۔ یہی تو ایمان ہے۔ اس آغاز کے بعد سلسلہ چل نکلا۔

431ھ میں جس روز آپ کا وصال ہوا وہی حضرت علی ہجویریؒ کے لاہور میں وارد ہونے کا دن ہے۔ سورج ایک سمت میں غروب ہوتا ہے تو دوسری سمت میں طلوع ہو جاتا ہے بس کچھ ایسا ہی ہوا۔ یہ گیارہ شعبان کا دن تھا۔ صرف چند روز پیشتر طبیعت ناساز ہوئی تو ایک عقیدت مند رام چندر نے عرض کی "حضور! میری خواہش ہے کہ آپ اب میرے غریب خانے کو رونق بخشیں۔"

"مگر عزیزم! ہمارا تو اب چل چلاؤ ہے۔" حسین زنجانی نے مسکرا کر کہا "محبوب سے وصال کا وقت قریب ہے۔"

"میری تمنا ہے کہ آپ کے سفر آخرت کا آغاز میرے غریب خانے سے ہو۔" رام چندر نے بصد انکسار دلیل پیش کی۔ درویش نے اپنے عقیدت مند کی دل شکنی ناپسند فرمائی اور چپ چاپ موجودہ یکی دروازے کی اندرونی آبادی میں آ گئے۔ (اس مکان کی نشان دہی کوشش کے باوجود نہیں ہو سکی) چنانچہ میراں حسین زنجانیؒ کا جنازہ اسی عقیدت مند رام چندر کے گھر سے اٹھا۔ یہ معاملات دل ہیں، انہیں دلائل کے خنجر سے مجروح نہیں کیا جاتا۔ بس ایسا ہی ہوا تھا۔ کیوں اور کیسے؟ اس کا جواب کون دے؟ چوک نیلم سینما، چاہ میراں روڈ پر مشرق کی جانب جاتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی سڑک (دائیں جانب) سبز گنبد والے مزار کی جانب جاتی ہے۔ یہی زنجان میں پیدا ہونے والے حسینؒ کی آخری آرام گاہ ہے۔

دوسری قابل ذکر ہستی جو سید علی ہجویریؒ سے پہلے لاہور میں موجود تھی اس کا نام شاہ

اسمعیلؒ بخاری ہے۔ مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔ یہ مبلغ دین محمود غزنوی کے عہد حکومت میں لاہور تشریف فرما ہوئے۔ وہ ہستی جس کی خوش کلامی و خوش خصالی کا خطہ لاہور میں 412ھ 448ھ تک چرچا رہا۔ گلی گلی دھوم مچی رہی۔ قلم کاروں کی تسہل پسندی کا شکار ہیں۔ حالات زندگی بے خبری کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اسے مصلحت ربی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ جب محمود غزنوی نے لاہور کو اپنی قلم رو میں شامل کیا تو صدائے حق کے علم بردار بھی اس کے ہمراہ تھے۔ شاہ اسمعیل بخاریؒ بھی اس گروہ میں شامل تھے۔ شہنشاہ نے اپنا فرض ادا کیا اور درویش بے ریا نے اپنا۔ درویش کار خیر میں مسلسل 36 برس مصروف رہے۔ گفتگو میں اتنی تاثیر تھی کہ ہر وعظ میں سینکڑوں لوگ گمراہی کو ترک کر کے ان کے دست حق پرست پر بیعت کرتے۔ لاکھوں احادیث زبانی یاد تھیں۔ قرآنی تفاسیر کا یہ عالم کہ منصۂ شہود پر آنے والی ہر تفسیر از بر تھی۔ حوالہ دیتے وقت صفحہ سطر تک کی نشان دہی فرما دیتے۔ ایک شمشیر براں تھی جو ردائے تاریکی کو لیر لیر کئے دیتی۔ کنہیا لال سے نور احمد چشتی تک تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شاہ اسمعیل بخاریؒ کا انداز بیاں لاثانی و بے مثال تھا۔ "مہتاب" کے لفظ سے شاہ صاحبؒ کی تاریخ وفات (448ھ) نکلتی ہے۔ اس زمانے میں مغلیہ شان و شوکت کی عکاسی کرنے والی عمارات تعمیر کرنے کا رواج نہیں تھا لہٰذا مزار کی تعمیر سادہ انداز میں ہوئی۔ مزار پر گنبد تک نہیں تھا۔ البتہ ایک سرسبز مزار کے لئے وقف تھا۔ اس زمین کی حدود موجودہ مال روڈ پر کیتھڈرل سکول سے رومن کیتھولک گرجا گھر کے وسیع احاطے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ای پلومر اسٹور سے مزنگ جانے والی سڑک آخری حد تھی۔ مشرقی جانب حدود مزار، پانی والی پرانی کوٹھیوں تک پھیلی ہوئی تھیں جن کا آج نام و نشان تک نہیں۔ رفتہ رفتہ یہ ساری اراضی مزار کے متولی و مجاور بیچ کر ہڑپ کر گئے۔ علم دین کے سمندر درس و تدریس کے مینار نور اور محرم رازدروں کے مزار کی آج یہ کیفیت ہے کہ اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ بہرکیف، مال روڈ کی طرف جاتے ہوئے سکول کی عمارت کے ساتھ سڑک کے سیدھے ہاتھ، چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد پختہ اینٹوں کا مزار آتا ہے۔

یہ مزار گوشۂ گمنامی میں نگاہوں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ہزاروں مسلمانوں پاگلوں کی طرح بھاگ دوڑ میں مصروف تربت درویش کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور سرزمین لاہور میں شجر صداقت کی آب یاری کرنے والے اس مبلغ کے حق میں دعائے خیر تک نہیں کرتے۔

مزار کے سرہانے چراغ دان ضرور موجود ہے مگر کوئی چراغ نہیں جلتا۔ شاید زمانے نے اس عظیم ہستی کو تہی دست اور مفلس مجھ رکھا ہے یہی ایک جواز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ۔۔۔۔۔

زمانہ لاکھ مروت سے کام لے پھر بھی
چراغ گور غریباں جلے جلے نہ جلے

لاہور کے پہلے مسلمان حکمران غلام ایاز کے بسائے ہوئے شہر لاہور کے یکی دروازے سے میراں حسین زنجانیؒ کا جنازہ آ رہا تھا اور سید علی ہجویریؒ کے سینے میں طوفان بپا تھا۔ مرشد کے حکم کی وضاحت ہو چکی تھی۔ خطہ لاہور کو مسلسل روشنی کی ضرورت تھی اور علی ہجویری وہ آفتاب تھا جو 11 شعبان 431ھ والے دن اس خطہ تاریک پر طلوع ہو رہا تھا۔

آفتاب سلوک نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا' احمد حمادی اور ابو سعید لپک کر شریک جنازہ ہوئے۔ درویش کا عقیدت مند سوختہ ساماں رام چندر جنازے کے پیچھے سرنگوں میں جا رہا تھا۔ آنکھ کے دریچوں سے گویا جان رس رس کر خارج ہو رہی تھی۔ سیدؒ نے بڑی رسان سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رام چندر نے اشک بار آنکھوں سے غم گسار کو دیکھا اور سیلاب کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"عزیزم! حوصلے سے کام لو۔ جو آیا ہے اسے آخر جانا ہے۔" سید علی ہجویریؒ نے مرہم تسلی سے نوازا۔

"جناب مجھ پر جو بیت رہی ہے آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں تو لٹ گیا' برباد ہو گیا۔" رام چندر نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

سیدؒ نے نگہ' التفات سے نوازنے کے بعد صرف اس قدر کہا "صبر کا دامن تھام لو گے تو لٹی ہوئی دولت مل جائے گی۔" شاید یہ طلسمی الفاظ تھے کہ اس سوختہ ساماں کو جیسے قرار سا آ گیا۔

"آپ کی اچھیا کا پالن کرنا ہی پڑے گا۔" رام چندر نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ سیدؒ نے آداب جنازہ کے مطابق میت کو کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد کاندھا دیا۔ سرہانے سے پائنتی کی جانب آئے۔ بار ولایت ایک کاندھے سے دوسرے کے کاندھے پر منتقل ہو گیا۔ وہ

بوجھ اگر پہاڑ پر آگرتا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ سیدؒ نے بار ولایت برداشت کرنے کے بعد بستی کی جانب دیکھا اور زیر لب کہا "ردائے لاہور تو جگہ جگہ سے تار تار ہے۔ رفو کا اتنا زیادہ کام؟" واقعی جن کے مرتبے بلند ہوں ان کی آزمائشیں بھی سوا ہوتی ہیں۔ "حفظ مراتب" کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔

سلطنت اسلامیہ انتشار کا شکار ہوئی تو آل سادات کے افراد دنیاوی حکمرانوں کے شر سے بچنے کی خاطر دوسرے ممالک کی طرف ہجرت کر گئے۔ سادات عظام میں سے ایک گھرانا غزنی آبسا۔ دنیاوی جخاہ و حشم سے محرومی کے باوجود سادات کا یہ گھرانہ علم و فضل کی دولت سے مالا مال تھا چنانچہ یہ خاندان غزنی میں قدور منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سید عثمان غزنیؒ کے ایک محلے جلاب کا وسنیک تھا جو قریبی محلے ہجویر کی ایک پابند صوم و صلوٰۃ خاتون سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا۔ سید عثمان کے ہاں اسی سید زادی کے بطن سے 400ھ سے لگ بھگ ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام علی تجویز کیا گیا۔ گویا اس بچے کا تعلق جلاب اور ہجویر دونوں محلوں سے تھا۔ سید عثمان کا لخت جگر نور ہدایت کا سرچشمہ اور تاریکی ہند کے لئے آفتاب عالم تاب ثابت ہوا اور علی ہجویری جلابیؒ کے نام سے برصغیر میں مشہور ہوا۔ خلق خدا نے اسے داتا گنج بخش کہا۔

اس ولی وقت کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے امام حسنؓ سے جا ملتا ہے جس کی تفصیل درج ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ بن عثمان بن علی بن عبدالرحمان، بن شاہ شجاع بن ابوالحسن بن حسن اصغر بن سید زید بن حضرت امام حسنؓ بن علی المرتضیٰ شیر خداؓ۔

حسب دستور بچے کو چار برس کی عمر میں حروف شناسی کے بعد تعلیم قرآن سے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ اہل خاندان کو یوں محسوس ہا جیسے تشنہ لب کے ہونٹوں سے جام شیریں لگا دیا جائے۔ جیسے مچھلی کو ذخیرۂ آب فراہم کر دیا جائے۔ جس کام میں دل کی رغبت اور روح کا میلان دونوں شامل ہو جائیں تو اس کی ہر دشواری دور ہو جاتی ہے۔ شدت طلب ایسے ہی رنگ دکھایا کرتی ہے۔ قرآنی تعلیم پایہ تکمیل تک پہنچی تو زبانوں پر عبور دکھایا کرتی ہے۔ قرآنی تعلیم پایہ تکمیل تک پہنچی تو زبانوں کو عبور کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ عربی، فارسی کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کی گئی۔ پھر فقہ و تفسیر کی باری آئی۔ علم کلام اور منطق کے بعد فلسفے

کو زیر کیا گیا۔ یہ ایک لحاظ سے عمر عزیز میں آنے والی مہمات کو سر کرنے کی تربیت تھی۔ علوم کے سمندر میں غوطہ زن ہونا ضروری تھا تاکہ اس کا استعمال برمحل اور بروقت ہو سکے۔ دوسروں کی جہالت کے خلاف صرف اس صورت میں برسرپیکار ہوا جا سکتا ہے۔ جب اپنے اندر کا ہر گوشہ منور ہو۔ علوم ظاہری کی تکمیل نابغۂ روزگار قسم کے اساتذہ نے کی۔ شیخ ابو العباس احمد بن محمد اشفاقی، شیخ ابو القاسم گرگانی، احمد بن محمد قصاب، ابو عبد اللہ محمد بن علی جو، تستانی کے نام سے مشہور ہیں۔ ابو سعید فضل اللہ بن محمد، مظفر بن احمد بن حمدان جو آسمان فلسفہ کے آفتاب عالم تاب تھے۔ ان کے علاوہ سید موصوف نے شیخ ابو القاسم عبد الکریمؒ بن ہوازن القشیری کے آگے بھی زانوئے تلمذتہ کیا۔ ہر استاد نے کاتب تقدیر کی رضا کی جوئی کے لئے صدق دل سے شاگرد رشید کو علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ کیا۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد سید علی ہجویریؒ عہد اضطراب میں داخل ہوئے۔ کسی دست حق پرست کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے۔ شاہین اگر ابرپاروں کے اوپر محو پرواز ہو تو اسے زیر دام لانے کے لئے کسی ماہر صیاد کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور بلند پروازی میں سید موصوفؒ کے مقابل کوئی نہ تھا۔ لہٰذا صیاد بھی کوئی بلند مرتبت ہونا چاہیے تھا۔ ملک شام کی سمت سے خوشگوار ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ اس طرح آپ نے شام کا سفر اختیار کیا جہاں سلسلۂ جنیدیہ کے پیشوائے طریقت ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ آپ کے منتظر تھے۔

محمد بن حسن ختلیؒ صاحب جلال و جمال قسم کے درویش تھے۔ بحیثیت مجموعی شان جلالی مزاج پر غالب تھی۔ رسوم و قیود میں جکڑے ہوئے صوفیا کو درشتی سے دھتکار دیتے تھے۔ صوفیانہ لباس تک سے گریز فرماتے۔ بقول سید علی ہجویریؒ ان جیسی باہیبت شخصیت اس عہد میں اور کوئی نہ تھی "دنیا کوئی دھتکارا جائے تو یہ سائے کی طرح پیچھا کرتی ہے" کے مصداق ختلیؒ گوشۂ تنہائی کی تلاش میں پہاڑوں کی جانب نکل جاتے مگر لوگ پھر بھی پیچھا نہ چھوڑتے۔ دلائل ولایت سے مسلح یہ درویش عموما" خخخ جیل حکام میں قیام پذیر ہوتے۔ یہ سلسلہ کوہ لبنان کا وہ حصہ ہے جو انطاکیہ کے قریب ہے۔ گوشہ نشینی کی تلاش والا سلسلہ ساٹھ برس پر محیط ہے۔ اس طویل جدوجہد کے بعد خلق خدا کے ذہنوں سے اپنا نام محو کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اہل نظر کے ہاں ان کی قدر و منزلت دگنی ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ سید علی

ہجویریؒ نے غزنی سے شام تک کا سفر طے کیا۔ دکانیں تو ہر شہر کے کوچہ و بازار میں کھلی تھی مگر جوہری کو کانچ کے ٹکڑے نہیں ہیروں کی تلاش تھی۔

سلسلئہ جنیدیہ کے بزرگان حضرت بابزید بسطامی اور ان کی اتباع کرنے والے مشائخ کے برعکس صحو (ہوش مندی) کو سکر (عالم مدہوشی) پر فوقیت دیتے تھے۔ بقول سید علی ہجویریؒ سکر بازیچئہ اطفال کے مانند ہوتا ہے اور صحو مردان حق کا میدان فنا۔ شیخ ختلیؒ صحو کے مرد میدان تھے جو ان کے وسیع ظرف کی دلیل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سید موصوفؒ نے اس سلسلے کو پسند فرمایا۔ سلسلہ جنیدیہ میں شمولیت کی ایک اور بھی وجہ سمجھ میں آتی ہے، یعنی یہ سلسلہ حضرت علی شیر خداؓ تک جا پہنچتا ہے جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

محمد بن حسن ختلیؒ مرید شیخ ابوالحسنؒ علی حصریؒ شیخ ابوبکر شبلیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ حضرت سری سقطیؒ، حضرت معروف کرخیؒ، حضرت داؤد طائیؒ، حضرت حبیب عجمیؒ، خواجہ حسن بصریؒ، اور علی المرتضیٰؓ۔

سید علی ہجویریؒ کی باطنی تربیت کا آغاز ہوا تو مرشد نے پہلا سبق دیا "عزیزم! رزق کا استعمال دو وجوہات کی بنا پر جائز ہے۔ سلسلئہ تار نفس بحال رکھنے اور یاد خدا کے لئے توانائی حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں۔ ہر فالتو لقمہ ہمارے مسلک میں حرام گردانا جاتا ہے۔ زیادہ سونے سے پرہیز لازم ہے کہ یہ غفلت کی نشانی ہے۔ غفلت بھی ہمارے مسلک میں کبیرہ گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔ گناہ و ثواب کا معیار عوام اور خواص کے لئے مختلف ہوتا ہے۔ ایک عام فرد بشر جب تک گناہ ارتکاب نہ کر لے اس کا نامئہ اعمال صاف رہتا ہے جب کہ نیک اعمال کی نیت کر لینے سے نامئہ اعمال صاف رہتا ہے جب کہ نیک اعمال کی نیت کر لینے سے نامئہ اعمال میں صفات کا اندراج شروع ہو جاتا ہے۔ خواص کے لئے یہ دستور نہیں۔ اس میدان میں مکروہات میں ملوث ہونا تو دور کی بات ہے' تسہل پسندی اور غفلت ہی سالک کو لے ڈوبتی ہے۔ تیسری شے گفتگو سے حتیٰ الامکان گریز۔ اس لئے کہ "لو کلام الفصہ السکوت الذہب" اگر کلام چاندی ہے تو خاموشی اختیار کر لی جائے۔"

یہ کہہ کر مرشد نے مرید باصفا کی جانب بغور دیکھا اور کہا "میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ تمہیں گفگتو کی اشد ضرورت پیش آئے گی۔"

۲۱ ، ۱۰، ۳ ، کا متن۔ مختصر الفاظ میں ، صرف ۔ تھا کہ کم کھانا' کم سونا ، گفتگو سے پرہیز ---

۔۔ جس تربیت کا آغاز اس انداز کا ہو اس کی انتہائی کیا ہوگی! اس کا اندازہ صرف اہل دل حضرات ہی لگا سکتے ہیں۔ راہ سلوک کی منازل طے ہونے لگیں۔ ایک روز جب آپ کنج تنہائی میں محو مراقبہ تھے تو خیالات منتشر ہونے لگے، یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ آپ کو اس سے پہلے کبھی اس دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ ابلیس لعین کا پوشیدہ وار تھا۔ اتنے میں ایک نورانی صورت بزرگ اس ویرانے میں آتے دکھائی دیے۔ یہ چونکہ خلاف معمول بات تھی لہٰذا آپ بڑے حیران ہوئے۔

"علی، حیران ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم کچھ لینے نہیں دینے آئے ہیں۔" بزرگ کے انداز تخاطب سے آپ اور بھی حیران ہوئے۔

"آپ کا تعارف ہو جاتا تو بندۂ ناچیز کی الجھن دور ہو جاتی۔" سید موصوفؒ نے بصد احترام کہا۔

یہ خضرؑ سے پہلی ملاقات تھی جو آخری ہرگز نہ رہی۔ خضرؑ نے رضائے الٰہی کے عین مطابق علوم باطنی تفویض کیے۔ سید موصوف رضائے الٰہی کے عین مطابق علوم باطنی تفویض کیے۔ سید موصوف کا انتشار ختم ہو گیا اور برسوں مہینوں کا سفر دنوں میں طے ہونے لگا۔ ملک شام ہی میں آپ کے ساتھ ایک بڑا خوش گوار واقعہ پیش آیا جو مراتب کی بلندی و کا پیش خیمہ تھا۔

آپ رئیس العاشقین بلالؓ کے روضۂ اطہر پر مصروف دعا تھے کہ اونگھنے لگے۔ اس طرح تربت کے سرہانے ہی سو گئے۔ عالم خواب کا منظر اتنا خوشگوار تھا کہ آپ کا انگ انگ کیف و انبساط میں ڈوب گیا۔ مکہ معظمہ کا ماحول تھا۔ سید موصوفؒ مطاف میں حاضر تھے کہ رحمت دو عالمؐ باب شبیہ کی جانب سے تشریف لائے۔ ایک عمر رسیدہ شخص ان کی بغل میں تھا۔ یہ انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی شفقت سے مجبور لاڈلے بچے کو بغل میں لیتا ہے۔ علی ہجویریؒ نے لپک کر پائے رسولؐ کو بوسہ دیا اور ساتھ ہی سوالیہ نگاہوں سے چہرۂ انوار کی جانب دیکھا۔ حضورؐ امتی کا مفہوم پا گئے اور فرمایا "یہ عمر رسیدہ شخص تمہارا امام یعنی امام ابو حنیفہؒ ہے۔"

خواب سے بیدار ہوئے تو مزار بلالؓ کا ماحول معطر پایا۔ اس خواب سے علی ہجویریؒ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مقام ابو حنیفہؒ کی عظمت کو دوام حاصل ہے اور یہ اوصاف شروع کے قائم

کرنے والے یعنی حضور پر نورؐ کے طفیل ہے۔ چنانچہ آپ حنفی مسلک پر نہ صرف قائم رہے بلکہ اس کے پر جوش مبلغ بھی تھے۔ آپ نے ایک نہایت لطیف نکتے کی بات کہی۔ امام ابو حنیفہؒ کو جب سید موصوفؒ "**باقی الصفت**" نہیں تھے ورنہ اپنے چلنے والی صفت کا مظاہرہ ضرور کرتے۔ "**باقی الصفت**" نہیں تھے ورنہ اپنے چلنے والی صفت کا مظاہرہ ضرور کرتے۔ "**باقی الصفت**"' اجتہادی امور میں **مخطی** ہو سکتا ہے یا **مصیب**۔ چونکہ انہیں **اٹھا** کر چلنے والے خود حضور پر نور تھے' لہٰذا امام موصوفؒ اپنی صفات سے فانی اور صفات رسولؐ کے حوالے سے باقی ہوئے۔ لہٰذا ان سے خطا کا صدور ممکن نہیں۔

ہر پل' ہر گھڑی عشق الٰہی میں غرق رہتے' اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے' کروٹ کروٹ اسے یادوں میں بسانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نو عمری ہی میں مقام ولایت پر فائز ہو گئے اور مرشد نے خلافت عطا فرما کر خدمت دین کا حکم دیا۔ اس طرح دور سیاحت کا آغاز ہوا۔ اس سیات کے دوران مختلف مشائخ سے ملاقات ہوئی اور روحانی تقویت نصیب ہوتی رہی۔ ایران' عراق' شام' ترکی' عرب' ماورالنہر' آذربائیجان' خراسان' طبرستان' **قہستان**' کرمان اور خورستان کے وسیع و عریض علاقوں میں گھومتے رہے۔ اس سفر کی تفصیل رقم کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں۔ دورہ لاہور سے پہلے پیش آنے والے دو ایک واقعات کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اہل دل حضرات سیم و زر کو پائے حقارت سے ٹھکراتے رہے ہیں۔ یہی رویہ سید علی ہجویریؒ کا تھا۔ قیام شام کے دوران میں کسی ضرورت مند نے دست سوال دراز کیا تو آپ نے اس کی حاجت خندہ پیشانی سے پوری کر دی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر پیشہ ور گداگروں کے کانوں میں اس کی بھنک پڑی تو وہ مکھیوں کی طرح آپ کے گرد بھنبھنانے لگے۔ جو کچھ آپ کی ملکیت میں تھا سب کچھ حاجت روائی میں صرف ہو گیا۔ جو کچھ آپ کی ملکیت میں تھا سب کچھ حاجت روائی میں صرف ہو گیا۔ سائل کو خالی ہاتھ لوٹانا آپ کے بس میں نہ تھا۔ معاملہ اس حد تک جا پہنچا کہ قرض لے لے کر سائلوں کو عطا کرتے رہے۔ یہ شیطانی ہتھکنڈا تھا جس سے ابلیس لعین خیالات میں انتشار پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے وسائل کو نظر انداز کر کے خرچ کیا جائے تو مسائل پیدا ہوتے ہیں اور مقروض انسان یکسوئی سے نہ عبادت کر سکتا ہے نہ کچھ سوچ سکتا ہے۔ قرض خواہوں کے تقاضوں سے طبیعت بڑی مکدر ہوئی مگر کشادہ دستی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ بعض اوقات ایک عام سا آدمی بھی بڑی خاص بات کر

جاتا ہے۔ اگر کوئی غیر معمولی بات، معمولی انسان کے منہ سے نکلے تو بات کی افادیت میں کمی واقع نہیں ہو جاتی۔ معمولی غوطہ خور سمندر کی تہ سے **قیمتی** موتی نکال لائے تو وہ بہرحال موتی ہی رہتا ہے اور یہاں تو معاملہ ولی وقت کا تھا۔ اولیاء کی پریشانیاں دور کرنے کے لئے خالق کائنات نے جو بشری وسیلہ بنا رکھا ہے اسے ”**صیرفی**“ کہتے ہیں۔ انائے دوست کے مدنظر ایک ”**صیرفی**“ نے آپ سے ملاقات کی۔

”محترم کیا پریشانی ہے؟“ اس شخص نے دریافت کیا۔

”سائلوں کی حاجت روائی کرتے کرتے مقروض ہو چکا ہوں۔ عبادت میں لذت نہیں رہی۔“ سیدؒ نے اظہار تفکر کیا۔

”خیر الامور **اوسطہا**۔ بہترین امور میانہ روی کے ہوتے ہیں۔“ اس ہمدرد نکتے کی بات بیان کی۔

”مگر مجھ سے کسی کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔“ سیدؒ نے دل کی بات کہہ دی۔

”اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ آپ کوشش کر کے میانہ روی اختیار فرمائیں۔“ اس ہمدرد کی بات آپ نے پلے باندھ لی۔ سوائے عشق الٰہی کے ہر معاملے میں عمر بھر میانہ روی اختیار کئے رکھی۔

غزنی میں ایک چرب زبان ہندو فلسفی سے ٹکراؤ کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب عمر عزیز صرف اکیس برس تھی یعنی 421ھ میں۔ عہد محمود غزنوی کے آخری ایام تھے۔ شنکر اچاریہ کی تعلیمات کے طفیل ہندو مت کا احیا ہو چکا تھا۔ ہندو برہمن سوائے اپنے کسی کی علمی فضیلت کا اعتراف کرنا مہاپاپ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی ملک تھا تو صرف ہند اور اگر کسی کے پاس علم تھا تو بس ہندو فلسفی۔ ان کے اذہان میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ ہندو برہمنوں کے علاوہ کوئی اور بھی دویا ساگر (علم کا سمندر) ہو سکتا ہے، اور اگر کوئی علمی موشگافی کر بیٹھتا ہے تو وہ بے ساختہ سوال کرنے کے عادی تھے کہ اتنی گہری بات آپ نے کس ہندو گرو سے سیکھی؟ یہ مناظرہ یا علمی مباحثہ سلطان محمود غزنوی کی موجودگی میں ہوا۔ محمود غزنوی چونکہ سترہ بار ہندو انا کو چور چور کر چکا تھا، لہٰذا ان کے فلسفی اور دانشور حملہ آور کے اس اقدام کو علمی میدان میں چیلنج کیا کرتے تھے۔ مسئلہ جہاد زیر بحث تھا۔

”جس دین میں قتل جزو ایمان ہو وہ دین انسانیت کی فلاح کا مدعی کیسے ہو سکتا ہے؟“ ہندو

فلسفی نے سوال کیا۔

”جس طرح تخریب کا مزدور تعمیر کا معمار ہوتا ہے۔“ سید علی ہجویریؒ نے مختصراً مگر مدلل جواب دیا۔

”آپ کے پاس ایک (بزعم خویش) اچھی چیز ہے وہ دوسروں پر زبردستی کیوں تھوپتے ہیں؟ بزور بازو تبلیغ دین دھرم کی خامیوں پر دلالت کرتی ہے۔“ بظاہرہ ہندو فلسفی کی بات صداقت پر مبنی دکھائی دیتی تھی۔

”ہم دین کے معاملے میں زبردستی کے ہرگز قائل نہیں۔ یہی ہمارے مرشد اولؐ کا فرمان ہے اور یہی خدائی حکم۔“

سیدؒ نے قرآنی آیت کی تشریح پیش کی تو ہندو فلسفی زیر لب مسکرانے لگا۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی جو پنچھی کو زیر دام آتے دیکھ کر صیاد کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگتی ہے۔

”طلوع اسلام کے وقت سے آپ کے تین مطالبے چلے آ رہے ہیں۔“ فلسفی نے وضاحت کی۔ ”اور یہ مطالبے ہر جنگ سے پیشتر آپ کے اسلاف دہرایا کرتے تھے۔ اول ہمارا دین قبول کرو۔ دوئم جزیہ ادا کرو۔ سوئم ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ زبردستی نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا اسی کا نام جہاد ہے؟“

فلسفی کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ حاضرین دنگ رہ گئے۔ محمود غزنوی نے بھی بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کا اپنا کردا ہدف بن رہا تھا اور بادی النظر میں بات سچ دکھائی دے رہی تھی مگر حضرت علی ہجویریؒ نے ایسا جواب دیا جو تا قیامت چرب زبانوں کا منہ بند کرنے کو کافی تھا، اور رہے گا۔

”ہر سچائی جو دل کی گہرائیوں میں بسیرا کر لے اظہار کا تقاضا کرتی ہے۔“ سیدؒ نے بڑے دھیمے لہجے میں آغاز کیا۔ ”انسان کی سب سے بڑی عدالت اس کے اپنے اندر کی عدالت ہوتی ہے۔ اگر انسان اپنی سچائی کا اظہار نہیں کرتا تو اندر کی عدالت اسے منافق قرار دے دیتی ہے یا تو وہ اس سچائی سے تائب ہو جائے یا پھر اسے دلائل سے منوائے۔“

”اور شمشیر آپ کے ہاں بڑی موثر دلیل ہے۔“ فلسفی نے مداخلت کی۔

”موثر نہیں، سب سے آخری۔ وہ اس لئے کہ پورے جسم میں ناسور پھیلنے سے پیکر ناک کا چھوٹا حصہ کاٹ دینا ہی مناسب ترین فیصلہ ہوا کرتا ہے۔ اگر حریف تلوار سونت کر

میدان میں اتر آتا ہے تو اسے دلائل سے قائل نہیں کیا جا سکتا' گھائل کرنے کے بعد سینے سے ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ " اب سید علی ہجویریؒ کا لہجہ بلند ہوتا جا رہا تھا "ایک نادان بچہ رنگی شعلوں کی طرف لپکے تو اسے روکنے کے لئے سختی بھی کی جا سکتی ہے۔ ہمارے اسلاف دعوت حق اس لئے دیا کرتے تھے کہ حریف کو سینے سے لگا سکیں اور تاریخ شاہد ہے کہ دعوت قبول کرنے والے کا' ایک پل میں دعوت دینے والے سے مضبوط ترین رشتہ استوار ہو جایا کرتا تھا' ایک رشتہ جو اپنی ذات پر دوسرے کو ترجیح دینے کا سبق دیتا تھا اور اس کا زبانی نہیں عملی اظہار چاہتا تھا۔ اگر کوئی گروہ یا شخص اس دعوت کو جو دلیل اول ہوا کرتی تھی' رد کر دیتا تو اس کو نفسیاتی سزا دی جاتی۔ حکومت کا حق اس سے چھین لیا جاتا کیونکہ حکومت کا حق صرف انسانوں کو ہے۔ جو شخص چمکنے والے سورج کا انکار کر دے وہ حیوانی سطح پر گر جاتا ہے۔ بہت سی بھیڑیں جب اندھے کنوئیں میں گرنے لگیں تو چند ایک کو لاٹھی سے مار کر بھگا دینا عین دانش مندی ہے۔ سارے ریوڑ کی فلاح کے پیش نظر چند کو ہلاک بھی کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

"جزیہ دیتے وقت انسان کو ہر پل نچلی سطح پر گرنے کا احساس ہوتا رہے گا اور یہی احساس اسے سوچنے پر مجبور کرے گا اور یہی سوچ اسے راہ راست پر لے آئے گی۔ اگر وہ عمر بھر گمراہی میں مگن رہنے کا فیصلہ کر لے تو بھی خسارے والا سودا نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ گمراہی اس فرد یا چند افراد تک محدود رہے گی۔ اقتدار پر ایک گمراہ شخص فائز ہو جاتا ہے تو اپنی گمراہی کو پھیلانے کی صلاحیت کا مالک بن جاتا۔ وہ مجسم برائی کے سرچشمے کے روپ دھار لیتا ہے۔ عقل کا یہی تقاضا ہے کہ اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔ کسی شخص کو برائی پھیلانے کا کوئی حق نویں خواہ وہ بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ۔ یعنی برائی کو اصالتا" پھیلائے یا وکالتا"۔ ایک شخص آپ کے سینے سے لگنے کے لئے تیار نہیں' برائی پھیلانے کا حق طلب کرتا ہے' آپ کے نزدیک اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے؟" علی ہجویریؒ نے یہ سوال کیا تو فلسفی تذبذب کا شکار ہوا۔

"آپ اس پل میری دعوت قبول کر لیں میں صدق دل سے آپ کر عمر بھر کے لئے سینے سے لگانے کو تیار ہوں۔" درویش حقؒ نے پیش رفت جاری رکھی "گلے ملنے سے مراد کو گزند پہنچانا ہمارے لئے حرام اور ایک دوسرے کی صدق دل سے معاونت ہم پر فرض ہو جائے گی۔

کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں؟" سید علی ہجویریؒ کے اس سوال پر فلسفی بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ہر مقام و مرتبے کا برہمن، مسلمان کو اچھوت سمجھتا تھا۔

"محترم! اسی غیر فطری رویے کو ہم انسانی سطح سے گرنے کا نام دیتے ہیں۔" درویش نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ہماری دعوت قبول کر کے ہمارے سینے سے لگے جائیں یا جزیہ ادا کر کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں۔ برائی پھیلانے کا حق طلب نہ کریں۔ ہمارے خلوص کا تو یہ بھی تقاضا ہے کہ اگر آپ خود کو گزند پہنچانے کی کوشش کریں تو ہم اس میں بھی مزاحمت پیش کریں کیونکہ ہم کو خبر ہے کہ آپ بے خبر ہیں۔"

واضح ہو کہ اس مباحثے کے وقت سید علی ہجویریؒ کی عمر صرف اکیس برس تھی۔ اکتیس برس کی عمر میں جب آپ لاہور تشریف لے آئے تو آپ نے پیغام محبت سے خلق خدا کی تسخیر کی۔ فلسفی نے جہاد پر نکتہ چینی کی تھی۔ لہٰذا جزو ایمان کا دفاع ضروری تھا۔ درویش اس حدیث سے بھی واقف تھا کہ جس دل میں جہاد کی تڑپ نہ ہو وہ ایمان سے خالی ہوتا ہے۔ اسی عقیدے کو تو غیر مسلم، سینئر مسلم سے خارج کر دینے کی سعی لاحاصل میں مبتلا رہے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ سچائی اور حقیقت مطلقہ کیا ہے؟ تخو اس کو فلسفیانہ موشگافیوں سے الجھایا ضرور جا سکتا ہے۔ کامل یقین کا تقاضا یہی ہے کہ جس حقیقت پر ایمان ہو اس کی تشہیر کی جائے اور یہی سید علی ہجویریؒ کا عمر بھر رویہ رہا۔ اگر کوئی شخص ایک حقیقت کو تسلیم بھی کرتا ہے اور اسے دوسروں تک نہیں پہنچاتا تا کہ دوسرے بھی اس سے استفادہ کر کے اپنی عاقبت سنوار لیں تو وہ نہ صرف منافق بلکہ انسانیت دشمن بھی ہے۔ جب اس ہندو فلسفی سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ اپنے آبائی مزاج پر اتر آیا۔

"اگر آپ سچے ہیں تو کوئی کرامت دکھائیں۔ کوئی مافوق الفطرت عمل پیش کریں" فلسفی نخیے کہا "یا میں آپ کو چمتکاری دکھاتا ہوں۔"

ہندو جوگی سنیاسی اس علم میں مہارت تامہ کے مالک تھے اور انہی شعبدوں کے طفیل خلق خدا کا ناطقہ بند کئے ہوئے تھے۔ سید موصوفؒ کے مسلک کے مطابق شعبدہ بازی شعائر ایمان میں جائز نہیں تھی۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" سید صاحبؒ نے سنجیدگی سے پوچھا "کیا میں آپ کو پرندوں کی طرح ہوا میں اڑا کر دکھاؤں؟ سیم و زر کے پہاڑ میں پیش کروں؟ آپ کی ہتھیلی پر چمکتا ہوا

سورج رکھ دوں؟" اب آپ کا لہجہ شمشیر براں جیسا تھا۔ "ایسی دلیل طلب فرما رہے ہیں جو کوئی دلیل ہی نہیں۔"

"ہمارے ہاں سچائی کا یہی معیار ہے۔" فلسفی نے زیرلب مسکرا کر کہا۔

"اگر آپ کو یہی پسند ہے تو بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں؟" درویش نے پر جلال انداز میں کہا۔ تماشائی مہر بہ لب کسی ان ہونی کے منتظر تھے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جو اس نوعمر مبلغ کی شکست کو صاف دیکھ رہے تھے جو بہت بڑا دعوی کر رہا تھا۔ ہر فیصل جاں میں دل دھڑک رہا تھا اور ہر چشم تماشا محو انتظار تھی۔

"میں آپ کی ہتھیلی پر "لدراس" دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی پل۔" ہندو چمتکار نے عجیب و غریب مطالبہ پیش کیا" "لدراس" نیپال میں پائے جانے والے منفرد نوعیت کے حامل شجر کا پھل ہوتا ہے جو نہایت قلیل مقدار میں شجر پر لگتا ہے۔ اس کا دانہ رنگین چمکتے موتی کی طرح ہوتا ہے۔ ہندو عقیدے کے مطابق جس کی ملکیت میں لدراس ہو اس پر دولت کی لکشمی دیوی کی خاص نظر کرم ہوتی ہے۔ یہ پھل صرف چند روز کے لئے مخصوص موسم میں لگتا ہے۔

"یہ نہایت واہیات مطالبہ ہے۔" محمود غزنوی مداخلت کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جو شمشیر کو دلیل مانتا اور گردانتا تھا ایک مبلغ کی متوقع شکست کیسے برداشت کر سکتا تھا!

"سلطان معظم' آپ مداخلت سے گریز کریں۔" منصف نے محمود غزنوی کو ٹوکا "نوجوان مبلغ دین چیلنج قبول کر چکا ہے اسے "لدراس" ہتھیلی پر دکھانا ہو گا ورنہ اس کی شکست کا اعلان کر دیا جائے گا۔" منصف نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

پھر وہ ہوا کہ خلق خدا دنگ رہ گئی۔ چشم فلک نے ایسا نظارہ کاہے کو دیکھا ہو گا! درویش نے دست حق پرست دراز کیا اور اس کی ہتھیلی پر "لدراس" چمک رہا تھا۔ اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ تماشائیوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ ہندو حریف کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

سید علی ہجویری الجلابیؒ نے سرزمین لاہور پر جس دور میں قدم رنجہ فرمایا شمالی ہند کے ان پر آشوب حالات کی تفصیل پیش کی جا چکی ہے۔ ملک ایاز شمالی ہند کے دل شہر لاہور کی از سرنو تعمیر کر چکا تھا اور دل کی بہتر کارکردگی جسم انسانی کی سلامتی کی دلیل ہوتی ہے اسی طرح لاہور کی

سلامتی اور امن و امان کو سارے خطے کا استحکام قرار دیا جا سکتا ہے۔ بد قسمتی سے 1040ء والا یہ سالا لاہور کی سیاسی بد بختی کا سال بھی تھا۔ اسی سال سلطان مسعود بن محمود غزنوی سلجوقی ترکوں سے شکست کھا کر عازم ہند ہوا۔ حسن ابدال کے قریب ماڑی گلہ میں اس کے جان نثار دستے بغاوت کی اور اسے پابند سلاسل ہو کر بصارت چھین لی تھی اب اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ محمود کے جانشین واقعی نا خلف ثابت ہوئے تھے۔ اس سیاسی انتشار کا اثر سرزمین پنجاب پر ہوا اور لاہور کو خطہ پنجاب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی شاید یہی وجہ تھی کہ سید علی ہجویریؒ کو لاہور آنا پڑا۔ بادشاہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا اور حسب توقع روٹی بوٹی کی تقسیم پر باہم دست و گریباں تھے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ خلق خدا کے دلوں کی تسخیر کی جائے۔ شمشیر سے علاقے فتح ہوتے ہیں اور کلام نرم و نازک' دلائل اور برہان سے قلوب کو مسخر کیا جاتا ہے۔

بر سبیل تذکرہ وادی کشمیر میں ویدا رانی کا انتقال ہو چکا تھا اور خاندان موہر کوٹ کا راجا سنگرام راج تخت پر متمکن تھا۔ یہ راجا داتا صاحبؒ کے ورود لاہور کے ایک برس بعد تک زندہ رہا۔ اسی راجا کے ہاں لاہور کا حاکم ترلوچن پال پناہ گزین ہوا تھا اور سنگرام راجا نے اپنے وزیر تونگ کو لشکر جرار دے کر محمود غزنوی کی سرکوبی کو بھیجا تھا مگر تونگ کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔

فیصل شہر لاہور کے باہر جہاں موجودہ مزار ہے سید علی ہجویریؒ نے قیام کیا۔ درویش کو خلق خدا سے تھوڑا دور ہٹ کر مناسب روحانی علاج کا اہتمام کرنا تھا۔ کامیاب ارتکاز کے لئے گوشۂ تنہائی شرط اول ہے۔ لاہور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے دین فطرت سے متعارف ہو چکا تھا۔ سلطان مسعود بن محمود کے دور تک کلمہ گو بھی یہاں آ چکے تھے۔ ان میں علماء قیل و قال بھی تھے' ہنر مند شعبدہ باز بھی۔ خیر و شر کی کشمکش ہر دور میں ہر جگہ موجود رہی ہے۔ اسی رطب و یابس کا نام زندگی ہے۔ قابل ذکر حضرات جن سے درویش خدا کی ملاقات ہوئی ان میں شیخ حسام الدینؒ سر فہرست ہیں۔ شیخ صاحبؒ کا شمار اہل دل حضرات میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ سفر آخرت کی تیاری فرما رہے تھے۔ جب سید موصوفؒ ان سے ملاقات کرنے پہنچے تو شیخ صاحبؒ پر نزع کا عالم طاری تھا۔ سید صاحبؒ کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔۔۔ آنکھیں جو ہمیشہ کیلئے بند ہونے والی تھیں۔

"میری جان! اتنا بوجھ کیسے اٹھاؤ گے؟" شیخ حسام الدینؒ نے متفکر لہجے میں کہا "گھٹا ٹوپ اندھیرا۔۔۔۔۔ صاحبانِ اقتدار، ہوس میں گرفتار۔۔۔۔ اب سارا بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے۔ میں تو کچھ بھی نہ کر سکا۔"

"ایسا نہ کہئے۔۔۔۔" درویش نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "آپ سے جو کچھ بن پڑا آپ نے کیا، اس ناچیز سے جو ہو سکا کر گزرے گا۔ ہمارا کام صرف حکم بجا لانا ہے۔ کامیابی تو رب العزت کے ہاتھ میں ہے۔"

"میرے لئے دعا کرو کہ میرا انجام بخیر ہو۔" پاک طینت بزرگ کو صرف انجام بخیر کی فکر تھی۔ سید علی ہجویریؒ نے دستِ دعا بلند کئے تو 78 سالہ شیخ حسامؒ کی روح نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

شہر سے باہر ویرانے میں علی ہجویریؒ چمکتاروں کے شہر میں حالات پر غور و فکر فرماتے رہے۔۔۔۔ خلقِ خدا کی توجہ حاصل کرنے کے لئے حسبِ روایت اور رسم و رواج، عمل پیرا ہونے کا فیصلہ ہوا۔ چند روز بعد ایک عمر رسیدہ خاتون جائے قیام کے قریب سے گزری۔ اس کے سر پر دودھ بھری گاگر تھی۔ آپ نے بڑے احترام سے اسے اپنے قریب بٹھایا اور گفتگو کا آغاز کیا۔

"محترم خاتون، یہ دودھ کہاں لے جا رہی ہو؟"

"رائے راجو کی نذر کرنے۔" بڑھیا نے جواب دیا "ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ اگر ہم اپنے مویشیوں کا دودھ راجو مہاراج کی نذر نہ کریں تو دودھیل جانوروں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے اور۔۔۔۔" بڑھیا کچھ کہتے کہتے مہر بہ ہو گئی۔

"کہئے خاتون، مسئلہ کیا ہے؟" درویش نے پوری توجہ سے مفلس خاتون کی الجھن دور کرنے کی کوشش کی۔

"اگر ہم دودھ کا نذرانہ پیش نہ کریں تو جانوروں کے تھنوں میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔"

"یہ سراسر ظلم ہے۔" درویش نے متفکر لہجے میں کہا۔ "ارے راجو کو دودھ کی ضرورت ہے؟ وہ تو سنا ہے شہر کا نائب حکمران ہے۔"

فیضِ عام (چوتھا حصہ)

"بس جی! بندے کی ہوس تو کبھی پوری نہیں ہوتی۔" بڑھیا نے دکھ بھری داستان بیان کرنے کے بعد کہا "ہم غریبوں کے منہ کا نوالہ چھن جاتا ہے مگر کیا کریں مہاراج، مجبوری ہے۔"

"دیکھو خاتون، آج یہ دودھ ہمیں دے جاؤ۔ تمہارے مویشی اگر پہلے سے دگنا دودھ نہ دیں تو کل ہم سے دگنے دودھ کی قیمت وصول کرلینا۔" درویش نے بڑھیا کی سمجھ کے عین مطابق بات کی۔ بڑھیا نے قدرے تذبذب کے بعد بات مان لی۔ دوسرے روز وہ بڑھیا نہ صرف اپنے سر پر دودھ بھری گاگر اٹھالائی بلکہ اس کے پیچھے گوالنوں، گوالوں کی لمبی قطار چلی آرہی تھی جو اپنے جانوروں کا دودھ دگنا کروانے کی تمنا لئے آستانہ درویش کی جانب امڈے چلے آرہے تھے۔ ولی وقت نے کسی آنے والے کو مایوس نہیں کیا۔ سب کا نذرانہ قبول کرلیا اور خلق خدا دامن میں خوشیاں سمیٹے واپس ہوئی۔ سید علی ہجویریؒ کی یہ قیام گاہ دریائے راوی کنارے تھی۔ (اس دور میں دریا کی گزرگاہ یہی ہوا کرتی تھی) یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ کوئی مہاجوگی، بڑی کرنی والا درویش، دریا کنارے ڈیرا لگائے بیٹھا ہے اور خلق خدا کو فیض یاب کررہا ہے۔ رائے راجو کو خبر ہوئی تو وہ آتش زیرپا ہوا اور بھناتا ہوا درویش کے ٹھکانے پر آیا۔ جب اس نے درویش کو ایک نظر دیکھا تو اس کی بصیرت نے سوچ سمجھ کر اقدام کا فیصلہ سنادیا۔

"مہاراج! آپ نے ہمارا دودھ کیوں بند کرادیا؟" اس نے نرمی سے کہا۔

"اچھے لوگ خلق خدا کو فیض پہنچاتے ہیں ان کے منہ سے نوالے نہیں چھینتے تم نے یہ کیا ستم کر رکھا ہے؟"

"آپ میں کوئی کمال ہے تو مجھے دکھائیں۔ میں باتوں سے مرعوب ہونے والا نہیں۔" راجو نے کرخت جواب دیا۔

"میں قائل بھی کرسکتا ہوں اور گھائل بھی مگر سرعام شعبدے بازی اس ناچیز کو پسند نہیں اپنا کوئی کمال تم پیش کرو تاکہ میں کوئی اندازلگاسکوں۔"

رائے راجو نائب شہر ہونے کے علاوہ باکمل جوگی بھی تھا۔ خرق عادت کمالات دکھانا اس

کا شعار تھا۔ اس نے پر تولنے والے انداز میں اپنے بازو بلند کئے اور پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگا۔

”چرند‘ پرند کی عادت اپنانے کا نام تمہارے ہاں کمال ہے‘ واہ میاں جوگی مہاراج!“ درویش نے انگشت شہادت سے اپنی نعلین کی طرف اشارہ کیا۔ جوتیاں ہوا میں پرواز کرنے لگیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی فقیر کی جوتیوں نے جوگی پر حملہ کر دیا اس کی جان پر بن آئی۔ چیختا چلاتا واپس درویش کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سر ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ ”مہاراج! شما کیجئے اور اس پاپ کی گٹھڑی کو سیدھا راستہ دکھایئے۔“

لاہور میں سید علی ہجویریؒ کی یہ پہلی کامیابی تھی۔ رائے راجو کوئی معمولی شخصیت نہ تھی۔ بڑی کرنی والا جوگی مہاراج تھا‘ وہ حلقہ بگوش اسلام ہوا تو اس کے چیلے اپنے گرو کی اتباع میں دین فطرت پر ایمان لے آئے۔ لاہور میں پہلے مسلمان کو خدا کے درویش نے شیخ ہندی کا لقب عطا فرمایا‘ اسی شیخ ہندی کی اولاد مزار داتا کی مجاور رہی۔ اس کے بعد مزید لوگ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔

مسلمانوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگے۔ نطق فقیر میں وہ تاثیر تھی کہ لوگوں کے دلگداز ہو جاتے اور گداز دلوں کو گرفتار محبت ہونے میں وقت ہی کتنا درکار ہوتا ہے؟ ایک یا دو پل! پتھر دل کو اسیر کرنا البتہ دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ آپ سے پہلے مسلمان حکمران کی وجہ سے لاہور میں چند ایک مساجد کا وجود ضرور تھا مگر ولی وقت کو درس و تدریس کے لئے ایک ایسی مسجد کی ضرورت پیش آئی جس کی بنیاد خالص تقویٰ پر استوار ہو لہٰذا درویش نے اپنے دست مبارک سے جائے قیام کے قریب ایک مسجد تعمیر کی۔ تکمیل تعمیر کے بعد ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس مسجد کا رخ قبلے سے ذرا جنوب کی جانب دکھائی دیتا تھا۔ قیل و قال کے ماہرین پنجے جھاڑ کر ولی وقت کے پیچھے پڑ گئے۔ ”اس مسجد کا رخ صحیح نہیں۔ یہ دین میں بدعت کبیرہ بلکہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے“ علماء نے فتویٰ صادر فرمادیا۔ ولی وقت کے دست حق پرست پر بیعت کرنے والے پریشان ہوئے تو آپ نے سب کو تسلی دی۔ آخر ایک روز چیدہ چیدہ حضرات کو مسجد میں نماز پڑھنے کی دعوت دی۔ امامت کے فرائض خود سرانجام دیئے اور نماز پڑھنے کے بعد مقتدیوں سے مخاطب ہوئے ”آپ حضرات میں سے بعض کو اعتراض ہے کہ اس مسجد کا قبلہ درست نہیں‘ آج اس بات کا فیصلہ بھی کئے دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر آپ نے دست مبارک

بلند کیا۔ مقتدی ورطہ حیرت میں ڈوب گئے۔ کعبتہ اللہ اور مسجد کے درمیان حائل سارے پردے اٹھ گئے۔ دیدار بیت اللہ ہر چشم بینا کے عین سامنے تھا۔ دیدار بیت اللہ کے اس انداز کی تشریح بعد میں سلطان العارفین حضرت باہوؒ نے اپنے انداز میں کی۔

"مرشد دیدار ہویا مینوں لکھ کروڑا حجاں ہو۔"

اعتراض کرنے والے شرمسار ہوئے اہل دل شکرگزار۔ گھر بیٹھے بیت اللہ کا دیدار جو ہو گیا تھا۔ شرمساری کا سبب یہ تھا کہ محراب مسجد اور بیت اللہ عین سیدھ میں تھے۔ سر مو فرق نہیں تھا۔

لاہور میں یہ مسجد پہلی اسلامی درس گاہ تھی۔ **تشنگان** حق جوق در جوق آتے اور اپنی پیاس بجھاتے۔ مسجد کے قریب ایک سادہ سا حجرہ تھا۔ اسی حجرے میں ولی وقت کا قیام تھا۔ شروع شروع میں آپ بچوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے پھر اچانک آپ نے یہ سلسلہ ترک کردیا۔ ایک عاشق زار نے اس کا سبب پوچھا تو بڑا مدلل جواب دیا "حکومت کی بو دماغ میں پیدا ہونے لگی تھی" یہ تھا خود احتسابی کا معیار۔ مقام "گنج بخش" پر فائز ہونا کوئی آسان بات تو نہیں۔ آفتاب مقام سوز پر فائز ہو کر روشنی فراہم کرتا ہے۔

سنت نبویؐ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آپ رشتہ ازدواج میں بھی منسلک ہوئے۔ پہلی شادی عنفوان شباب میں کی۔ شریک زندگی کا یہ ساتھ مختصر ثابت ہوا۔ شریک حیات چند سال بعد سفر آخرت اختیار کر گئی۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد تنہائی کا سفر گیارہ برس تک قائم رہا۔ دوسری شادی کے متعلق حضرت علی ہجویریؒ کے اپنے الفاظ پیش خدمت ہیں فرماتے ہیں:

"میں کہ علی بن عثمان جلابی ہوں۔ خداوند کریم نے مجھے گیارہ برس تک آفت اہل و عیال سے بچایا ہوا تھا مگر تقدیر نے مجھے ایک بار گرفتار بلا کردیا اور میں ارادے اور خواہش کے بغیر زیر دام آگیا۔ ہوا یوں کہ میں ایک بار بن دیکھے عشق مجازی میں گرفتار ہو گیا۔ یہ دور ابتلا ایک برس پر محیط ہے۔ قریب تھا کہ میرا دین و ایمان تباہ ہو جاتا کہ مجھ پر حق تعالیٰ کی خاص نگہ کرم ہو گئی اور ایک سال بعد میری خلاصی ہو گئی۔"

اس سے ایک بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ دوسری شادی ایک برس تک رہی۔ بہرحال یہ دونوں شادیاں ورود لاہور سے پہلے کے واقعات ہیں "وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" میں شک و شبے کی گنجائش نہیں مگر کائنات میں صرف یہی ایک رنگ

نہیں۔ صوفیا عشق مجازی کو دور ابتلا کا نام دیتے ہیں کیونکہ یہ منزل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رب العزت کے خاص کرم نے ولی وقت کو مجاز سے نجات دلا کر سپرد حقیقت کردیا۔

آپ کی کنیت ابوالحسن ہے لہٰذا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دوسری بیوی سے ایک لڑکا تولد ہوا ہوگا جس کا نام حسن رکھا گیا وہ ضرور صغر سنی میں فوت ہوگیا ہوگا۔ یہ معاملہ گردش ایام کی دھند میں لپٹا ہوا ہے اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ابوالحسن علی ہجویریؒ دو مرتبہ لاہور میں تشریف لائے۔ پہلی بار 431ھ میں یہ قیام 31 برس پر محیط ہے۔ اس کے بعد آپ کو خدمت مرشد میں حاضر ہونا پڑا کہ مرشد کا سفر آخرت قریب تھا اور سیدؒ کے علاوہ اور کون اپنے محسن و مربی کو الوداع کہنے کی جسارت کرسکتا تھا۔ مرشد کا قیام دم آخرت بیت الجن میں تھا۔ لاہور میں قلب درویش سپرد اضطراب ہوا۔ بے تابی دل حد سے بڑھی تو آپ نے شام کا سفر اختیار کیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر دمشق اور بانیار کے درمیان مرشد کی بستی بیت الجن واقع تھی۔ طالب و مطلوب برسوں بعد ملے۔ شیخ ختلیؒ نے جس پودے کی آبیاری کی تھی وہ اب نخل ثمربار بن چکا تھا۔ لاہوری سرگرمیوں سے شیخ بخوبی واقف تھے۔ آخری عمر میں اپنی محنت اکارت نہ جانے کی خوشی میسر تھی۔ جہاں دلی تعلق ہو، دوریاں فاصلے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

"عزیزم؟ کیسی گزری؟ شیخ ختلیؒ نے دریافت فرمایا۔ "بفضل خدا محنت رنگ لارہی ہے، شب تاریک قریب الاختتام ہے" علی ہجویریؒ نے بصد احترام جواب دیا۔

"جان جگر اعتقاد کے متعلق چند باتیں گوش گزار کرنی ہیں۔" مرشد کو دم رحلت بھی دین کی فکر تھی۔

"ارشاد فرمایئے بندہ ہمہ تن گوش ہے۔" "ہر نوع کے حالات میں نیکی بدی کا خالق قادر مطلق ہے۔" مرشد لب کشا ہوئے "لہٰذا بندے کو لازم ہے کہ ہر حال میں کبیدہ خاطر نہ ہو۔ اگر بندہ رنج و غم کو دل میں بسیرا کرنے کی اجازت دیتا ہے تو یہ قادر مطلق پر نکتہ چینی کے مترادف ہے۔ عزیزم! اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا اور اب میرے قریب بیٹھ جاؤ مجھے دم آخر تم سے دوری پسند نہیں۔"

حضرت علی ہجویریؒ نے مرشد کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ مرشد نے شاگرد رشید کے چہرہ پر انوار پر نگاہیں گاڑ دیں اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا۔ دم آخر اس اعتقادی مسئلے

کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ تقاضائے بشری کے پیش نظر مرشد کو دیکھتے ہی حضرت علی ہجویریؒ رنجیدہ خاطر ہوگئے تھے۔ محسن و مربی کی جدائی کا دل پر اثر ضرور ہوا تھا مگر مرشد کامل نے جاتے جاتے حق ادا کردیا۔ یہ واقعہ 453ھ کا ہے۔

مرشد کی تجہیز و تکفین کے بعد ولی وقت دوبارہ عازم لاہور ہوئے اور اپنے وظیفے کا عین اسی جگہ سے آغاز کردیا جہاں سے چھوڑ کر گئے تھے۔ کلام پر تاثیر وہ خدمت سرانجام دے رہا تھا جو تیر و تفنگ کے بس میں نہ تھی۔ دن کو تشنگان علم کی درس و تدریس اور رات کو طالبان حق کی تلقین و رہنمائی ہوتی۔ کاردگر کی جانب توجہ دینے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں منکرین سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوگئے' ہزارہا دیوانے عقل و ہوش کے دائرے میں آئے۔ ہزارہا ناقص مقام اکملیت پر فائز ہوئے اور کاملوں کو رہنمائی نصیب ہوئی۔

درویش کامل ہونے کے ساتھ ساتھ ہجویریؒ عالم باعمل بھی تھے۔ ایسا عالم جو علوم ظاہری و باطنی کا گہرا اور بے کراں سمندر ہو۔ باطنی علوم کے متعلق ساحل پر کھڑا شخص لب کشائی کی جرات کیسے کرسکتا ہے البتہ اس بحر ذخار میں غوطہ زن ہستیوں کے بقول' سید موصوفؒ کی گہرائی کی حد تھی نہ انتہا۔ معین الدین چشتی جیسے حضرات جس ہستی سے فیض حاصل کرنے کو باعث صد افتخار گردانیں' نظام الدین اولیا جس ہستی کی تصنیف کو مقام مرشد عطا فرمائیں' اس کے کمالات میں لب کشائی کی جرات کون کرے؟

الغرض ایک چشمہ فیض ابل رہا تھا اور خلق خدا مستفیض ہو رہی تھی۔ گفتار اور کردار ہجویریؒ ایک ایسا تند سیلاب تھا جس میں سارے مت' دین دھرم کے نظریات خشک تنکوں کی طرح بہہ گئے۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ ہند تو ہر نظریہ حیات اور تہذیب کے لئے کان نمک ثابت ہوا تھا۔ اس کا سادہ اور آسان جواب یہ ہے کہ سید موصوف نے جو نظریہ حیات پیش کیا وہ مقامی مخلوق کے دل میں اتر جانے والا تھا۔ تمام لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا۔ چند لوگوں کو ایک حد تک دام تزویر میں لانا ممکن ہے۔ سرزمین ہند تو ویسے بھی تشنہ لب تھی۔ برہمن مت کے گورکھ دھندے سے خلق خدا نے نجات حاصل کرنے کی بارہا کوشش کی مگر الہامی رہنمائی میسر نہ آنے کی بناء پر وہ از سرنو پرانے شکنجے میں جکڑی جاتی۔ حضرت علی ہجویریؒ کی پہلی خوبی تو یہ تھی کہ جو کچھ وہ کہتے اس پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے' گویا

وہ محض گفتار کے غازی نہ تھے بلکہ کردار کے غازی بھی تھے۔ اسوہ حسنہ کا انہوں نے عملی نمونہ پیش کیا تو اس روشنی نے خلق خدا کے سینے منور کردیئے۔ خلق خدا تو گویا اجالے کی تلاش میں تھی۔ کامیابی کی دوسری بڑی وجہ اس سچائی کی سادگی تھی جو دلوں میں اتر جانے والی تھی۔ سرفہرست تخلیق کائنات کا تصور تھا۔

ہندوؤں میں تخلیق کائنات کا جو تصور رائج تھا وہ اتنا الجھا ہوا اور ناقابل فہم قسم کا تھا کہ دلوں کی تسکین نہیں ہو پا رہی تھی۔ اول تو خالق کا تصور ہی عجیب و غریب تھا پھر مختلف مکاتب فکر کے گروہ ایک دوسرے کی تردید فرما رہے تھے مثلاً برہما نے کائنات ایک سنہرے انڈے سے پیدا کی۔ یہ انڈا کہاں سے آیا؟ ہندو روایت کے مطابق برہما نے پہلے بہت سا پانی پیدا کیا' اس میں ایک بیج بویا۔ وہ بیج انڈے کی شکل و صورت اختیار کرگیا تو برہما نے اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ انڈے کا نصف حصہ سنہرا تھا۔ جس سے آسمان معرض وجود میں آیا اور دوسرا حصہ روپہلا تھا جس سے زمین کی تخلیق ہوئی۔ لیکن اس نظریے کے برعکس ہندوؤں کی مہان پستک لنگ پر ان میں برہما اور وشنو کو باہم دست و گریباں دکھا کر دونوں کی تخلیقی قوتوں پر خط تنسیخ کھینچا ہوا تھا۔

شولنگ کو خلقت کا بانی قرار دیا تھا۔ آریاؤں کے دیوتا جو ویدک تعلیم کے مطابق کائنات کے کرتا دھرتا تھے' ایک دور میں پس پردہ چلے گئے۔ اندرا تک کو بھلا دیا گیا اور شیو شکتی کو کائنات کے کاروبار کا مالک و مختار بنا ڈالا گیا۔ ایک گروہ مظاہر قدرت کی پرستش کرتا تھا۔ آفتاب کے عاشق زار الگ تھے۔ سید علی ہجویریؒ نے خدا اور اس کی وحدانیت کو متعارف کرایا اور اپنے پیش رو بزرگان کی تائید کی تو بات خلق خدا کے دل کو لگی۔ ایک سجدہ اگر ہزاروں سجدوں سے نجات دلادے تو یہ سودا خسارے والا تو نہیں ہوتا۔ انسان جبلی طور پر خسارے والے سودے سے گریز کرتا ہے اور سودمند سودے کی طرف لپکتا ہے۔

خدا کی وحدانیت کے بعد تصور آخرت تھا۔ علی ہجویریؒ کے سامنے ایسا معاشرہ تھا جو تناسخ اور آواگون کے جال در جال میں جکڑا تڑپ رہا تھا۔ مکتی اور نجات کا ایک لامتناہی گورکھ دھندہ تھا۔ ہندومت نے بالخصوص لوگوں کی مت ماری ہوئی تھی۔ انسان کی آتما کبھی کتے کے جسم میں حلول کرتی کبھی گدھے کے۔ ہجویریؒ نے قرآن و سنت کے مطابق خیر و شر کی تشریح کی' جزا و سزا کا تصور پیش کیا۔ گناہ و ثواب کی وضاحت کی تو یہ سچائی بھی لوگوں کو من موہنی

سی لگ اور انہوں نے آواگون کے شکنجے کو ایک ہی جھٹکے سے توڑ ڈالا

رہی سہی کسر ہندومت کے نظام ذات پات نے پوری کردی۔ شودر ویش اور ملچھ وغیرہ کو برہمنوں کی خاک پا سمجھا جاتا تھا۔ نچلا طبقہ پیدائشی بدبخت اور سوختہ ساماں تھا۔ اس جھوٹ کو خلق خدا کب تک برداشت کرتی اسی محاذ پر تو بدھ اور جین مت کے وارے نیارے ہوئے تھے۔ سید علی ہجویریؒ نے اسلامی مساوات کا عملی درس دیا تو لوگ شیدائی ہوگئے۔ ساری زنجیریں توڑ کر انہوں نے دامن ہجویریؒ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ یہ امید کی ایسی ڈور تھی جسے وہ کسی طور ہاتھوں سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ معاشرے میں عدل و انصاف کی داستان سنائی گئی۔ اسوۂ حسنہ کے روشن پہلو خلق خدا کے سامنے رکھے گئے تو نچلے طبقے کے سارے زخم تازہ ہوگئے۔ ان کو وہ ناانصافیاں سپرد اضطراب کرنے لگیں جو برہمن مت نے ان سے روا رکھی تھیں۔ یہ عدل و انصاف کو کند چھری سے ذبح کرنا مہینوں برسوں کی بات نہ تھی، صدیوں پر محیط داستان خونچکاں تھی۔ اسلامی مساوات کے تذکرے نے گویا رستے ناسوروں پر مرہم رکھ دیا۔

طہارت اور پاکیزگی کا تصور ہندومت میں مکروہ اور گھناؤنی قسم کا تھا۔ گائے کا بول و براز پوتر (پاک) تصور ہوتا تھا۔ جوگیوں سنیاسیوں کے بعض سمپردائے (فرقے) جسم پر گندگی ملنا جائز قرار دیتے تھے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کے مطابق طہارت کا جو تصور سید موصوف نے پیش کیا وہ پسندیدہ اور فطرت انسانی کے عین مطابق تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا بڑا خوشگوار اثر ہوا۔ جوگ، سنیاس میں غیرفطری رسوم اس قدر تھیں کہ انسانی ذہن عاجز آچکا تھا۔ مکتی اور نجات کے لئے اتنے تکلیف دہ طریقے رائج تھے کہ خلق خدا ان سے کتراتی تھی۔ دنیا کو تیاگ کر پہاڑوں کی گپھاؤں میں رار فرار اختیار کرنا عام سی بات تھی۔ علی ہجویریؒ نے دنیا کے رطب و یابس کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے نجات کے راستوں کی نشاندہی کی۔ فصیل جاں کو کانٹوں کی سیج کے سپرد کرنا فضول اور لغو قرار دیا جو معاشرے کے ہر فرد و بشر کو پسند آیا۔

ہر معاشرے میں چند افراد گداز دل کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے بکھیڑوں میں الجھنا پسند نہیں کرتے اور خالق کی خوشنودی کو ہر شے پر فوقیت دیتے ہیں۔ یعنی اپنے ظاہر کو سنوارنے سے زیادہ باطن کو زیادہ قابل توجہ گردانتے ہیں۔ یہ عشاق کا گروہ ہر مذہب و ملت

میں پایا جاتا ہے۔ ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کی صفائی کا تصور اسلام میں بھی موجود ہے۔ باطن کا سمندر تو ویسے بھی گہرا اور وسیع و عریض ہوتا ہے۔ اس کی غواصی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اہل ہنود میں یہ تصور غیر فطری قوانین کا مجموعہ تھا۔ ویسے تو مکمل ہندو مت ہی رسومات کے مجموعے کا نام تھا مگر دھرم کا یہ محاذ ہجویریؒ فکر نے ہدف خاص قرار دیا۔ سید نے ایسے دلگداز حضرات کے لئے ایک ایسی کتاب تصنیف کی جو راہ سلوک کے مسافروں کے لئے تاقیامت مینار نور کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تصوف کے اسرار و رموز دل کش پیرائے میں کھول کر بیان فرمادیئے۔ اس کے علاوہ غیر اسلامی تصوف و نظریات جو امت مسلمہ کے عقائد میں در آئے تھے' ان کی نشاندہی بھی کردی تاکہ کوئی راہ سلوک کا مسافر بے خبری میں مارا نہ جائے۔ یہ دینی خدمت عظمیٰ صدقہ جاریہ کا مقام رکھتی ہے اور تاقیامت آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ یہ عوام الناس کے لئے بھی اتنی ہی مفید ہے جتنی خواص کے لئے کیونکہ یہ اسلام کے پیغام محبت اور سلامتی کے پرچار کا دلنواز مرقع ہے۔ اس تصنیف کا نام انہوں نے کشف **المحجوب** رکھا یعنی اسرار رموز کو کھول کر بیان کرنے والی کتاب مگر اس کتاب پر تبصرے سے پیشتر ان کی دیگر تصانیف کا مختصر سا تعارف بے حد ضروری ہے۔

”منہاج الدین“ اس کتاب میں مناقب اہل صفہ مرقوم ہیں۔ وہ حضرات جنہوں نے حضور اکرمؐ کی حیات طیبہ میں علم دین کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ ان حضرات کی پہلی درسگاہ مسجد نبویؐ کے اندر موجود تھی اور یہی پہلی اسلامی یونیورسٹی تھی۔

”کتاب الفنا و البقا“ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں حقیقت فنا اور بقا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بقا کے لوازمات کی نشاندہی' اس کے درجات وغیرہ پر مدلل بحث' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان دو کتب کے علاوہ ”اسرار والخرق والمئونات“ پھر تصوف کی ایک حیران کن تصنیف ”کتاب البیان لاہل البعصیان یعنی چشم بینا رکھنے والوں کے لئے مکمل وضاحت

”بحر القلوب“ اور ”الرعایہ بحقوق اللہ“ یہ دونوں کتب علم کا سمندر رہیں۔ ولی وقت کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا مگر ان کا دیوان زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

کشف المحجوب کی پذیرائی ہر مکتبہ فکر میں ہوئی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اسے مرشد کامل کا درجہ دیا۔ شرف الدین یحییٰ منیری، جہانگیر اشرف سمنانی دارالشکوہ قادری جیسے اہل قلم و دانش اس کتاب کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا سبب سید علی ہجویریؒ کے دست راست ابو سعید ہجویری تھے جو تصوف کے اسرار و رموز سے آشنائی کے تمنائی تھے۔ برصغیر میں اسلامی تصوف کی پہلی اور مکمل کتاب اسے ہی گردانا جاتا ہے۔ اثبات علم سے لے کر آداب سماع تک اس میں کل 39 ابواب ہیں جن سے مکمل واقفیت آج وقت کی اشد ضرورت ہے۔ فارسی زبان میں اس موضوع کو جس انداز میں ولی وقت نے بیان کیا وہ اپنا جواب آپ ہے۔

پہلے باب کا آغاز علم کی ماہیت سے ہوا ہے۔ علم جو حیوان ناطق کو مقام آدمیت پر فائز کرتا ہے۔ علم جس کی بناء پر اس مشت غبار کو مسجود ملائک کا مقام عطا ہوا۔ راہ سلوک میں یہی علم سالک کے مقامات میں بلندی کی ضمانت بنتا ہے۔ جس ضابطہ حیات میں علم کا حصول فرض قرار دیا گیا اسی پر یقین کے مدعی اس میدان میں پیچھے رہ گئے یہی لمحہ فکریہ ہے۔ علم کا سرچشمہ خالق کائنات ہے اور علم کی افادیت اس پر عمل کرنے سے مشروط ہے۔ خالق اور مخلوق کے علم میں وہی فرق ہے جو بحر زخار و بے کراں اور قطرہ آب میں ہو سکتا ہے۔ علم اگر نافع نہیں تو وہ خام ہے۔ کسی نہ کسی مقام پر خرابی ضرور ہے۔ عالم میں یا علم میں۔ اصولی علم ظاہر و باطن کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی وسیلے سے ہر فرد بشر پر لازم ہے کہ وہ اپنے ظاہر کو سنوارے اور باطن کی گہرائی میں غوطہ زنی کرے۔ ظاہر بغیر باطن کے منافقت اور باطن بغیر ظاہر کے زندقہ ہے۔ شرعی قوانین کا اتباع بندے کا ظاہر اور اپنے اندر کی جان کاری، علم حقیقت کے زمرے میں آتی ہے۔ علم حقیقت اصل میں ذات و صفات باری تعالیٰ سے آشنائی کا نام ہے۔ ظاہری اور باطنی علم سید علی ہجویریؒ کے نزدیک لازم و ملزوم ہیں اور حیات قلب کے لئے دونوں یکساں اہمیت کے حامل۔ علم حقیقت کے فقدان سے انسانی قلب جہالت کی بناء پر مردہ ہوتا ہے اور علم شریعت نہ ہو تو بوجہ نادانی، انسان کا دل عارضے میں مبتلا ہو جائے گا۔

دوسرے باب میں غناد فقر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ فقر سے مراد فقیری یا پیشہ ور گدائی ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک لعنت ہے جس میں آج ہماری قوم مبتلا ہے۔ فقر، ہونے نہ ہونے سے بے نیازی کا نام ہے۔ یعنی سیم و زر کی کثرت وجہ انبساط نہ ہو اور تنگ دستی و تہی

دامانی وجہ غم نہ ہو۔ فقر میں تنگدستی کو اس لئے فوقیت حاصل ہے کہ اس کیفیت میں اسرار کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے۔ مال و متاع سے بے نیازی الطاف خفی کا سبب بنتی ہے۔ ایک فقیر کا کمال یہ ہے کہ اس کے ترازو میں پوری کائنات، مچھر کے پر برابر وقعت اختیار کر جائے یعنی اس کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ تصوف میں فقر کا یہی مفہوم ہے۔ جہاں تک غنا کا تعلق ہے تو اس صفت کی سزاوار ذات باری تعالیٰ ہے۔ فقر کو ذات باری تعالیٰ سے منسوب کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں بے نیازی کے ساتھ کمی کا وجود بہرحال موجود ہوتا ہے اور صفات خداوندی میں کمی محال ہے۔ بندہ اور صاحب بندہ میں صفات کو برابر ثابت کرنا کج فہمی کی دلیل ہے کیونکہ بندے کی ہر صفت جس کا امکان ذات بندہ میں ہو، وہ بہرحال مانگے کی تصور ہوگی۔ صفات خداوندی قدیم اور صفات بندہ حادث اور فانی ہونے کی بناء پر دونوں کو ایک نظر سے دیکھنا مسلک ہجویریہ میں جائز نہیں۔ اسی مسلک پر کیا موقوف یہ ایک ازلی وابدی حقیقت ہے جس کا انکار جہالت ہے اور جہالت علم کی ضد ہے۔ غنائے بندہ کا کوئی سبب ہوتا ہے جبکہ غنائے مطلقہ سبب سے بے نیاز ہے۔ وجود بشر اور حاجت لازم و ملزوم ہیں لہٰذا محتاج غنی نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سید علی ہجویریؒ صفت غنا کو خدا کی ذات سے مختص کرتے ہیں۔ البتہ جسے خدا چاہے اس کا غنی ہونا محال نہیں رہتا۔ بندہ مقام غنا پر فائز ہو جائے تو غفلت اس کے لئے آفت بن جاتی ہے۔ جیسے فقر میں حرص۔ بندے کے لئے فقر، غنا سے بہتر ہے کیونکہ اس میں ماسوا کے دھیان کا احتمال نہیں رہتا۔

تیسری فصل باب دوم میں فقر و فقیر سے متعلق اقوال مشائخ اور ان کی تشریح مرقوم ہے۔ تیسرے باب میں صوفی کی اصلیت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ لفظ صوفی کی تشریح مشائخ نے مختلف انداز میں کی ہے مثلاً ایک گروہ کا خیال ہے کہ صوف یعنی اونی لباس زیب تن کرنے والا صوفی ہے۔ دوسرا کہتا ہے صف اول میں رہنے والا صوفی ہے۔ تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ صوفی کا تعلق اصحاب صفہ سے ہے اور چوتھے مکتبہ فکر کے حضرات لفظ صوفی کو اسم صفا سے مشتق گردانتے ہیں۔ مگر سید موصوفؒ نے تمام تشریحات پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ ان کے ہاں ماسوا کے خیال اور کدورت سے پاک و صاف دل والا صوفی ہوتا ہے کیونکہ تصوف باب تفعل سے ہے جس کا خاصہ تکلیف اٹھانا ہے اور صوفی اپنے نفس پر تکلیف اٹھاتا ہے۔ صوفی اپنی ذات کو فنائی الذات کر کے بقا حاصل کرتا ہے اور اس مقام کو مجاہدے سے تلاش کرنے والا

متصوف ہو گا لیکن کم ترین مقام کا حامل یعنی **مستصوف** وہ ہے جو سیم و زر کے لئے ڈھونگ رچاتا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ اپنے خیالات کو مشائخ کے اقوال سے سچ ثابت کرتے ہیں اور جنید بغدادیؒ کے رویے کی تائید فرماتے ہیں۔ اس میں تصوف کی بنیاد آٹھ فضائل پر استوار ہوتی ہے۔ سیدنا ابراہیم کی سخاوت، اسماعیلؑ کی رضا، صبر ایوبی اشارات حضرت زکریاؑ کے غربت حضرت یحییٰؑ کی مسیحائی حضرت عیسیٰؑ کی موسویؑ پیرہن اور فقر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

تصوف محض علوم و رسوم کا نام نہیں یہ ایک اخلاقی رویہ ہے۔ اخلاق جو انسان کا خلق خدا سے رویہ ہوتا ہے، اخلاق جو عبادات کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔

چوتھے باب میں سید موصوفؒ نے لباس صوفی پر بحث کی ہے۔ تصوف کی جملہ شرائط کو پورا کئے بغیر گدڑی پہننے کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے فرماتے ہیں ""پہلی شرط تو یہ ہے کہ کوئی فرد بشر یہ لباس از خود پہننے کا مجاز نہیں۔ برس ہا برس کی تربیت کے بعد بندے کا رہنما (مرشد، استاد، شیخ) یہ فریضہ سرانجام دیتا ہے اور اس تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ گدڑی پہننے والا خلق خدا کو اپنی ذات سے افضل تسلیم کرے اور اس کا عملی ثبوت کرے ورنہ "رہا صوفی گئی روشن ضمیری" والی بات صادق آئے گی۔ علی ہجویری کے نزدیک گدڑی زیب تن کرنا کفن پہنے کے برابر ہے۔ اس کے بعد زندگی کی لذتوں سے کنارہ کشی لازمی امر بن جاتا ہے۔

امت مسلمہ کو جتنا گزند تصوف کے بہروپ نے پہنچایا اسے احاطہ تحریر میں لانا دشوار ہے۔ عقیدت و احترام کے محاذ پر غیروں نے ہر دور میں کامیاب شب خون مارے حالانکہ مومن وہ ہے جو نہ دھوکہ دیتا ہے، نہ دام تزویر میں آتا ہے۔ (لایخدا ولا یخداؤ)

چھٹا باب ملامت کی دلنواز تشریح پر مشتمل ہے۔ ایسی وضاحت جو بربط دل کے تار ہلا دیتی ہے اور اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا چلا جاتا ہے۔ بندے کو خلق خدا کا طوق رسوائی پہنانا اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو تقویت پہنچانے کے مترادف ہے لہٰذا ملامت" قابل نفرت نہیں۔ مجاز تک میں لوگ رسوائی کو پسند فرماتے ہیں۔ عشق حقیقی میں تو اس کا مقام، اوج ثریا ہونا چاہیے۔ بندے کے تعلقات صاحب بندہ سے خوشگوار ہوں لیکن اس کے باوجود خلق خدا اسے رسوا کرے تو تصوف کی زبان میں اسے ملامت کہتے ہیں۔ صوفیا اسے ناپسند نہیں فرماتے جیسے شیخ ابو طاہر حرمی کو کسی نے سر بازار کہا "اے پیر زندیق کہاں! کا ارادہ ہے۔" ان کا ایک

غم گسار لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا۔ شیخ نے اسے منع فرمایا اور گھر پہنچ کر اسے خلق خدا کے بے شمار خطوط دکھائے جس میں موصوف کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ شیخ الاسلام، شیخ الحرمین، شیخ زہاد وغیرہ وغیرہ

"عزیزم! یہ میرے نام نہیں ہیں۔" شیخ نے بڑی رسان سے مرید باوفا کو سمجھایا "اپنے ظرف و شرف کے مطابق لوگ مجھے القابات سے نوازتے ہیں۔ اس میں کبیدہ خاطر ہونے والی کون سی بات ہے؟"

ملامت میں صرف ایک بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ خلق خدا غلط فہمی کا شکار نہ رہے۔ اگر ملامت کرنے والے کے الفاظ حقیقت پر مبنی ہوں تو جس پر ملامت کی جارہی ہو وہ دگنے عذاب کا مستحق ہو گا یہی مسلک ہجویری ہے۔ مخلوق کی ملامت کو روا رکھتے ہوئے خالق کی غلامی میں امکان سے بڑھ کر ڈوب جانا صوفیا کے ہاں جوہر ملامت ہے۔ ابویزیدؒ ایک بار سفر حجاز سے لوٹے تو خلق خدا ان کے استقبال کو اُمڈ پڑی۔ پل بھر کے لئے ابویزید یاد خدا سے غافل ہو گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا اور آپ روزے سے تھے مگر آپ نے سرعام روزہ توڑ ڈالا۔ استقبال کو آنے والے ملامت کرنے لگے، ابویزید نے بعد میں کفارہ ادا کیا مگر نمود و نمائش پر ضرب کاری لگائی اور نفس کی سرکشی کو نیست و نابود کر ڈالا۔ گویا ملامتی طرز استدلال ریا کی ضد ہے۔ آج بھی اگر ہم ہجویری طرز فکر کو اپنالیں تو سب کچھ سنور سکتا ہے۔ وہ ملامت کو عشاق کے لئے سرسبز شاداب نخلستان، احباب کے لئے سامان تفریح، مشتاقان دید کے لئے راحت اور مریدوں کے لئے سرور کا درجہ دیتے ہیں۔

ایک بار سید علی ہجویریؒ نے مسلسل تین ماہ تک مزار ابویزیدؒ پر قیام فرمایا۔ طہارت کا خاص خیال رکھنے کے باوجود سرور کی لذت سے محروم رہے۔ آخر خراسان کا سفر اختیار کیا۔ دوران سفر ایک نام نہاد صوفیا کی جماعت سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے ولی وقت کو نگہ حقارت سے دیکھا۔ تمسخر اڑانے سے بھی گریز نہ کیا۔ طنز کے تیر برساتے رہے۔ ایک من چلے نے تو پھل کھا کر چھلکے آپ کی طرف اچھال دیئے۔ یہ آتش زیرپا ہو جانے والی بات تھی مگر سید علی ہجویریؒ اس تحقیر سے لطف اندوز ہوتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ مطلوبہ کیفیت کا حصول اسی جگہ اسی پل ہو گیا۔ بغور دیکھا جائے تو بزرگان حق پرست جہلا کی ہم جلیسی اسی بناء پر گوارا فرماتے تھے۔ یہ واقعی بڑی گہری بات ہے۔ مسلک ہجویری میں ذرا سی بات پر بھڑک

اٹھنا ناپسندیدہ فعل ہے۔

"**کشف المحجوب**" میں مسلسل سات ابواب صوفیا کے فرقوں' ان کے عقائد پر مشتمل ہیں۔ ہر فرقے پر ناقدانہ اور محققانہ بحث دلنشیں انداز بیان میں کی گئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ولی وقت کے پیش نظر آج کا دور خرابی تھا۔ رضا اور مقامات کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ بندے کی رضا اور رضائے ربی میں امتیاز سالک کے لئے ضروری ہے۔ رضائے ربی مجسم عطا ہے اور رضائے بشر' سر تسلیم خم کرنا اور اس انداز سے خم کرنا کہ جلال و جمال میں تمیز نہ رہے یعنی جلال سے اسی طرح لطف اندوز ہوا جائے جیسے جمال سے کیف و انبساط کا حصول ہوتا ہے۔ سجدے کا کمال یہ ہے کہ پیکر خاک کے ساتھ دل بھی سجدہ کرے اور اس میں روح کا میلان بھی شامل رہے۔ عطائے ربی پر راضی ہونا (خیر و شر کی صورت میں) مقام معرفت ہے۔ صرف خیر پر خوش ہونا اہل دنیا کا شیوہ ہے۔ مقامات کے لالچ سے بے نیاز ہو کر اس کی محبت کا دم بھرنا حقیقت عشق ہے۔

سکر اور صحو تصوف کی دو معروف اصطلاحیں ہیں گروہ **طیفوریہ** جس کے بانی **بایزید بسطامی** تھے سکر کے پر جوش **مبلغ** تھے۔ علی ہجویریؒ صحو کو سکر پر فوقیت دیتے تھے۔ ایک سالک جب جمال یار کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے ہوش و خرد مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اس بے خودی میں عقل سے بیگانگی بھی متوقع ہوتی جسے دیوانگی کہتے ہیں اور راہ سلوک کا مسافر پکار اٹھتا ہے۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

محبت کے اس غلبے کا نام سکر ہے اور یہ محویت' کیفیت فنا تک لے جاتی ہے۔ صحو اس سے بلند تر مقام کا نام ہے۔ یعنی جمال محبوب کے مشاہد کے بعد حیرت و وحشت کا باقی نہ رہتا۔ کوہ طور پر سیدنا موسیٰ کلیم اللہ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اور جس انداز میں ہوش و خرد شکار ہوئے وہ سکر کی بہترین مثال ہے۔ اس کے برعکس حضور اکرمؐ قربت کی انتہا تک پہنچنے کے باوجود' قابہ قوسین او ادنیٰ (دو قوسوں کا فاصلہ یا اس سے بھی کم) ہوش و حواس میں رہے تو یہ صحو کی مثال ہے۔ صحو میں غفلت سے اجتناب شرط اولیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علی ہجویریؒ نے اسے میدان مرداں کہا بہرحال اصل دونوں کی ایک ہے۔ لیکن اگر ان دونوں کیفیات میں تصنع کی

رمق شامل ہو جائے تو نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ دور حاضر کے نام نہاد صوفیاء کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

حضرت سہل بن تستری کے پیرو سہلیہ کہلاتے ہیں۔ موصوف کی تعلیم کے مطابق حصول مراد مجاہدہ نفس اور ریاضت کا مرہون منت ہے۔ جسے یہ حضرات اجتہاد' مجاہدہ اور ریاضت کا نام دیتے ہیں۔ اس سارے عمل کی غرض و غایت نفس کی مخالفت کرنا ہے۔ ہجویر وضاحت کے مطابق نفس کی مخالفت محبت کا سرچشمہ ہے اور محبت کی انتہا عبادت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ گویا اصل عبادت ہی نفس کی مخالفت ہے۔ نفس کی پہچان سالک کے لئے بے حد ضروری ہے وہ اس لئے کہ اپنے ظرف و شرف کا اندازہ ہو سکے کیونکہ جس سے محبت کا دعویٰ کیا جا رہا ہے وہ جبار و قہار ہونے کے ساتھ ساتھ بے نیاز بھی ہے۔ گویا مختلف صفات کا دلنواز مرقع' اپنے آپ کی پہچان نہ ہونے کا یہ مطلب ہو گا کہ ہدف تک رسائی دشوار ہو جائے گی۔ اسے کہتے ہیں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ ظاہری بات ہے کہ سالک کو جب اپنی ذات کا عرفان ہو جائے گا تو وہ اپنی خامیوں کا تدارک ضرور کرے گا۔ یہ اہتمام اس کی کامیابی کا ضامن ہو گا۔ اسے کہتے ہیں من عرف نفسہ فقد عرف ربہ اور یہی مطلوب و مقصود ہے۔ بقول علی ہجویریؒ عبداللہ تستری نے اس میں غلو فرمایا کیونکہ تستری مجاہدے کو مشاہدے کی علت قرار دیتے ہیں گویا یہ بھی ایک اکتسابی فعل ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ تو عشق مجاز میں بھی سوفیصد درست نہیں۔ مجاہدے کے ساتھ رضائے محبوب کا ہونا شرط ہے یعنی "عنایت ایزدی" بقول علی ہجویریؒ مجاہدہ وصال حق کی علت نہیں ہو سکتا اسے وصل حق کا ذریعہ سمجھنا چاہئے۔ نفس' خواہشات کا سرچشمہ ہے اور خواہشات کی پیروی کفر و گمراہی تک لے جاتی ہے' یہی وجہ ہے کہ جنید بغدادی ترک خواہشات کو وصال یار کا درجہ دیتے ہیں اور ہجویریؒ کے نزدیک یہ عبادت عظمیٰ ہے ہوائے۔ انسانی کی ازل سے دو ہی اقسام رہی ہیں۔ پہلی لذت اور شہوت دوسری جاہ طلبی۔ یہ معاشرے میں فساد کی جڑ اور گمراہی کا سبب تھا ہے اور رہے گا۔

لذت اور شہوات کی پیروی سے خلق خدا بحیثیت مجموعی محفوظ رہتی ہے۔ مگر جاہ طلبی بین الاقوامی فتنے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ بصیرت ہجویریہ کا یہ اندازہ ہر زمانے پر صادق آتا ہے۔

فرقہ حکیمیہ کے بانی عبداللہ بن علی الحکیم ترمذی تھے۔ ان کے ہاں ولی اللہ ہر دور میں معاشرے کا معتبر ترین بندہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس پر نگہ کرم ہوتی ہے۔ ولایت کا خلاصہ فکر ہجویریہ میں یہ ہے کہ اولیا میں خالق کی دوستی کے سبب ماسوائے بے نیازی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ غم واندوہ سے دور رہتے ہیں اور خوف ان کے قرب نہیں آسکتا۔ قریب قیامت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ کرہ ارض ایسے بندوں سے خالی ہوجائے گا۔ بے خوف لوگوں کے عدم وجود سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہوجانا سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ فرقہ معتزلہ کا مشہور نظریہ یہ تھا کہ خالق اپنے بندوں سے بلا امتیاز یکساں محبت کرتا ہے لہٰذا ولی برگزیدہ نہیں ہوتا۔ اس کا مدلل جواب علی ہجویریؒ نے دیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی تخلیق سے مساوی محبت اگر تسلیم کرلی جائے تو جنت دوزخ کا جواز ختم ہوجاتا ہے۔ جزاؤ' انعام واکرام ہر نظام کو بروئے کار لانے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ رسالت اس کی بہترین مثال ہے۔ فرقہ حشویہ کے مطابق برگزیدگی کا دور ختم ہوچکا ہے مگر علی ہجویریؒ نے دوٹوک الفاظ میں اس کی تردید کی اور خواص کی درجہ بندی بھی کردی۔ یعنی اخبار' ابدال' اوتار اتقیاء اور قطب یا غوث۔

امت مسلمہ میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ولی کو عاقبت کے خوف سے بھی مستثنیٰ قرار دیتا ہے اور اولیا کے لئے غرور کو جائز مانتا اور گردانتا ہے۔ سید علی ہجویریؒ نے دلائل سے اس کی تردید کی مگر اولیا سے کرامت کے ظہور پر مفصل روشنی ڈالی جس میں ثابت کیا کہ افضل ترین ذات انبیا کی ہوتی ہے' دوسرے درجے پر اولیاء فائز ہوتے ہیں اور اولیاء کا مقام فرشتوں سے بلند تر ہوتا ہے۔ کشف المحجوب' فنا اور بقا پر بھی مدلل بحث کرتی ہے۔ امت مسلمہ میں یہ نظریہ بھی موجود ہے کہ فنا سے مراد اپنی ذات کا مٹا دینا اور بقا کا خلاصہ یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ سے متحد ہوکر بندہ اس میں حلول کرجائے۔ تصوف ہو یا حقیقت' یہ بات قرین قیاس نہیں اور سید موصوف نے تو ان دونوں کی تردید کی۔ ذات باری تعالیٰ میں حلول محال ہے۔ اس لئے کہ حادث اور قدیم' خالق اور مخلوق' صانع اور مصنوع باہم متحد ہو ہی نہیں سکتے۔ جہاں تک فنا کا تعلق ہے تو اس سے مراد شہوات ولذات کو نیست ونابود کرکے بشری تقاضوں سے الگ ہوجانا ہے۔ اس کا انداز یہ ہونا چاہئے کہ قرب وبعد' فراق ووصال صحو وسکر میں امتیاز اٹھ جائے۔ اس منزل پر پہنچ کر بقا کا حصول ہوتا ہے۔ سادہ الفاظ میں دنیاوی تعلقات

سے کنارہ کشی فنا ہے اور راضی بہ رضا ہو کر سر تسلیم خم کرنا بقا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بندے کے افعال کو صاحب بندہ اپنی جانب منسوب کرتا ہے۔ چونکہ باری تعالیٰ کو فنا نہیں لہٰذا اس نسبت کی بنا پر مشت غبار کو بھی بقا کا حصول ہو جاتا ہے۔

فرقہ حلولیہ کو حضرت علی سید علی ہجویریؒ نے نہ صرف رد کیا بلکہ اسے زندیق اور کافر قرار دیا۔ فانی پیکر کو ازلی ابدی ذات کے مساوی قرار دینا نہ صرف کفر ہے بلکہ ذہنی دیوالیہ پن سے بھی نچلا درجہ ہے۔ گدڑی پہن کر "حلول حلول" الاپنے سے حقیقت نہ بدل سکتی ہے نہ چھپ سکتی ہے۔ راہ سلوک میں بقول علی سید علی ہجویریؒ 12 حجاب (پردے) ہوتے ہیں۔ معرفت یا عرفان پہلا حجاب ہے۔ یہی وہ موضوع ہے جس میں فرقہ معتزلہ نے امت مسلمہ میں انتشار کی بنیاد ڈالی۔ یہ مشیت ایزدی کا صریحاً انکار کوئی آج کی پیداوار نہیں ذہنی کج روی کا بڑا پرانا مسئلہ ہے۔ معتزلہ کے بقول عرفان ایک اکتسابی مسئلہ تھا یعنی علم اور عقل کے وسیلے سے ذات باری تعالیٰ کی پہچان ہو سکتی تھی۔ سید علی ہجویریؒ نے دلیل پیش کی کہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہر عالم اور عاقل نور معرفت کا حامل ہوتا جبکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ من کے دروازے خالق کی نگہ کرم ہی سے کھلتے ہیں۔ فہم و فراست‘ قوت مدرکہ‘ معرفت کے اسباب ہیں علت تامہ نہیں۔ علت تامہ صرف اور صرف اس کی عنایت ہے۔ باب علم حیدر کرار کا قول ہے کہ "میں نے خدا کو خدا ہی کے وسیلے سے پہچانا اور اس کے نور کی روشنی میں ماسوا کو دیکھا۔"

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے بقول معرفت کسی شے پر تعجب نہ کرنا ہے کیونکہ تعجب مقدور سے وراشے پر ہوتا ہے لیکن خالق کائنات ہر کمال پر قادر ہے پھر تعجب کس بات کا۔ ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ معرفت خالق کے مسلسل لطف و کرم کی وجہ سے سربستہ رازوں کے انکشاف کا نام ہے۔ اس سے دل روشن اور بصیرت کمال اوج پر جا پہنچتی ہے اور بندہ آفات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

مشیت ایزدی پر ایمان ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ امت مسلمہ میں جب بھی انتشار اور فساد کا آغاز ہوا اسی ایمان کی کمزوری کی بناء پر ہوا۔ تعلیمات ہجویری چونکہ ایک سچے مسلک کی تشریح پر مبنی ہیں لہٰذا اس سے واقفیت آج کی اشد ضرورت ہے۔

دوسرا حجاب جس کی ولی وقت نے دلنشیں وضاحت کی وہ توحید ہے۔ اس میں تین باتیں قابل غور ہیں۔ خالق کو اپنی وحدانیت کا خود بھی احساس ہے۔ دوسرے وہ اپنی وحدانیت کو

تسلیم کرنے کا حکم دیتا ہے اور تیسرے بندے کے گوشہ دل میں اس کی وحدانیت کا عرفان موجود ہے۔ راہ سلوک کا مسافر' منزل پر پہنچ کر محسوس کرتا ہے کہ خالق لامحدود ہے۔ اطراف کی قیود سے مبرا' قید مکاں سے آزاد' اس کی ذات و صفات تغیر پذیر نہیں۔

تیسرا حجاب ایمان کا ہے۔ ایمان کی علت معرفت ہے یا بندگی؟ سید علی ہجویریؒ کے نزدیک وہ معرفت فضول ہے جس میں بندگی نہ ہو۔ معرفت تو شوق اور محبت کا نام ہے اور وہ محبت کا اعلان جھوٹا ہے جس میں اطاعت نہ ہو۔ یہ کہنا غلط ہے کہ بندگی کی ضرورت حصول عرفان تک ہے۔

چوتھا حجاب طہارت ہے۔ ایمان کے بعد اسی کا درجہ کا آتا ہے مگر طہارت ظاہر اور باطن دونوں کی ضروری ہے۔ باطنی طہارت سے مراد دل کا شکوک و شبہات سے پاک ہونا ہے۔ جس کے بغیر معرفت کا حصول ممکن نہیں۔ اس کا آغاز توبہ سے ہوتا ہے۔ توبہ احکام الٰہی کو نظرانداز کرنے پر تاسف کا نام ہے۔ توبہ کی شان یہ ہونی چاہئے کہ احکام الٰہی کی مخالفت ترک کی جائے اور مخالفت کی طرف لوٹنے کا قطعاً" خیال نہ ہو۔ یہ رویہ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب ندامت کا احساس اجاگر ہو جائے۔ یہی ندامت خدا کو مرغوب ہے۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

پانچواں حجاب نماز کا ہے جو راہ راست پر قائم رہنے کا وسیلہ ہے۔ اس میں وضو طہارت ظاہری ہے توبہ طہارت باطنی قبلہ رو ہونا مرشد سے رابطہ' قیام مجاہدہ نفس' قرات' ذکر' رکوع تواضع' سجدہ معرفت نفس' تشہد مقام محبت اور سلام ان مقامات سے باہر آنے کا نام ہے۔ اصل نماز تو یہ ہے کہ جسم عالم ناسوت میں ہو تو روح عالم ملکوت تک رسائی حاصل کرلے۔ مردان حق ایسی نمازیں ادا کرچکے ہیں۔

چھٹا حجاب زکوٰۃ ہے جو جزو ایمان ہے۔ سالک کو زکوٰۃ میں سخی نہیں بلکہ جواد ہونا چاہئے۔ سخی دوران سخاوت کمی بیشی میں امتیاز کا قائل ہوتا ہے جبکہ جو اداس امتیاز سے کوسوں دور۔ یہاں ذہن میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ تہی دستی' فقر کا طرہ امتیاز تو پھر زکوٰۃ کا سوال کہاں سے پیدا ہوا؟ سید علی ہجویریؒ اس کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔ زکوٰۃ مال و متاع ہی کی نہیں تندرستی کی بھی ہوتی ہے۔ صحت کی زکوٰۃ یہ ہے کہ دکھ تکلیف میں مبتلا [illegible] مالک شکر

بجالائے اور اسے منجانب باللہ تصور کرتے ہوئے اظہار مسرت کرے۔ علاوہ ازیں صحت کی زکوٰۃ تندرست اعضا کو مصروف عبادت رکھنا ہے۔ باطن کی زکوٰۃ پاکیزگی اور عرفان کا حصول ہے۔

ساتواں حجاب روزہ ہے۔ اس سے مراد حواس خمسہ کو اس طرح پابند سلاسل کرنا کہ ہوا وہوس کا گزر تک نہ ہو۔ بھوک سے عاجزی پیدا ہوتی ہے جسم کی ابتلا دل کو روشن کرتی ہے۔

آٹھواں حجاب حج کا ہے۔ صوفی کا ہر گناہ سے تائب ہونا سفر حج پر نکلنا ہوتا ہے۔ احرام زیب تن کرنا انسانی عادات سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہے۔ وقوف عرفات سے مراد مشاہدے کا کشف حاصل کرنا۔ مزدلفہ نفس کی تمناؤں کو ترک کرنا اور خانہ خدا کا طواف جمال یار کا مشاہدہ، صفا و مروہ میں دوڑنا دل کی صفائی میں جدوجہد کرنا، قربانی سے مراد ماسوا کی خواہشات کا ذبح کرنا اور کنکریاں پھینکنا یعنی رمی جمرات دنیاوی رشتوں ناتوں سے تدارک کے مترادف ہے۔ صوفی کو اگر یہ کیفیات حاصل نہیں ہوئیں تو اس کا حج نہیں ہوا۔

"کشف المحجوب" کا آخری باب آداب سماع پر مشتمل ہے۔ اس کا متن پیش خدمت ہے۔

مسلک ہجویریہ میں محفل سماع مباح یعنی جائز اور روا ہے مگر اس کی شرائط اتنی کڑی اور آداب، اتنے پاکیزہ ہیں کہ ان کی بجا آوری تقریباً ناممکن ہے۔ بلاضرورت محفل سماع کا انعقاد ممنوع ہے۔ اس ضرورت کا فیصلہ ظاہر ہے عدالت دل میں ہوگا۔ دو محافل کے درمیان طویل وقفہ لازم ہے تاکہ سماع کا وقار قائم رہ سکے۔ محفل میں سالک کا مرشد موجود ہونا چاہئے۔ عوام الناس کی شرکت ممنوع ہے۔ قوال فاسق وفاجر نہ ہوں۔ (شراب کے جام نوش فرماکر قوالی کا انعقاد جائز ہے یا ناجائز اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے) بوقت سماع دنیاوی علائق سے سینہ پاک ہو۔ کھیل تماشا مقصود نہ ہو۔ دل کے گداز میں ارتقا مطلوب ہو۔ کیفیت وجد میں کسی سے معاونت کی امید نہ ہو اور نہ اس میں تکلف برتا جائے۔ محفل سماع میں نوعمر لڑکے نہ ہوں۔ رقص ہر حالت میں ناجائز اور ناپسندیدہ ہے۔

سید علی ہجویریؒ نے احیائے دین کا اگر کوئی کام نہ بھی کیا ہوتا تو صرف اس کتاب کی وجہ سے ان کا نام اہل ایمان حضرات کے سینوں میں تاقیامت زندہ رہتا۔ یہ کتاب اسرار و رموز کو کھول کر بیان کرنے والی ہے جو سینوں کو روشن اور دماغوں کو معطر کرتی ہے۔ اس کا مختصر

تعارف صرف اس لئے پیش کیا گیا کہ ایک تو یہ وقت کی ضرورت ہے' دوسرے ذکر علی ہجویریؒ اس کتاب کے تعارف کے بغیر نامکمل رہ جاتا۔

صفر کا مہینہ تھا اور 465ھ ولی وقت کی طبیعت ناساز ہوئی۔ شیخ ہندیؒ نے اظہار تفکر کیا تو آپ نے مسکرا کر فرمایا "میں نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ میں غیرفانی ہوں اور پھر اس تجربے سے تو ہر فرد بشر کو گزرنا ہے۔ شیخ! کبیدہ خاطر ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔" رشد و ہدایت کا آفتاب عالم تاب غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا اور لاہور میں اپنے دست حق پرست پر دین فطرت قبول کرنے والے پہلے ہوش مند انسان کو تسلی و تشفی سے بھی نواز رہا تھا۔ شاید اسے علم تھا کہ سرزمین ہند سے دور' گیلان یا جیلان میں صرف پانچ برس بعد معرفت کا ایک ایسا سورج طلوع ہونے والا ہے جو کرہ ارض کے گوشے گوشے کو منور کردے گا۔ خلق خدا نے اس غروب ہونے والے آفتاب کو داتا گنج بخش کہا تو جیلان میں طلوع ہونے والا مہرمنور کو پیران پیر۔ ظاہر اور باطنی علم سے بڑھ کر اور کون سا خزانہ ہو سکتا ہے کہ خلق خدا سید علی ہجویریؒ کو گنج بخش کا خطاب نہ دیتی۔

20 صفر کے دن سرزمین لاہور کو چونتیس برس تک منور کرنے کے بعد مقام سوز فرائز یہ سورج غروب ہو گیا مگر کیا واقعی اس کی کرنیں بھی دم توڑ گئیں؟ اپنے گردوپیش نگاہ دوڑایئے کتنے لوگ ہر روز اپنے اپنے ظرف و شرف کے مطابق ان روشن کرنوں سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ کیا اس میں شک و شبے کی گنجائش ہے؟ آج ہی پر کیا موقوف' ماضی قریب و بعید میں جھانکئے۔ سینہ روشن ہو جائے گا۔ شیخ الاسلام خواجہ معین الدین چشتیؒ جیسی شخصیت' شاہان وقت کو خاطر میں نہ لانے والی ہستی' وصال ہجویریؒ کے سو برس بعد کشاں کشاں مزار اقدس پر حاضر ہوتی ہے۔ خزانے حاصل کرنے کی غرض سے نہیں' چلہ کشی کے لئے' روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے شیخ السلامؒ نے روحانی ملاقات میں کن موضوعات پر لب کشائی کی ہوگی؟ کیا کچھ طلب کیا ہوگا! اس طلب و عطا کے متعلق تو لب کشائی کی جسارت کوئی نہیں کر سکتا۔ جو بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ ہر چشم کے عین سامنے ہے۔ وہ مقام بھی محفوظ ہے۔ جہاں شیخ اسلام نے چلہ کشی فرمائی اور جس انداز میں خراج تحسین پیش کیا وہ تو دنیا دیکھ ہی رہی ہے۔ چلہ کشی کا دورانیہ اختتام پذیر ہوا تو قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرشد و رہنما بے ساختہ پکار اٹھا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کاملاں را رہنما

جانے اس کامل کو کون سا خزانہ ہاتھ لگا تھا وہ رہنمائی تھی روشنی تھی یا مدارج میں ترقی وبلندی! یہ تو خیر چھٹی صدی ہجری کی بات تھی۔ حسین ڈاہڈا، شاہ حسین یا مادھولال حسین نے کمال کہاں سے حاصل کیا؟ ابوبکر بگھوی یا بہلول دریائی تو نشاندہی فرما کر سرخرو ہو گئے، شاہ حسین اسی آستانے پر دھرنا مار کر بیٹھ گئے اور خزانہ حاصل کر کے رہے۔ یہ سلسلہ تو صدیوں سے جاری ہے۔ موجودہ صدی میں بھی ایک مرد قلندر پیدا ہوا تھا۔ لوگوں نے اسے حکیم الامت کا خطاب دیا۔ وہ گداز دل کا مالک انسان اس خطاب کا مستحق تھا۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

یہی پکارتا ہوا آستانہ عالیہ پر حاضر ہوا مشرق و مغرب کا علم ایک جرعے میں پی چکا تھا۔ پھر بھی سپرد اضطراب تھا۔ شاہان وقت کو رموز کشور کشائی اور آداب جہاں داری و جہاں بانی سکھانے والا۔ محمد اقبال، رات رات بھر ہجویری دربار میں حاضری دیتا رہا۔ جب سکون قلب نصیب ہوا۔ بے قراریوں کو قرار آیا تو بے ساختہ پکار اٹھا۔

سید ہجویر مخدوم امم
مرقد اور پیر سنجر را حرم
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما از مہر او تابندہ گشت

حکیم الامت کی صبحیں روشن کرنے والی ہستی کو گنج بخش نہیں تو کس القاب سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ جس آستانے پر ایسی بلند مرتبت ہستیاں زانوئے ادب تہ کرتی ہو، وہاں ہم آپ جیسے کس شمار و قطار میں ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں آستانہ ہجویریہ ہی وہ سرچشمہ فیض ہے جہاں سے عوام اور خواص یکساں مستفیض ہوتے ہیں۔ یہ آستانہ لاہور بھاٹی دروازے کے مغرب میں داتا دربار کے نام سے مشہور ہے۔

سلطان محمود غزنوی کے خاندان میں سے سلطان ابراہیم بن سلطان محمود غزنوی نے اس دربار کی بنیاد رکھی۔ مغل شہنشاہوں نے اپنے اپنے ادوار میں حسب توفیق اس کی توسیع میں

حصہ لیا۔ آج بھی اس کی آرائش و زیبائش زور و شور سے جاری ہے مگر کاش اس درویش بے ریا کی تعلیمات پر بھی کوئی توجہ دیتا ورنہ تو یہ چند کلیوں پر قناعت کرنے والی بات ہے۔ شاید نادانی اسے ہی کہتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

حضرت عبداللہ صومعی کے نواسے، سید ابو صالح جنگی دوست اور ام الخیر سیدہ فاطمہ کے فرزند دلبند، مقبول بارگاہ فدائے رسول خدا، سردار اولیا محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ غوث الاعظم کی حیات بابرکات کا دل آویز تذکرہ جس میں ان کی زندگی کی ساری کہانی سمٹ آئی۔

یا غوث معظم نور ہدیٰ، مختارِ نبی مختارِ خدا
سلطان دوعالم قطب علیٰ، حیراں از جلالت ارض و سما

از

حضرت معین الدین چشتی

غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

ایک تو دریا کنارے پانی کی لہروں پر ہلکورے لیتا ہوا سیب' بڑا خوش رنگ تھا دوسرے نوجوان مسافر کا بھوک سے برا حال تھا۔ کئی روز سے کھیل تک اڑ کر منہ میں نہ آئی تھی۔ لذت کام و دہن سے نا آشنا مسافر کے لئے یہ گویا غیبی رزق والا ماجرا تھا۔ اشتہا سے مجبور انسان نے ہاتھ بڑھا کر سیب پکڑلیا اور بسم اللہ پڑھنے کے بعد اسے کھانے لگا۔ وسائل سے یکسر محروم اور وسائل دنیا سے مالا مال انسان میں بنیادی فرق صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو وقت کی روٹی کا ہوتا ہے اس کے بعد شکم پروری کا جذبہ دونوں کو ایک سطح پر لے آتا ہے مگر حب اللہ میں سرشار لوگ اس کلیے قاعدے سے مستثنیٰ ہوتے ہیں اور کئی روز کا بھوکا مسافر "حب اللہ والرسول" کے بحر بے کنار میں غوطہ زن ہو چکا تھا۔ سیب حلق سے نیچے اترا تو آتش شکم کو قدرے قرار آگیا مگر "حب اختیاری" نے اسے سپرد اضطراب کردیا "یاویلتی یاحسرتی" یہ میں کیا کر بیٹھا"؟ مسافر سوچنے لگا یہ سیب آخر کسی شاخ ثمربار سے ٹوٹ کر گرا ہوگا اور وہ شاخ کسی شجر کا حصہ ہوگی پھر سیب کا وہ درخت خود رو نہیں کسی کی ملکیت ہوگا اور میں مالک کی اجازت کے بغیر ہی اسے نگل گیا یہ تو لقمہ حرام والی بات ہوگئی۔ اب کیا ہوگا؟" مسافر کی "بنتر" نیک تھی لہٰذا وہ اس حقیقت سے آشنا تھا کہ ایک لقمہ حرام چالیس دن کی عبادت پر خط تنسیخ کھینچ دیتا ہے اور ہر حرف دعا شرف قبولیت سے پیشتر ہوا میں تحلیل ہوجاتا ہے۔ اسی سوچ سے بے چین ہو کر بھوکا مسافر دریا کنارے بہاؤ کی مخالف سمت چلنے لگا۔ بھوک بے شک طاقتور جذبہ بقا ہے مگر خوف احتساب کے حامل نیک طینت حضرات اسے طاقتور ترین نہیں گردانتے۔ ان کے نزدیک خوف خدا سرفہرست اور جذبہ بقا کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ مسافر کا سفر رائیگاں نہیں گیا۔ لب دریا اسے ایک وسیع و عریض باغ دکھائی دیا جس میں سیبوں کے بے شمار درخت تھے "یقیناً یہی میری منزل ہے اور انہی درختوں میں کسی ایک کی شاخ سے وہ سیب گرا ہوگا؟" مسافر یہ سوچ کر باغ کے مالک کو تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ملاقات ایک نورانی چہرے والے بزرگ سے ہوئی۔

"آپ کون ہیں اور کس کو تلاش کر رہے ہیں؟" بزرگ نے مسافر سے پوچھا۔

"محترم بزرگ اگر آپ ہی اس باغ کے مالک و مختار ہیں تو مجھے آپ کی ہی تلاش تھی" مسافر نے جھکی نگاہوں سے کہا۔

"ہر شے کا مالک حقیقی تو رب العزت ہے البتہ اس باغ کی چند روزہ ملکیت اس نے مجھے عطا کر رکھی ہے۔" بزرگ نے مسافر کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جناب، مجھ سے ایک گناہ سرزد ہو چکا ہے۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر آپ کا ایک سیب کھا لیا ہے اگر آپ میری یہ تقصیر معاف فرما دیں تو بڑی کرم نوازی ہوگی" مسافر حرف مدعا زبان پر لے آیا۔ اب بزرگ نے از سرنو مسافر کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور چشم تماشا نے جو کچھ دیکھا دل نے اسے بے حد پسند کیا۔ "آپ کی یہ تقصیر کیوں معاف کر دی جائے؟" بزرگ نے عجیب و غریب سوال کیا "تاکہ میں سجدوں کی لذت سے محروم نہ ہو جاؤں" مسافر نے مختصر مگر جامع جواب دیا۔

"برخوردار، معافی طشت میں سجا کر مفت پیش نہیں کی جا سکتی" بزرگ نے برجستہ کہا "ہر گناہ کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔"

"میں ہر قسم کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں مگر مجھے معافی سے محروم نہ فرمائیں"۔

"چند روز اس باغ کی رکھوالی کرو، پھر معافی کے متعلق غور کیا جا سکتا ہے" بزرگ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

یہ بزرگ اپنے زمانے کی مستجاب الدعوات ہستی شیخ عبداللہ صومعی تھے جن کا شمار جیلان کے مشائخ اور زہاد شب زندہ داروں میں ہوتا تھا اور معافی کے خواستگار مسافر، ولی وقت سید ابو صالحؒ تھے۔ سید موصوف اپنے شوق جہاد کی بناء پر جنگ دوست یا "جنگی" کے نام سے مشہور تھے۔ بعض کتب میں سید ابو صالح "جنکی" آیا ہے جو اصل میں "جنگی" ہے (جس کی وجہ تسمیہ بیان کی جا چکی ہے) جیل یا جیلان، طبرستان سے پرے مدان کے قریب دریائے دجلہ کے کنارے ایک قصبہ ہے جسے عجمی زبان میں گیلان یا گیل کہا جاتا ہے (اردو زبان کا انتیسواں فارسی کا چھبیسواں حرف "گاف" عربی زبان میں چونکہ موجود ہی نہیں لہٰذا اس گیلان ہی کا عربی تلفظ "جیلان" ہے)

حضرت شیخ عبداللہ اور ابو صالح کے درمیان معاملہ طے ہوا تو مؤخر الذکر نے پوری تندہی سے باغ کی نگہداشت کے فرائض سرانجام دینا شروع کئے۔ پتے پتے اور بوٹے بوٹے کا احوال جس انداز میں دریافت فرمایا اس سے شیخ عبداللہ اور بھی گرویدہ ہوگئے۔ اس گہری وابستگی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ حضرت شیخ نے باغ کے رکھوالے میں ایک ایسے نقطہ نور کا

جلوہ دیکھا تھا جس سے ان کی روحانی چشم تماشا بھی چندھیا گئی۔ جسے وہ پہلی نظر میں ایک معصوم کبوتر سمجھ بیٹھے تھے وہ تو ابرپاروں سے بلند پرواز کرنے والا شاہین نکلا جو محض اتفاق سے ان کے ہاتھ آگیا۔ اس کی نشست و برخاست، ہر معاملے میں رضائے رب کو فوقیت اور خشیت الٰہی دیکھ کر حضرت شیخ عبداللہ صومعیؒ بڑے متاثر ہوئے۔ وہ خود صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے اور چشم بینا سے بہت دور تک دیکھ سکتے تھے لہٰذا انہوں نے کافی غور وخوض کے بعد ایک بڑا فیصلہ صادر فرمایا۔

وقت معین کے اختتام پذیر ہونے پر جب ابوصالح ان کی خدمت میں اپنا مقدمہ لے کر دوبارہ حاضر ہوئے اور معافی کی درخواست پیش کی تو شیخ موصوف نے ایک عجیب و غریب شرط پیش فرمادی۔ ”عزیزم معافی کی صرف ایک ہی صورت ہے“ انہوں نے سنجیدگی سے وضاحت فرمائی ”میری ایک صاحبزادی ہے جو آنکھوں سے اندھی، قوت سماعت سے محروم اور ہاتھ پاؤں سے مفلوج ہے، اس سے رشتہ ازدواج قبول کرلو تو ہمارا حساب بے باق ہو جائے گا۔“

”محترم بزرگ مجھے اپنے سجدوں کی لذت فصیل جاں سے بھی عزیز ہے لہٰذا آپ کی ہر شرط قابل قبول ہے میں آپ کے حسب ارشاد اس رشتے کو قبول کرتا ہوں“ سید موصوف نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح دونوں کے مابین نئے رشتے کا آغاز ہوا مگر شب زفاف کے موقع پر ایک حیران کن بات ہوئی۔ جونہی دلہا نے شریک حیات کو دیکھا تو گھبرا کر گھر سے باہر بھاگے۔ دلہن نہ صرف ظاہری عیوب سے پاک تھی بلکہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ سید موصوف کسی غلطی کے احتمال کی بناء پر بھاگے بھاگے اپنے سسر کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت عبداللہ نے فراست باطنی سے اپنے داماد کی پریشانی کا سبب معلوم کرلیا اور فرمایا ”بیٹے، کوئی غلطی وغیرہ نہیں ہوئی یہی میری صاحبزادی اور تمہاری شریک حیات ہے۔ میں نے اپنی صاحبزادی میں جو عیوب گنوائے تھے وہ اصل میں اس کی صفات ہیں۔ بصارت سے محرومی کی وضاحت یہ ہے کہ اس نے آج تک کسی نامحرم کو دیکھا تک نہیں۔ یہ اس کے حیا کی انتہا ہے۔ چونکہ اس نے زندگی میں کبھی خلاف حق بات نہیں سنی لہٰذا وہ کذب و فریب کے لئے سماعت سے محروم ہے۔ گھر کی چار دیواری سے چونکہ اس نے کبھی بلا ضرورت شرعی باہر قدم نہیں رکھا لہٰذا وہ غیر شرعی اقدام کے لئے پاؤں سے مفلوج ہے۔ کار خیر کے سوا اس کے ہاتھ ہر کام سے ناآشنا ہیں لہٰذا وہ کار شر کے لئے ہاتھوں سے بھی مفلوج ہے۔“

حضرت عبداللہ صومعی نے یہ وضاحت پیش کی تو نوجوان کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ شرم و حیا کی پتلی حسن سیرت و صورت سے مالامال شریک حیات سے بڑھ کر دنیاوی نعمت اور کیا ہو سکتی تھی۔ عبداللہ صومعیؒ کی اس صاحبزادی کا اسم گرامی ام الخیر سیدہ فاطمہ ہے جو سیدنا غوث پاک کی والدہ ماجدہ ہیں۔ شیخ عبداللہ صومعیؒ سیدنا غوث کے نانا علم و فضل میں لاثانی ہونے کے علاوہ صاحب حال ولئی وقت تھے۔ ان کے حسب مزاج واقعات کا ظہور پذیر ہونا تاریخ تصوف کی کتب میں محفوظ ہے۔ کسی بد نصیب سے غیر شرعی فعل سرزد ہونے کی بناء پر اگر شیخ موصوف کو غصہ آجاتا تو اس شخص کا مبتلائے عذاب ہو جانا یقینی امر ہوا کرتا تھا۔ اس کے برعکس اگر وہ کسی کو نظر التفات سے نوازتے تو وہ شخص رب العزت کی جانب سے انعام و کرام کا مستحق قرار پاتا اور یہی صاحب تصرف ولی اللہ کی پہچان ہے۔ کبیر سنی کے باوجود نوافل بکثرت ادا فرماتے اور خشوع خضوع کو انتہا تک پہنچادیتے "بندہ نوافل سے میرے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ اس کے افعال مجھ سے منسوب ہونے لگتے ہیں" شیخ موصوف اس حدیث کی منہ بولتی تصویر تھے۔ یہ بات تو مستند ہے کہ ان کے لئے زمینی مسافت کو مختصر کردیا گیا تھا۔ اس کی صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ ان کے عقیدت مند چند تاجر سامان تجارت لے کر نکلے تو سمرقند کے گھنے جنگل میں ان کو خطرناک ڈاکوؤں کے گروہ نے اپنے نرغے میں لے لیا۔ تاجر حضرات تو ویسے بھی جدال و قتال سے ناآشنا قسم کے لوگ تھے۔ اچانک تاجروں نے شیخ صومعی کو چیخ چیخ کر پکارنا شروع کیا "یا شیخ المدد۔ اس آفت ناگہانی سے ہمیں بچائیے" اس فریاد کا ارتعاش ابھی فضا میں موجود تھا کہ ان کو شیخ موصوف کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر ظاہری چشم تماشہ نے عجیب و غریب منظر دیکھا۔ شیخ موصوف ان کے سامنے کھڑے قہر آلود نگاہوں سے ڈاکوؤں کو گھور رہے تھے پھر انہوں نے گرج کر کہا "سبوح قدوس ربنا اللہ تفرقی یا خیل عنا (ہمارا رب پاک اور بے عیب ہے 'اے سوارو! ہم سے دور ہو جاؤ) زبان شیخ سے ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ سارے ڈاکو حواس باختہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے پھر وہ سر پر پاؤں رکھ کر یوں بھاگے جیسے آہوئے مرگ دیدہ بھاگتا ہے کچھ تو قریبی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کچھ جنگل میں روپوش ہو گئے۔ تاجروں کے ہوش و حواس درست ہوئے تو انہوں نے شیخ صومعیؒ کو یوں غائب پایا جیسے ہوا کا حبس مٹانے والا جھونکا تھا یا کوندا کہ لپکنے کے بعد صرف اپنا احساس چھوڑ گیا۔ اپنی بصارتوں اور سماعتوں کو جھٹلانے کی ان میں ہمت نہ تھی بہرحال فیصلہ ہوا کہ دن اور

وقت کو ذہنوں میں محفوظ کرلیا جائے اور جیلان واپس پہنچ کر شیخ موصوف سے اس کی تصدیق کرالی جائے۔ جب وہ لوگ بخیر و عافیت وطن لوٹے تو انہوں نے مجلس شیخ میں سارا واقعہ من و عن بیان کیا۔ حاضرین مجلس نے خدا کو حاضر و ناظر گواہ بنا کر کہا "اس روز تو شیخ یہاں موجود تھے۔"

اس خاندان کی ایک خاتون شیخ عائشہ کا (شیخ صومعی کی سگی ہمشیرہ یعنی غوث پاک کی پھوپھی) بھی زہد تقویٰ میں بلند و مرتبہ تھا۔ ایک بار جیلان میں ایسی خشک سالی ہوئی کہ زمین قطرہ آب ترسنے لگی جس کے نتیجے میں قحط کا دور دورہ ہوا۔ سب دعائیں بے اثر ہوئیں اور نماز استسقا بھی شرف قبولیت حاصل نہ کر سکی شاید قدرت کو بندوں کا امتحان مقصود تھا۔ تھک ہار کر خلق خدا شیخہ عائشہ (ام محمد) کے آستانے پر حاضر ہوئی اور دعائے استسقا کی درخواست کی۔ موصوفہ نے صحن میں کھڑے ہو کر سوئے آسمان دیکھا پھر جھاڑو پکڑ کر صحن کے ایک گوشے میں جاروب کشی کرنے کے بعد خالق کائنات سے فریاد کی "رب کائنات" جھاڑو میں نے دے دی رحمت کا چھڑکاؤ تو کردے "خلق خدا نے عجیب نظارہ دیکھا۔ نیلے صاف شفاف آسمان پر گھن گھور گھٹائیں چھا گئیں اور چھاچھوں پانی برسنے لگا۔ لوگ اپنے گھروں تک پہنچتے پہنچتے ابر رحمت میں شرابور ہو گئے اور جیلان آباد ہو گیا۔ شیخہ ام محمد کا وصال جیلان ہی میں ہوا اور مزار مقدس بھی اسی جگہ ہے۔ غوث الثقلین کے ننھیال کا سلسلہ امام حسین ابن علی سے جا ملتا ہے جبکہ والد بزرگوار کا دس واسطوں سے امام حسن ابن علی المرتضیٰ سے رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ گویا غوث الاعظم حسنی حسینی یعنی نجیب الطرفین سید ہیں۔ ان واسطوں کی تفصیل یہ ہے۔ غوث اعظم شیخ محی الدین عبدالقادر بن ابی صالح موسیٰ بن ابی عبداللہ بن یحییٰ زاہد بن داؤد بن موسیٰ بن عبداللہ بن موسیٰ الجون بن عبداللہ المحض بن حسن المثنیٰ بن حسن بن علی المرتضیٰؓ۔

ام الخیر ساٹھ برس کی عمر میں حاملہ ہوئیں۔ عرب خواتین بالعموم پچاس برس تک عمل تولید کے قابل ہوتی ہیں مگر کہتے ہیں کہ قریشی خواتین ساٹھ برس تک "کار تخلیق" سرانجام دے سکتی ہیں۔ غوث پاکؒ پیدائشی ولی تھے۔ عہد رضاعت میں ایک بار رمضان المبارک کا چاند مشتبہ ہو گیا اور رویت ہلال کا فیصلہ ام الخیر نے کیا "میرا بچہ رمضان المبارک میں سحری کے بعد دودھ پینے سے پرہیز کرتا ہے اگر کل صبح اس نے دودھ سے گریز کیا تو ماہ رمضان کا

آغاز سمجھو ہو گیا" دوسرے روز واقعی شیر خوار نے دودھ پینے سے انکار کر دیا حالانکہ شیر مادر سے صحت مند بچے کا انکار خلاف عقل بات تھی۔ تصدیق کرنے پر خلق خدا دنگ رہ گئی کہ اس روز واقعی یکم رمضان المبارک تھی۔ اس طرح سارے جیلان میں یہ خبر پھیل گئی کہ ابو صالح کا فرزند پیدائشی ولی ہے۔ سماعتوں کو یقین کرنے میں تامل تھا مگر اس کا کیا علاج کہ شیر خوار بچہ سب کے سامنے تھا۔ بندوں کے پاس ایمان لانے کے لئے آنکھ ہی معتبر وسیلہ ہے۔ یہ الگ بات کہ عنداللہ آنکھ کی گواہی کوئی اتنی معتبر نہیں ہوتی۔ اگر آنکھ کی گواہی واقعی قابل اعتبار ہوتی تو کائنات کی سب سے بڑی کتاب' قرآن میں ایمان بالغیب کی شرط عائد نہ کی جاتی۔ آنکھ چونکہ فریب نظر کا شکار ہو کر اکثر اوقات قوت مدرکہ کو دھندلا دیتی ہے لہٰذا اس کی گواہی خواص کے ہاں قابل قبول نہیں۔ بہر حال یہاں ذکر ایک عام چشم تماشا کا ہو رہا ہے جو قدم قدم پر ورطہ حیرت میں ڈوبتی ہے ورنہ اخلاص نے تو غوث پاک کی پیدائش کے سلسلے میں اپنے اپنے ظرف و شرف کے مطابق پیشین گوئیاں کر ہی دی تھیں۔

ام الخیر سیدہ فاطمہؒ بنت عبداللہ صومعی جیسی زاہدہ عابدہ خاتون کے بطن سے سید ابو صالح موسیٰ کے ہاں رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں 470 کی ایک دلکش چاند رات وہ بچہ تولد ہوا جو دین محمدی کے افق پر آفتاب عالمتاب بن کر چمکا۔ اس مہر پر تنویر کی واقعی اشد ضرورت تھی۔ اس مادر زاد ولی بچے کا نام نامی اسم گرامی "عبدالقادر تجویز کیا گیا۔ کیا اسے صرف تاریخی اتفاق سمجھا جائے کہ اس پیدائشی ولی بچے کے جد اعلیٰ کائنات کے سب سے بڑے انسان حضرت محمدؐ ختمی مرتبت کی شان کا خلاصہ "عبدہ" ہے اور صدیوں بعد اسی مبارک سلسلے کی درخشاں کڑی' غوث پاک کا اسم گرامی بھی "عبد" القادر ہے۔ راقم کی چشم بصیرت اس تاریخی "اتفاق" پر ہمیشہ چندھیا جاتی ہے۔ شان غوث الثقلین کے ادراک کے لئے چشم بصیرت درکار ہے۔ ایسی آنکھ جو ماضی و مستقبل میں بہ آسانی جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہو' کور نظر چشم جہالت تو فہم و فراست کو صرف گمراہ ہی کر سکتی ہے۔ ولادت غوث پاک کی اہمیت کے علاوہ "شدید ضرورت" سے آشنائی کے لئے اس دور تاریک پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا بھی بے حد ضروری ہے۔ یہ ایک سیدھا سادہ شدت طلب اور "عطا" والا معاملہ ہے۔ دین محمدی کے تن ناتواں کی رگوں میں صحت مند خون دوڑانے کے لئے ایک "محی الدین" شخصیت کی ضرورت تھی ایسی شخصیت جو جلال و جمال کا دلنواز مرقع ہو۔ قدوسی و جباری و

قہاری و جبروت کا خلاصہ ہو اور یہ شخصیت ' غوث پاک رحمتہ ہی کی ہو سکتی تھی جس نے دین فطرت کے جسد جاں برلب میں ایسی توانا روح پھونک دی کہ وہ بپھرے ہوئے "تاریخی طوفان" کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گیا۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جو ساری دنیا پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

غوث پاک کی ولادت باسعادت پانچویں صدی ہجری بمطابق گیارہویں صدی عیسوی ہے۔ یہی وہ صدی ہے جسے مسٹر گبن اور دیگر مشترقین نے اسلام کا عہد تاریک قرار دیا ہے لیکن ہمارے لئے یورپین مؤرخوں کی آراء سے بڑھ کر رسالت مآبؐ کے فرمان کی اہمیت ہے کیونکہ آپ ہی "محرم راز درون خانہ" ہیں البتہ اگر دنیا کے کسی گوشے سے کوئی آواز حضور ختمی مرتبت کی تائید میں بلند ہو تو وہ بھی ہمارے لئے معتبر بن جاتی ہے۔ اس دور کے روحانی انحطاط کے متعلق علاقہ انور کشمیری نے بھی فیض الباری "**تعلیقات بخاری**" میں ایک روایت نقل کی ہے۔ آنحضرت نے فرمایا "پانچویں صدی کے قریب میری امت پر آفت کی ایک چکی چلے گی اگر اس سے بچ نکلی تو پھر کچھ مدت کے لئے اسے استقامت نصیب ہو جائے گی"۔ حضور اکرمؐ کے فرمان کی روشنی میں ادبار کی ان گھٹاؤں میں ایک ایسے آفتاب عالمتاب کی ضرورت تھی جس کی ضیاپاشیوں کا فیض دائمی ہو اور 470ھ میں یہ آفتاب طلوع ہوا جسے دنیا غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی کے نام سے جانتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور انحطاط کی تفصیل بیان کر دی جائے تاکہ غوث پاک کی ولادت باسعادت کے سیاق و سباق اور ضرورت کی وضاحت ہو سکے۔

ولادت غوث پاک سے پہلے امت مسلمہ کو فسق و فجور ' بدکاری ' سیاسی ابتری اور اخلاقی انحطاط یعنی چار بلاؤں نے مکمل طور پر اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ عددی اعتبار سے مسلمان کم نہ تھے۔ اسلامی سلطنتوں کا سلسلہ اندلس سے برصغیر تک پھیلا ہوا تھا مگر سارا جاہ و جلال محض دکھاوے کا تھا۔ سیاسی مرکز بغداد کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ خلافت بنو امیہ کا سنہری دور جو عبد الملک بن مروان سے شروع ہو کر حضرت عمر بن عبد العزیز تک رہا قصہ پارینہ ہو چکا تھا۔ بنو عباس کا عروج ہارون الرشید کے عہد خلافت سے گرتے گرتے عباسی خلیفہ **مستظہر باللہ** تک آپہنچا تھا۔ (بنو عباس کے کل خلفاء کی تعداد 37 ہے۔ 132ھ السفاح سے لے کر 656ھ یا 1258ء تک۔ آخری خلیفہ **مستعصم باللہ** تھا جسے ہلاکو خان نے

ہلاک کیا) ولادت غوث پاک کے وقت خلافت بغداد کی گرفت اتنی کمزور تھی کہ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ امیر عبدالرحمٰن اموی کی قائم کردہ حکومت اندلس میں دم توڑ چکی تھی۔ یورپ کی عیسائی طاقتیں گھات لگائے بیٹھی تھیں کہ موقع ملتے ہی گرتی ہوئی دیوار کو آخری دھکا دے کر زمیں بوس کر دیں۔ مصر کی سلطنت باطنیہ عبیدیہ الحاد و بے دینی کے پرچار میں سرفہرست تھی۔ علامہ سیوطیؒ نے تاریخ خلفاء میں اسے سلطنت خبیثہ کا مناسب ترین نام دیا۔ بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں جا چکا تھا اور یورپی متحدہ طاقتیں سرزمین حجاز و عراق پر حملے کے لئے پر تول رہی تھیں۔ (اسی سلسلے کی ابلیسی کڑی **ریجنالڈ** کو بعد میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے دست مبارک سے واصل جہنم کیا) جہاں تک مشرق وسطیٰ کا تعلق ہے تو خلافت بغداد کا اثر و رسوخ برائے نام سا رہ گیا تھا۔ سلجوق اور دیگر سلاطین آپس میں دست و گریباں رہتے جو برسراقتدار آتا، اہل بغداد اسی کا کلمہ پڑھتے لگتے۔ برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں ہند کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والے سلطان محمود غزنوی کے جانشینوں کی حالت بھی قابل رحم و افسوسناک حد تک خراب ہو چکی تھی اور ہندو راجگان اپنی ذلت آمیز شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے پر تول رہے تھے۔

مسلمان امرا عیش و عشرت میں ڈوب چکے تھے حرم سراؤں کی زیبائش اور لونڈیوں سے کیف و سرور حاصل کرنے کے علاوہ ان کو کوئی اور کام ہی نہ تھا۔ چشم تصور سے اندازہ لگائیں کہ مشرق وسطیٰ کے ایک متوسط رئیس ابن مروان کی حرم سرائے میں رقص و سرور میں ماہر لونڈیوں کی تعداد پانچ سو تھی۔ اسی طرح ایک اور معتمد نامی قرطبہ کے رئیس نے ایسی لونڈیوں کی فوج ظفر موج پال رکھی تھی جس کی تعداد آٹھ سو سے ایک ہزار بیان کی جاتی ہے۔ ہسپانیہ کے نقب پوش سلاطین فنون لطیفہ و ثقافت کی ترویج و ترقی کے نام پر، اسلامی پردے پر خط تنسیخ کھینچ چکے تھے۔ عوام الناس نے بھی حکمرانوں کی تقلید میں نقاب پہننے شروع کر دیئے تھے اور خواتین کھلے منہ اپنے "سرمائے" کی نمائش کرتی پھرتی تھیں۔ امرا سے عوام تک غرضوں کے بستر سجائے بدکاری و مے نوشی میں ڈوب چکے تھے۔ مذہبی اور روحانی کیفیت ناقابل بیان حد تک خراب ہو چکی تھی۔ قرامطہ اور باطنیہ کے افکار کی روشنی میں علمائے سوکا طاقتور طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ملت اسلامیہ کا درد اور سود و زیاں کا احساس رکھنے والے وفا کے پتلے، باطنیہ کے خنجروں کا ہدف بن رہے تھے۔ سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی اور اس کے بعد

485ھ (ولادت غوث پاک کے پندرہ برس بعد) میں سلجوق شہنشاہ ملک شاہ انہی قاتلوں کے شکار ہوئے۔ رہی سہی کسر یونانی فلسفے کی یلغار نے پوری کردی۔ (اس کے جواب میں غوث پاک کے ہم عصر امام غزالیؒ نے تہافتہ الفلاسفہ تصنیف فرمائی)۔

ابو حامد محمد بن الطوسی المعروف امام غزالی (1058ء تا 1111ء) کا غوث اعظم کے آگے باقاعدہ زانوئے تلمذ نہ کرنا تو ثابت نہیں مگر جب آفتاب طلوع ہو جائے تو اس کی کرنوں سے شجر و حجر تک بلا امتیاز فیض یاب ہوتے ہیں۔ وہ زمانہ چونکہ غوث الثقلین کا تھا لہٰذا اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ہر ذہین کی جلا فیض غوث پاک ہی کی مرہون منت تھی۔ امام غزالی نے اپنی تصنیف "احیا العلوم" میں اس زمانے کے علماء سو کی تفصیل بیان کی ہے۔ امام موصوف رقم طراز ہیں "وہ ہر وقت شیعہ 'سنی' حنبلی اور اشعری مناظرات میں مصروف رہے تھے۔ گالی گلوچ اور کشت و خون تک نوبت پہنچنا ایک معمولی بات تھی۔ اور کچھ نہیں تو صدر نشینی ہی پر جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا معاشرے کا یہی وہ سیاسی و روحانی ادبار تھا جس آں حضرتؐ نے سب سے زیادہ خطرناک قرار دیا تھا" صحاح ستہ میں ایک حدیث شریف ذرا مختلف الفاظ میں موجود ہے "خدا کی قسم غربت و افلاس کا مجھے تمہارے متعلق کوئی خوف نہیں بلکہ مجھے اس بات کا ڈر ہے تم پر دنیا کے دروازے کھل جائیں گے۔ یا کھول دیئے جائیں گے اور پھر جیسے تم سے پہلی امتوں میں مقابلے میں کا بازار گرم ہوا اسی حالت میں تم بھی مبتلا ہو جاؤ گے یعنی اس حالت میں اغیار نہیں بلکہ خود مسلمان ہی مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے ہو جائیں گے۔"

آنحضرتؐ کے الفاظ چونکہ تقدیر انسانی کا درجہ رکھتے ہیں لہٰذا بغداد کے گلی کوچوں میں ارزانی سے بہنے والے خون نے اس حدیث شریف کی تصدیق کردی۔ اس اندھیرے میں ایک ایسی روحانی قوت کی اشد ضرورت تھی جو دین محمدی کی از سر نو شیرازہ بندی کرسکے نہ صرف یہ بلکہ اسے آنے والے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی بنا سکے۔ صورتحال اس بات کی بھی متقاضی تھی کہ اس بطل جلیل کا روحانی تصرف وقتی یا عارضی نہ ہو بلکہ دائمی ہو۔ معروف حالات کے تقاضوں کے عین مطابق ایک ایسے مرد مومن کو پیدا فرمایا گیا جسے دنیا قیامت تک 'پیران پیر' غوث الاعظم اور محی الدین جیسے مبارک اسمائے گرامی سے پکارتی رہے گی۔

اس میں شک و شبہے کی رتی برابر گنجائش نہیں کہ تعلیمات غوثیہ اور ان کی مساعی جمیلہ

ہی کے نتیجے میں، امت مسلمہ نہ صرف سنبھل گئی بلکہ اس قابل بھی ہو گئی کہ ان کی وفات کے بعد اٹھنے والے فتنہ تاتار کی غارت گری سے سلامتی ایمان کے ساتھ نبرد آزما ہوئی۔ اس فتنہ عظیم کی تباہ کاریاں اگرچہ بے حد و حساب تھیں۔ آگ اور لہو کا ایک بپھرا ہوا سمندر تھا جس میں امت مسلمہ کو ڈوب کر ابھرنا پڑا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی اور قوم کو اس بدبختی کا سامنا کرنا پڑتا تو اس کا نام و نشان، صفحہ ہستی سے مٹ چکا ہوتا۔ یہ اعجاز کیا کم ہے کہ سلسلہ قادریہ ہی کے ایک بزرگ نے فتنہ تاتار کے گھپ اندھیروں میں اسلام کی نورانی شمع روشن کی اور

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کے مصداق خود تاتاری قوم ہی قبول اسلام کے بعد ملت اسلامیہ کی محافظ بنی۔ برصغیر میں سلطنت مغلیہ اس کی درخشاں مثال ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے شہرہ آفاق تصنیف "ہمعات" میں اس نکتے کی وضاحت بڑے دلکش انداز میں کی ہے حضرت غوث الاعظم کی اصل نسبت، نسبت اویسیہ ہے جس میں نسبت سکینہ کی برکات ان معانی میں شامل ہوتی ہیں کہ شخص مذکورہ ذات الٰہی کے "ڈال" کے نقطے کی طرح شخص اکبر میں، ارواح کاملہ اور ملااعلیٰ کی محبت میں خود محبوب بن جاتا ہے۔ اس مقام محبوبیت کی وجہ سے اس کے ارادہ و توجہ کے بغیر تجلیات الٰہی میں سے وہ تجلی اس پر ظاہر ہو جاتی ہے جو ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی کا خلاصہ ہوتی ہے۔ اس تجلی کی وجہ سے ایسی انسیت اور برکات کا ظہور ہونے لگتا ہے جن کی کوئی انتہا نہیں۔ اس انسیت کے نتیجے میں امور کائنات خود بخود ظہور پذیر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اسی وجہ سے غوث الاعظم نے کلمات فخریہ فرمائے اور ان سے تسخیر عالم کا ظہور ہوا۔

درجہ بالا تحریر کی تائید میں ایک حدیث شریف کا اجمالاً ذکر کیا جا چکا ہے جس کا متن ہے کہ کثرت نوافل سے بندہ میرے قرب سے فیض یاب ہو جاتا ہے ایسا قرب کہ وہ اپنی ذات کو میری ذات میں فنا کر دیتا ہے۔ "فنافی الذات" پھر میں اس کی بصارت و بصیرت، سماعت، زبان اور ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں گویا انسان، خدائی طاقت و توانائی کا مظہر بن جاتا ہے اور حیات فانی کے بعد یعنی جسد خاکی کے زیر زمیں سو جانے کے بعد اس کے روحانی تصرفات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسے موجودہ دور کی زبان میں میٹا فزکس (Meta Physics) مابعد الطبیعات کا نام دیا گیا ہے اور انشاء اللہ 21 ویں صدی میں اس کے حقیقی معانی عوام الناس پر آشکار ہوں

گے۔ ابھی تک ایک عام انسان کی ذہنی سطح بلوغت کے اس مقام تک نہیں پہنچ پائی کہ روحانی تصرفات کا کماحقہ، ادراک حاصل کر سکے۔ بغیر ادراک کے ایمان لانے کے لئے ہمت و حوصلے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یہ تھی امت مسلمہ کی حالت زار جب 470ھ میں غوث پاک تولد ہوئے۔ کم سنی میں پیدائشی ولی کو علوم ظاہری کی تحصیل کے لئے مکتب کا راستہ دکھا دیا گیا مگر حالت یہ تھی کہ جب آپ سوئے مکتب تشریف لے جا رہے ہوتے تو فرشتوں کا ایک گروہ ساتھ ہوتا جو لوگوں کو احترام غوث کی تلقین کر رہا ہوتا "راستے سے ہٹ جاؤ، سر تسلیم خم کرتے جاؤ اللہ کا ولی آ رہا ہے، اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ غوث پاک کے ہم مکتبوں کو سرزنش کی جاتی "مقام احترام، حد ادب اللہ کے ولی لئے جگہ دو اور حیران کن بات یہ ہے کہ کم سنی ہی میں غوث پاک کو اپنے مقام و مرتبے کا احساس ہو چکا تھا۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی ولایت کا احساس دس برس کی عمر ہی میں ہو گیا تھا۔

دیتے ہی بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

کے مصداق کم سنی میں احساس ولایت صرف اسی صورت میں حیران کن بات نہیں کہ ظرف انسانی کی وسعت بھی اس کے عین مطابق ہو ورنہ منصور حلاج والا قصہ بن جاتا ہے اور انسان چھلک کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ غوث پاک اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر منصور میرے زمانے میں ہوتا تو میں ضرور اسے سنبھال لیتا۔

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

چھوٹی عمر میں ولایت کے بار گراں کا احساس بذات خود ایک ایسا کارنامہ ہے جو کبھی کسی نے دیکھا نہ سنا۔ کم سنی ہی میں غوث پاک کو دوہرے صدمے کا سامنا ہوا۔ والد بزرگوار اور شفیق نانا سفر آخرت اختیار کر گئے گویا شجر سایہ دار سے محروم ہونا پڑا۔ اس طرح تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ام الخیر سیدہ فاطمہ کے کندھوں پر آن پڑی۔ والدہ ماجدہ بھی بچے کے مقام و مرتبے سے آشنا تھیں لہٰذا اس کے مطابق انہوں نے ہر کام سرانجام دیا۔ غوث پاک کا اصل مقام تو تلامیذ الرحمٰن کی سرداری تھا مگر دستور دنیا کے عین مطابق آپ کو اکتساب علم کرنا پڑا۔ اس طریقہ کار سے صرف انبیا کی ذات ہی مستثنیٰ ہوتی ہے ورنہ غوث، قطب، ابدال ہر شخص کو کسی نہ کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ پھر ان واقعات کے ظہور کا آغاز

ہوا کہ غوث پاک عارضی طور پر سہم سے جاتے۔ گھر کے قریب ایک وسیع و عریض میدان میں چند بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ غوث پاک بھی ان میں شامل ہونے کے لئے میدان کی جانب لپکے پھر فضا میں ایک عجیب و غریب قسم کی گونج سنائی دی۔ "الی یا مبارک" (اے برکت والے میری طرف آ) اس گونج کے ارتعاش میں موسیقیت بھی تھی الوہی سرور بھی اور یہ پرہیبت بھی تھی۔ غوث پاک سہم کر گھر کی طرف بھاگے اور آغوش مادر میں آ بیٹھے۔ اس طرح کھیل کود کا خیال دل سے نکل دیا۔ والدہ نے مسکرا کر نورانی چہرے کی طرف دیکھا تو آپ بھی مسکرانے لگے۔ یہ سہم یہ خوف ندائے غیبی کی بناء پر تھا وہ ندا جسے سن کر کوہ طور پر حشر بپا ہوا۔ موسیٰ جیسا جلیل القدر پیغمبر اس صدا کو برداشت کر سکتا تھا اور وہ بھی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر۔ اسے تو ویسے بھی لوگ "وقفہ تسلیم و رضا" کہتے ہیں۔ کھیل تماشے سے گریز کی تلقین کرنے والی ندائے غیبی کا بار بار اعادہ ہوا تو قلب معصوم نے اس کا بھی حل ڈھونڈ نکالا۔ ایسا کھیل پیش کیا کہ خلق خدا انگشت بدنداں رہ گئی۔ وہ کون استاد تھا جو معصوم بچے کی راہنمائی فرما رہا تھا اور ایسے مشکل مضامین ذہن نشین کرا رہا تھا؟۔

"آؤ ساتھیو ایک بڑا دلچسپ کھیل کھیلیں" ایک بار خود عبدالقادر نے ہمجولیوں کو ترغیب دی۔ میں کہوں گا "لا الہ" اور تم سب اس کے جواب میں بہ آواز بلند کہنا "الا اللہ" بس بڑا مزا آئے گا"

چنانچہ اس روز جیلان کے گلی کوچے معصوم صداؤں سے گونجنے لگے۔ ایسی صدائیں جو سپرد اضطراب دلوں کو سامان تسکین فراہم کرتی ہیں۔ خلق خدا ورطہ حیرت میں ڈوبی مگر ام الخیر کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ خیر کا سرچشمہ آخر اسی کے وجود سے پھوٹ رہا تھا۔ بات فخر کرنے کے لائق تھی۔

عنفوان شباب نے ابھی در پر دستک نہ دی تھی کہ قلب معصوم گہری سوچوں کے حوالے ہو گیا۔ بندہ اور صاحب بندہ کے تعلقات، تخلیق کائنات، انسانی اعمال و افعال اور امت مسلمہ کا زوال یہی سوالات تھے جو ذہن میں گردش کرتے رہتے۔ دل معصوم ضرور تھا مگر دریاؤں سمندروں سے گہرا تھا، لہٰذا موضوعات کی وسعت اس میں سما سکتی تھی جیسے آنکھ کی پتلی میں بیکراں نیلا آسمان سما جاتا ہے۔ ان موضوعات پر غور و فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ غوث پاک اکثر و بیشتر مہر بہ لب رہتے۔

"جان عزیز! بعض سوچیں اندر کی لو مدھم کر دیتی ہیں اور بعض سینے کو جلا بخشتی ہیں" ام الخیر نے ایک روز لخت جگر سے فرمایا "لہٰذا سوچ کا انتخاب‘ سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے"۔

"جس چراغ کی لو اتنی ناتواں ہو اس کا بجھ جانا ہی بہتر ہے‘ امی جان"۔

"مناسب ترین بات ہے" ام الخیر نے مسکرا کر تائید کی۔ "میری خواہش ہے کہ آج تم زمین کے ٹکڑے پر ہل چلا دو‘ موسم اس توجہ کا تقاضا کر رہا ہے" ام الخیر نے لخت جگر کی خاموشی کا حل تجویز کیا۔ غوث الثقلین‘ والدہ کی خواہش کے احترام میں فوراً تیار ہو گئے۔ آگے آگے ہل تھا پیچھے پیچھے آپ۔ کھیت کے قریب پہنچے تو اچانک بیل ٹھٹک کر رک گیا۔ بیل تو جانور تھا اس کی کیا مجال تھی کہ معاملات غوث میں مداخلت کرتا۔ روکنے والی تو کوئی اور ذات تھی۔ وہی ذات جو ارادوں کی محتاج ہے نہ اسباب کی۔ جو کن کی ادائیگی سے کائنات تخلیق فرما سکتی ہے۔ یہ "کن" بھی ہمیں سمجھانے کے لئے ہے ورنہ وہ ذات تو "کن" کی بھی محتاج نہیں۔ کتنا دشوار ہے اس ذات کا ادراک؟ کیوں کہ لامحدود شے کا محدود شے میں سما جانا محال ہے۔ مگر ذہن انسانی‘ لامحدود کو محدود میں سمونے کی مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ہی رہتا ہے۔ اس بے زبان بیل کا غوث پاک سے محو کلام ہونا‘ امر ربی تھا۔ اس سارے واقعہ کی عقلی توجیہہ تلاش کرنا بھی حماقت کے زمرے میں آتا ہے اور حماقتوں سے گریز ہی کا نام دانش مندی ہے۔

"شرح عقائد نسفی" میں ایک عام انسانی ذہن کو مد نظر رکھتے ہوئے ذات باری تعالیٰ کے مفہوم و معانی کا تعین کیا گیا ہے۔ مرقوم ہے "لیس لہ مکان ولا یجری علیہ الزمان‘ تعالیٰ عن الجہات" یعنی "وہ قید مکان سے آزاد ہے (لامکانی) اس پر زمانہ بھی جاری نہیں ہوتا (زمانہ آفات کے تسلسل کا نام ہے) وہ سمتوں سے بھی بلند و بالا ہے"۔

اب انسانی ذہن جو حواس کا قیدی ہے اس کی تہ تک کیسے پہنچ سکتا ہے اس لامحدود کے احاطہ کے لئے عقل بھی تو لامحدود ہونی چاہئے۔ یہ وضاحت ان حضرات کے لئے ہے جو مناقب غوث پاک کے منکر ہیں۔ وہ صرف آنکھوں کے سامنے‘ سمجھ میں آجانے والے "جزو" کا اقرار تو کر لیتے ہیں مگر سمجھ میں نہ آنے والے‘ آنکھوں سے اوجھل "کل" کو ہضم نہیں کر سکتے۔ بہرحال جیلان کے کھیتوں میں 488ھ میں وہ بیل رک گیا اور اس نے غوث پاک کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا "مالھذا خلقت ولا بھذا امرت" آپ کی تخلیق اس کام کے لئے

نہیں کی گئی اور نہ آپ کو اس کا حکم دیا گیا ہے۔ غوث پاک تو پہلے ہی آفاقی سوچ کے حامل تھے ان کو یہ اشارہ ہی کافی تھا۔ لہٰذا اس کار جہاں کو چھوڑ چھاڑ کر گھر تشریف لے آئے اور گوشہ تنہائی کی تلاش میں مکان کی چھت پر جا چڑھے۔ اچانک ایک قافلے پر نگاہ پڑی جس کی منزل حرمین شریفین تھی۔ سوچ کے سوتے سرسبز و شاداب ہو گئے۔ خاموشی سے نیچے آئے اور والدہ ماجدہ کی خدمت میں درخواست پیش کی "اگر حکم ہو تو زیارت بزرگان اور تحصیل علم کے لئے بغداد چلا جاؤں" ام الخیر کی عمر اس وقت 78 برس کی تھی اور ان کے سامنے اٹھارہ برس کا نور نظر بصد احترام کھڑا تھا۔ ضعیفی سود و زیاں کے پلڑے میں ہر چیز تول رہی تھی اور شاہین آسمان کی بے کراں وسعتوں کو عبور کرنے کے لئے پر تول رہا تھا مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ سیدہ فاطمہ کوئی معمولی ماں نہیں تھیں، ام الخیر تھیں اور اپنے لخت جگر کے مقام و مرتبے کے تھوڑا بہت ادراک بھی ان کو تھا۔ چند لمحوں میں فیصلہ ہو گیا۔ وہ چپکے سے اپنی خواب گاہ میں گئیں، اپنے سرتاج ابو صالح موسیٰ کا چھوڑا ہوا کل اثاثہ، اسی دینار نکال لائیں پھر اس عمر بھر کی کمائی کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کیا، چالیس دینار غوث پاک کے چھوٹے بھائی کے لئے رکھ لئے اور چالیس دینار پیرہن غوث میں سی کر چھپا دیئے۔

"میرے لخت جگر، میں جانتی ہوں اس جدائی کے بعد میری آنکھیں تمہارے نورانی چہرے کو ترسیں گی" ام الخیر نے پرنم آنکھوں سے کہا "لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ خشک پتے شاخوں سے جھڑ کر نئی کونپلوں کے لئے جگہ خالی کر دیتے ہیں کیونکہ یہی قانون قدرت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب ہماری ملاقات صرف میدان حشر ہی میں ہو گی مگر میں کسی صورت بھی تمہاری راہ کی رکاوٹ بننا پسند نہیں کروں گی لیکن ایک وعدہ مجھ سے کرو" دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔ دو آنکھوں میں ممتا کا سمندر موجزن تھا تو دو میں احترام و سعادتمندی کا بحر کراں۔

"امی حضور! حکم کیجئے" غوث پاک نے بصد احترام کہا "آپ کے ہر حکم پر دل و جان سے عمل کروں گا"۔

"بیٹا قرآن میں جھوٹوں پر لعنت کی گئی ہے لہٰذا کچھ بھی ہو جائے جھوٹ سے اجتناب کرنا"۔

"چونکہ ارشاد خداوندی اور آپ کا حکم، دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے لہٰذا اس پر عمل

کرنے میں میری دلی رغبت اور روح کا میلان بھی شامل ہو گا" نوجوان نے اپنی والدہ سے ہمیشہ سچ بولنے کا وعدہ کرلیا اور ام الخیر نے نور نظر کو سپرد خدا کیا۔ اس طرح غوث پاک عازم بغداد ہوئے۔ اس وقت عمر عزیز اٹھارہ برس تھی۔ اکہرے بدن کی وجہ سے "نوعمر لڑکا" دکھائی دیتے تھے۔ چہرے پر معصومیت جو اندر کی روشنی سے اور بھی بھلی لگ رہی تھی۔ جیلان سے بغداد کا سفر شروع ہوا۔ دستور زمانہ کے مطابق یہ سفر ایک قافلے کی ہمراہی میں طے ہوا۔ دریائے دجلہ کے کنارے آباد اس مردم خیز علاقے جیلان اور بغداد کے درمیان براستہ واسط' چار سو میل کا فاصلہ' ایک ماہ کی مسافت تھی (یعنی مروجہ ذرائع آمدورفت کے وسیلے سے)۔ قافلہ ہمدان سے گزر کر جب وادی ربیک میں داخل ہوا تو ساٹھ ڈاکوؤں پر مشتمل گروہ غارت گراں کے نرغے میں آگیا۔ غوث پاک فقیرانہ لباس میں تھے۔ لباس مفلسی اور نوعمری کے باوجود ان کی روشن جبیں کا سارے قافلے میں چرچا تھا مگر گروہ ستم گراں کے مسلک میں' روسیاہی اور روشن جبینی میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ ان کا مسلک صرف ہوس مال و زر تھا۔ پل بھر میں ڈاکوؤں نے افراد قافلہ کو قلاش کردیا۔ ایک قوی ہیکل ڈاکو' روشن جبیں فقیر سے بھی مخاطب ہوا "اے لڑکے تمہارے پاس بھی کچھ ہے یا ایسے ہی گدڑی پہنے سیر و سیاحت میں وقت گزار رہے ہو"۔

"ہے کیوں نہیں' میرے پاس چالیس دینار ہیں" روشن جبیں لڑکے نے بلا خوف و خطر اعتراف کرلیا۔

"چالیس دینار؟" ڈاکو کے لبوں پر حیرت میں ڈوبی مسکراہٹ آ گئی "کبھی چالیس دینار دیکھے بھی ہیں؟" وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا گدڑی پوش فقیر دکھائی دینے والے لڑکے کو چھوڑ کر کسی دوسرے صاحب مال کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمہارے پاس کیا ہے لڑکے؟" ایک دوسرے ڈاکو نے بھی وہی سوال دہرایا۔ اس کو بھی وہی جواب ملا مگر یقین اسے بھی نہ آیا۔ تیسرا ڈاکو جہاندیدہ قسم کا تھا۔ چالیس دینار کا سن کر وہ اس عجیب و غریب روشن جبیں لڑکے کو پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گیا۔ قافلے والے بے سروسامان ہو کر حسرت و یاس سے اس گروہ ستم گراں کو دیکھ رہے تھے۔ جنگل کے قانون کا دور دورہ تھا جہاں طاقت ہی قانون ہوتا ہے اور دھونس دھاندلی انصاف۔

"سردار! یہ لڑکا کہتا ہے اس کے پاس چالیس دینار ہیں" ڈاکو نے یہ عجیب و غریب مقدمہ

"عدالت عالیہ" میں پیش کر دیا۔

"جناب کہاں چھپا رکھا ہے آپ نے یہ خزانہ؟" احمد بدوی' ڈاکوؤں کے سردار نے بطرز تفنن پوچھا۔

"میری گدڑی میں بغل کے نیچے" روشن جبین لڑکے نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ جھوٹ سے نا آشنا زبان کا کوئی یقین ہی نہیں کر رہا تھا۔ دغا فریب جن کا اوڑھنا بچھونا ہو' کذب و ریاکاری وطیرہ' وہ بدبخت' سچائی کی لذت سے واقعی نا آشنا ہوتے ہیں۔ سردار نے خنجر سے گدڑی پھاڑ ڈالی تو چالیس دینار اپنی پوری آب و تاب سے' اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ سردار ورطہ حیرت میں ڈوبا کبھی دیناروں کو دیکھتا کبھی روشن چہرے والے لڑکے کو۔ پھر جانے کیا ہوا کہ لڑکے نے بھی اپنی نگاہیں ڈاکو کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ڈاکو معصوم نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور سر جھٹک کر اس طلسم سے باہر آ گیا۔

"آپ کو سچ بولنے اور زر کثیر کی نشان دہی پر کس نے مجبور کیا؟" اب ڈاکو کے لہجے میں احترام تھا۔

"جناب' میں نے اپنی والدہ ماجدہ سے ہمیشہ سچ بولنے کا وعدہ کر رکھا ہے اور ہر حال میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔ یہی شیوہ مردانگی ہے" روشن جبین لڑکے نے سیدھے سادے الفاظ میں کہا۔ ادھر ڈاکو کی سماعت سے یہ الفاظ ٹکرائے تو اس کی دنیا ہی زیر و زبر ہو گئی۔ جھوٹ کے گھپ اندھیرے میں نور صداقت کی قندیل روشن ہو گئی۔ خوش بختی نے اس کے در دل پر پہلی دستک دی تو اس کی آنکھیں چھلک گئیں جیسے اتھلی ندی میں سیلاب آ جائے تو وہ فوراً کناروں سے باہر چھلک جاتی ہے۔ گزرگاہ گرد و غبار وغیرہ سے بھری ہوئی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

"آپ اپنی والدہ سے کئے ہوئے وعدے پر قائم ہیں اور میں بدبخت اپنے خالق کائنات سے کئے ہوئے وعدوں کو یکسر بھلا بیٹھا' عمر عزیز کا سارا سفر رائیگاں گیا۔ یا حسرتی' یہ میں نے کیا کر دیا" سردار کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے اور وہ عرق انفعال میں ڈوبا' سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

چشم تماشا حیران تھی۔ ہر سمت سناٹا طاری تھا۔ لٹ جانے والے حیران و ششدر کسی انہونی کے منتظر تھے تو لوٹنے والے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ روشن جبین لڑکے نے پروقار انداز میں ایک قدم آگے بڑھ کر اپنا دست مبارک گناہ گار سردار کے کاندھے پر رکھ دیا۔ "در توبہ وقت نزع سے ایک پل پہلے تک کھلا رہتا ہے' اپنی جان کو ہلاکت میں مت ڈالو" یہ اس ہاتھ کی کرامت تھی کہ عمل غوث کا کرشمہ' جہاندیدہ سردار نے اس ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا جیسے بھنور میں ڈوبتا ہوا شخص' کشتی کے کنارے کو تھام لیتا ہے۔ شاید اسے ہی "دست گیری" کہتے ہیں۔ بہرحال ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ تبلیغ کا یہ منفرد اور انوکھا انداز' چشم فلک نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وادی ربیک کی ان وسعتوں میں 'لاؤڈ سپیکر نصب تھے نہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کوئی ڈرا دھمکا رہا تھا مگر سردار کے علاوہ ستم گروں کے پتھر دل موم ہو چکے تھے۔ سردار کبھی نہ چھوڑنے کے لئے جو ہاتھ تھام چکا تھا' اسی کے سہارے اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھیوں نے اس کے اشارہ ابرو پر لوٹا ہوا مال اصل مالکوں کو لوٹا دیا۔ معافی کے خواستگار بھی ہوئے۔ لوٹنے والے خود لٹ گئے اور ایسے لٹے کہ دین و دنیا کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ ساٹھ ڈاکوؤں نے غوث پاک کے دست حق شناس پر بیعت کی۔ یہ عبدالقادر جیلانی کا پہلا کارنامہ تھا۔ تاریخ تبلیغ دین میں ہے کوئی ایسی مثال؟ "ہاتو برہانکم ان کنتم صادقین" (سچ کے دعویدار ہو تو دلیل پیش کرو) شیخ محمد بن قائد الایوانی فرماتے ہیں' میں نے حضرت غوث الثقلین سے ایک بار پوچھا "آپ نے اپنے مسائل کی بنیاد کس چیز پر قائم کی؟"

"راست گوئی اور سچائی پر" غوث پاک نے جواب دیا "میں نے مکتب میں حصول تعلیم کے دوران بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا" واقعی قندیل صدق روشن ہو تو جھوٹ کا اندھیرا بکھر ہی جاتا ہے۔

ہے افق سے ایک سنگ آفتاب آنے کی دیر
ٹوٹ کر مانند آئینہ بکھر جائے گی رات

تائب ہونے والے ڈاکوؤں کے اس گروہ میں سے اکثر حضرات "واصلین باللہ" ہوئے ان کا فردا" فردا" ذکر موضوع سے ناانصافی والی بات ہو گی۔ مناقب غوث پاک کی کتب میں یہ داستان محفوظ ہے۔

ہارون الرشید کے عہد خلافت میں جس کا آغاز ولادت غوث پاک سے تین صدی پیشتر

ہوا، بغداد کرہ ارض کا علمی ادبی مرکز تھا۔ علم کلام، منطق کے علاوہ یونانی فلسفے کی یلغار بھی ہوئی جس کے نتیجے میں قرآنی مسائل کی من پسند تاویلیں ہوئیں۔ غوث پاک اٹھارہ برس کی عمر میں جب بغداد میں وارد ہوئے تو مباحثوں اور مناظروں کا بازار گرم تھا۔ ایسے ایسے مسائل زیر بحث تھے کی عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے اور یہ سب کچھ علمی موشگافیوں کی آڑ میں ہو رہا تھا۔ پہلوانان سخن، مسلکوں کے خنجر تانے ایک دوسرے پر پل پڑنے کو ہر پل تیار رہتے تھے۔ مقتدی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کی تلاوت کرے یا نہ کرے، یہی بات طے نہیں ہو پا رہی تھی، اس پر شوافعی اور احناف کے درمیان کشت خون ہوئے۔ بغداد کے گلی کوچے آئے دن ایسے تماشوں کا مشاہدہ کرتے۔ "مسائل نظری" جن کا رونا حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنے دور میں رویا، اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ علامہ موصوف نے تو ان مسائل کو "شرارت ابلیس" قرار دیا۔ مسائل نظری میں سرفہرست یہ مسئلہ ہے "صفات خداوندی "عین ذات ہیں یا "غیر ذات" اب اس کی الجھن ملاحظہ فرمائیں۔ اگر صفات کو عین ذات یعنی ذات کا حصہ قرار دیا جائے تو ذات اور صفات، دو اشیا قدیم ہوئیں۔ اس طرح "وحدانیت" مجروح ہوئی۔ اگر صفات کو ذات سے الگ قرار دیا جائے تو ذات خداوندی، صفات اور ذات کا مجموعہ ہوا۔ یہ بھی "وحدانیت" کی ضد ہے۔۔ ایسے مسائل چونکہ فلسفیوں اور منطقیوں کی ذہنی ورزشیں ہوا کرتی ہیں لہٰذا ہر سیدھی مت والے دانشور نے ان سے اجتناب کا درس دیا۔ علامہ اقبال تو مایوسی کی حد تک ان مسائل سے متاثر ہوئے۔

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہو گا
مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب

غوث پاک کی ذات بابرکات کا اعجاز تھا کہ جب انہوں نے بغداد میں قدم رنجہ فرمایا تو ابلیس صفت علماء سو کے چراغ گل ہو گئے (ان کے طریقہ کار کی وضاحت بعد میں اپنے مقام پر آئے گی، یہی مسائل وفات غوث پاک کے ایک ڈیڑھ صدی بعد پھر بغداد میں پیدا ہوئے جب ہلاکو خان نے ساری بساط ہی الٹ دی) امام تقی الدین اپنی شہرہ آفاق تصنیف "روضتہ الابرار" میں رقم طراز ہیں کہ جب آپ نے بغداد میں داخل ہونے کا ارادہ فرمایا تو خضر علیہ السلام نے حکم خداوندی، غوث پاک کے گوش گزار کیا جس کی رو سے، سات برس تک فصیل شہر کے باہر، لب دریا آپ نے قیام فرمایا، یہی سات برس کا دورانیہ مجاہدات، ریاضات

شاقہ، فقر و فاقہ اور تحصیل علم لدنی کے اعتبار سے، سات زمانوں پر بھاری ہے۔ دریا کنارے اگنے والی سبزیوں سے غذا حاصل کرتے رہے جس سے جسم و جان والا رشتہ تو برقرار رہا مگر گردن سے سبز رنگ جھلکنے لگا۔ اسکے علاوہ جن آزمائشوں سے ان کو گزرنا پڑا چشم تصور و احساس سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک شب غوث پاک درود و ظائف میں مشغول تھے کہ ایک سراپا حسن جہاں سوز دوشیزہ اپنے نسوانی ہتھیاروں سے مسلح ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ یہ ایسا ابلیسی وار تھا جس سے بچنا پیغمبری شان کے مترادف تھا۔ یوسف بھی اس آزمائش سے گزرے تھے۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن میں ان کی سلامتی کو "برہان ربی" سے مشروط کیا گیا ہے۔ اگر وہ خدا کے برہان نہ دیکھتے تو ظلم کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑتا جس کے تصور ہی سے ہر مومن کا دل کانپ کانپ جاتا ہے۔

"خاتون بے حیا تو کون ہے اور یہاں تیرا کیا کام؟" غوث پاک نے قہر آلود نگاہوں سے حسن جہاں سوز سے پوچھا۔ "یہ بھول جائیں کہ میں کون ہوں، میں تو آپ کی تشنگی مٹانے آئی ہوں" اس دوشیزہ نے تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا۔ ساری بات پل بھر میں صاف ہو گئی۔ دوشیزہ کا مخاطب بھی کوئی معمولی انسان نہ تھا، مادر زاد ولی تھا اور ولی بھی ایسا جو اپنی مثال آپ تھا۔ "اچھا تو تم دنیا ہو جو ابلیس امین سے مسکوٹ کرنے کے بعد مجھے یاد الٰہی سے غافل کرنے آئی ہو" غوث پاک نے صورت حال کی وضاحت کر دی "مگر محترمہ، میرا جواب بھی وہی ہے جو میرے جد اعلیٰ علی المرتضیٰ کا تھا، میں تمہیں تین طلاق دے چکا ہوں۔ اب میری نظروں سے دفع دور ہو جا ورنہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ذبح کر دوں گا" یہ سننا تھا کہ وہ سجی سنوری دوشیزہ، روتی پیٹتی غائب ہو گئی۔ واپس جاتے وقت اس کی صورت اتنی مکروہ تھی کہ اگر ایک عام آدمی بھی اسے دیکھ پاتا تو سامان دنیا کو واقعی طلاق بائن (غیر رجعی) دے دیتا۔ آخر کار ایک شب ندائے غیبی نے مژدہ سنایا "عبد القادر! اب تم بغداد میں داخل ہو سکتے ہو"۔

فصیل شہر سے باہر، لب دریا، سات برس تک قیام کی وضاحت کوئی دشوار مرحلہ نہیں، شہر کے اندر جو طوفان بد تمیزی بپا تھا اس کا قلع قمع کرنے کے لئے "سالار جیش" کی تربیت بے حد ضروری تھی تاکہ کہیں پائے استقامت میں لغزش نہ آجائے۔ غوث پاک نے آں حضرتؐ کے نقش پا پر چل کر جو فریضہ ادا کرنا تھا وہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

فصیل شہر سے باہر سات برس قیام والی روایت کی سچائی، زیر بحث نہیں، مناقب غوث کی مستند کتب میں یہ موجود ہے۔ بہرحال ارشاد رسالت مابؐ کے عین مطابق جیلان کا غریب الدیار مفلس طالب علم بغداد میں داخل ہوا اور مدرسہ نظامیہ میں اکتساب علم میں مصروف ہو گیا۔ اسے بغداد کی بلند مرتبہ یونیورسٹی کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہ ہو گی۔ کیسے کیسے یگانہ روزگار اساتذہ بیک وقت علم و آگہی کی قندیلیں روشن کئے بیٹھے تھے۔ درس گاہ کا گوشہ گوشہ بقعہ نور ہو رہا تھا۔ ادب و تفسیر کی بات چلتی تو پھر چلتی ہی رہتی۔ ابو زکریا تبریزی دنیائے ادب کا مہر پر تنویر تھا کہ

جب بھی اس کی بات چلی ہے
ساری ساری رات چلی ہے

کی منہ بولتی تصویر۔ فقہ و اصول کے آفتاب عالمتاب علی ابن تحصیل حنبلی اور ابو الحسن محمد بن قاضی ابو العل ی حنبلی پھر شیخ ابو الخطاب محفوظ الکلوذانی، مشائخ حدیث میں ابو البرکات طلحہ العقولی، ابو الغنائم محمد بن علی میمون الفرسی، ابو عثمان اسماعیل بن محمد الاصبہانی ابو طاہر عبد الرحمٰن، ابو غالب الباقلانی، ابو العزین محمد بن المختار الہاشمی اور ابو منصور عبد الرحمٰن القراز، گویا سارے عراق کی علمی شخصیات کا جھرمٹ تھا کہ بغداد کی اس درس گاہ کو فیض یاب فرما رہا تھا۔ بے شک مدرسہ نظامیہ مینار نور کا درجہ رکھتا تھا مگر جیلان کے سے دور افتادہ مقام سے روشن جبیں طالب علم نے جب اس چار دیواری میں قدم رکھا، در و دیوار نے اھلا" و سھلا" و مرحبا کہا۔ مگر افسوس، کوئی ایک حیوان ناطق آنے والے کس مقام و مرتبے کو پہچان نہ پایا۔ جس طرح دوسرے تہی داماں طالب علم چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے، اس دنیاوی بے سرو سامانی کو بھی تہ سنگ ہونا پڑا۔

فصلوں کی کٹائی کا موسم آیا تو حسب دستور طلباء دیہاتوں کی جانب نکل پڑے تاکہ اپنے اپنے مقدر کے مہر لگے، اناج کے دانے اکٹھے کر لائیں اور دوران تعلیم آتش شکم ٹھنڈی کرتے رہیں۔ کیسی ستم ظریفی تھی وہ جو غوث الثقلین کے مقام و مرتبے پر فائز ہونے والا تھا اسے بھی ان کاسہ گدائی والوں کا ساتھ دینا پڑا۔ بغداد کے نواحی گاؤں یعقوبا پہنچے تو ایک زمیندار شریف یعقوبی کی چشم حیران نے قوس قزاح کے رنگوں کو پہچان لیا۔ کرگسوں میں

شاہین کو پہچاننا اگرچہ کوئی حیرت انگیز کارنامہ نہیں پھر بھی شریف یعقوبی کو داد نہ دینا بخل سے کام لینے والی بات ہے۔

"فرزند! تمہارا نام کیا ہے اور کس خاندان کے روشن چراغ ہو؟" زمیندار نے اپنے تجسّس کی پیاس بجھائی۔ "بندے کو عبدالقادر کہتے ہیں اور خاندان کی عظمت کا اعتراف روزانہ پانچ مرتبہ کرہ ارض کے گوشے گوشے سے ہوتا ہے" طالب علم نے چونکا دینے والا جواب دیا۔

"بیٹا! نجیب الطرفین مردان خدا‘ دست سوال دراز نہیں کیا کرتے‘ زمانے کو دست نگر بناتے ہیں" زمیندر نے بڑی رسان سے کہا "اس گھرانے کے لوگ تو منگتوں کو سلطنتیں عطا کرتے ہیں‘ مگر شاید لوح محفوظ پر اسی طرح مرقوم ہے"۔

اس پل اس گھڑی کے بعد آپ نے درس گاہ کے اس دستور پر خط تنسیخ کھینچ دیا اور اناج حاصل کرنے والے طلباء کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ طالب علم کو دوسرے طلباء کی طرح بھوک ستاتی تھی اور وسائل سے دامن یکسر خالی تھا۔ یہ بھی تو جد اعلیٰ کے نقش قدم پر چلنا تھا کہ کائنات کا سب سے بڑا انسان‘ رحمت مجسم ﷺ گداؤں کو ہفت اقلیم کی دولتیں لٹانے والے کے اپنے گھر میں چولہا اکثر و بیشتر ٹھنڈا ہوا کرتا تھا جن کے مراتب بلند ہوں ان کی آزمائشیں بھی پہاڑوں ایسی ہوتی ہیں۔

"بھائی! ایک روٹی بطور قرض دے دیا کرو‘ قدرت ہوتے ہی قرض چکا دوں گا" ایک قریبی نان فروش سے آپ نے تنگ آ کر کہا۔ بات اس لب و لہجے میں کی گئی کہ ان پڑھ نانبائی کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔

"جان عزیز! جب چاہیں اور جو چاہیں لے جایا کریں" نانبائی آبدیدہ ہو گیا۔ آنسوؤں کی دھند کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ صاف دیکھنے والی ہستی کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح لرزاں لہجے میں مدعا گم ہو جاتا ہے اور الفاظ کا پیراہن نامناسب رہ جاتا ہے۔ کچھ عرصہ اس کشمکش میں گزرا۔ نانبائی کا قرض بڑھتا چلا گیا۔ اور غوث پاک کے تفکر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ قرض "صراف قدر" کی مہربانی سے ادا ہوا (وہ ہستی جو بطور خاص اولیاؤں کا قرض چکانے کے لئے منجانب اللہ مقرر ہوتی ہے) آپ کو ایک سونے کا ٹکڑا مہیا کیا گیا اور نانبائی کے قرض سے سبکدوشی ہوئی۔ جبیں نیاز سجدے میں جھک گئی اسی تنگی ترشی میں دو برس

گئے۔ بغداد میں خشک سالی کا دور دورہ ہوا۔ زمین بوند بوند کو ترسی‘ سبز پتے زرد ہو گئے۔ اشجار بے برگ و بار ہوئے۔ فصلیں جھلس گئیں اور قحط پھوٹ پڑا۔ اس زمانے میں آپ کا قیام محلّہ قطبیہ شرقیہ میں تھا (ایک روایت کے مطابق یہ واقعہ اس محلے میں پیش آیا اور آپ نے عبداللہ سلمی سے بیان فرمایا) تفصیل ملاحظہ ہو۔

تنگ دستی کے وہ ایام ایسے تھے کہ اشیائے خوردنی خواب و خیال ہو کر رہ گئیں۔ جسم و جان کا سلسلہ برقرار رکھنے کے لئے ان اشیا کی بہرحال ہر ذی روح کو ضرورت ہے۔ ایک شخص اچانک کاغذ کا ایک پرزہ آپ کو تھما کر چلا گیا۔ کاغذ میں کچھ رقم موجود تھی یہ گویا امداد غیبی والا ماجرا تھا۔ آپ نے اس رقم کا کھانا وغیرہ خریدا اور محلے کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ دل میں طرح طرح کے خیال اٹھ رہے تھے جن سے فصیل جاں سپرد اضطراب ہو گئی اور آپ نے قبلہ رو بیٹھ کر کھانے یا نہ کھانے کے متعلق غور و خوض فرمانا شروع کیا۔

سمت قبلہ سے رشتہ استوار ہوا تو یقین کامل تھا کہ غیب سے راہنمائی کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔ دیوار مسجد کے قریب ایک کاغذ دکھائی دیا جس کا وجود یقیناً" چند لمحے پہلے وہاں نہیں تھا آپ نے لپک کر اسے اٹھایا۔ کاغذ پر واضح حروف میں تحریر تھا "ہم نے کمزور مومنین کے لئے خواہش رزق پیدا کی تاکہ وہ بندگی کے لئے اس سے قوت حاصل کریں" آپ نے اپنا رومال اٹھایا کھانا اسی جگہ رہنے دیا۔ دو رکعت نماز ادا کی اور مسجد سے باہر آ گئے۔ آپ کی نگاہ میں صرف لفظ "کمزور مومنین" اہمیت کا حامل تھا۔ وسائل کی کمی مسائل کو جنم تو ضرور دیتی ہے مگر نگہہ غوث میں ایمان کی کمزوری کا وسائل سے اگر کوئی تعلق تھا تو وہ "تعلق معکوس" تھا یعنی وسائل کی کمی ایمان کی مضبوطی کا سبب ہونا چاہئے تھی نہ کہ اس سے برعکس۔

بغداد میں تحصیل علم کا یہ دورانیہ بڑا ہی صبر آزما تھا۔ مفلسی الگ سد راہ ہوتی۔ اپنے صبر و استقلال اور مجاہدے کے متعلق خود غوث پاک فرماتے ہیں "اس دوران جتنی مشقتیں میں نے برداشت کیں اگر پہاڑوں پر ڈال دی جاتیں تو وہ پارہ پارہ ہو جاتے۔ جب تکالیف میری برداشت سے باہر ہو جاتیں تو میں سربسجود ہو کر صدق دل سے تلاوت کرتا "فان مع العسر یسرا" ان مع العسر یسراہ" (بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے‘ بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے) پھر جب سجدے سے سر اٹھاتا تو سکون کی دولت سے مالا مال ہو چکا ہوتا۔ علم

فقہ حاصل کرنے کے دوران میں اکثر ویرانوں میں راتیں بسر کرتا۔ اونی لباس اور پاپیادہ کانٹوں پر چلنا پڑتا۔ درختوں کے پتے اور خود رو گھاس پھوس سے پیٹ بھر لیتا۔ لوگوں نے مجھے دیوانہ بھی قرار دیا کئی بار مجھے مردہ سمجھ لیا گیا"۔

ایک بار غوث پاک کو مسلسل بیس روز تک کوئی مباح شے میسر نہ آسکی جس سے آتش شکم کو ٹھنڈا کیا جا سکتا۔ مجبوراً آپ ایوان کسریٰ کے کھنڈرات کی طرف چل پڑے وہاں ایک اور ہی طرفہ تماشا آپ کا منتظر تھا۔ وہاں پہلے ہی چالیس اولیا (بعض روایات کے مطابق ستر) اسی جستجو میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر غوث پاک اپنی تکلیف بھول گئے اور واپس شہر کی جانب چل پڑے۔ فصیل شہر کے قریب ہی آپ کی ملاقات ایک آشنا سے ہو گئی جو آپ ہی کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ جیلان کا یہ باشندہ آپ کے گھر سے کچھ رقم لایا تھا جو ام الخیر نے ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھیجی تھی۔ غوث پاک نے سجدہ شکر ادا کیا اور اس رقم سے کھانے پینے کی اشیا خرید کر کھنڈرات میں مارے مارے پھرنے والے اولیاؤں کی دعوت کر ڈالی۔ یہ بات مستند ہے کہ غوث پاک کھانا کھلانے کے عمل کو بہترین قرار دیا کرتے تھے۔

شہر سے باہر ویرانے میں ایک برج تھا جہاں آپ نے مسلسل گیارہ برس، شب و روز عبادت و ریاضت میں گزار دیئے۔ اس بناء پر اس برج کا نام ہی "برج عجمی" پڑ گیا۔ بھوک سے متعلق ایک اور واقعہ جو خود غوث پاک نے ابوبکر تمیمی سے بیان فرمایا وہ کچھ اس طرح ہے

"قیام بغداد کے دوران ایک روز میں بھوک کے مارے جاں بہ لب ہو گیا۔ چند روز تک جب بھوک مٹانے کی کوئی سبیل نہ ہو سکی تو میں مجبوراً دریا کے کنارے جا پہنچا تاکہ گری پڑی گھاس وغیرہ سے اس کا تدارک کر سکوں۔ وہاں مجھے چند لوگ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے نظر آئے۔ میں یہی سمجھا کہ وہ سب مجھ جیسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ مزاحمت کو نامناسب تصور کرتے ہوئے میں واپس آ گیا اور "ریحانین" کے بازار میں موجود مسجد میں جا پہنچا۔ اس وقت میں بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا مگر دست سوال دراز کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بھوک سے میری موت واقع ہو جائے گی۔ اچانک مجھے روٹی اور بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز مہک نے بے تاب کر دیا۔ ایک عجمی نوجوان یہ نعمت لے کر مسجد میں داخل ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ کر گوشت روٹی کھانے لگا۔ ایک بار تو بھوک کی شدت سے میرا منہ کھل گیا۔ پھر میں نے نفس کو ملامت کی زد پر رکھ لیا۔ اچانک وہ نوجوان میری طرف متوجہ ہوا "آیئے جناب بسم اللہ کیجئے" اس نے مجھے دعوت دی مگر میں نے انکار کر کے اپنے نفس کو ایک اور کوڑا رسید کیا۔ اس نوجوان کا اصرار بڑھتا ہی چلا گیا تو میں نے اس کی دل شکنی کو ناپسند کرتے ہوئے اس کی دعوت قبول کر لی۔

"آپ کا شغل کیا ہے؟" اس شخص نے بر سبیل تذکرہ مجھ سے پوچھا۔

"میں درس گاہ نظامیہ میں علم فقہ کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"آپ کس غرض سے بغداد تشریف لائے ہیں" میں نے بھی اس کا احوال دریافت کیا۔

"غرض تو جو تھی سو تھی، آج کل مجھے عبدالقادر جیلانی کی تلاش ہے، مگر اس شہر ناسپاس میں، میں خود گم ہو کر رہ گیا ہوں" اس نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کا مطلوبہ شخص میں ہی ہوں، میرا ہی نام عبدالقادر ہے" میں اس حسن اتفاق پر حیران رہ گیا۔ میرا جواب سن کر اس شخص کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پھر اس نے اپنی روداد رنج و الم بیان کی۔

"[illegible] جب میں آپ کی تلاش میں بغداد پہنچا تو میرے پاس تین روز کا زاد راہ

موجود تھا مگر میں آپ کی تلاش میں ناکام رہا تو مزید تین روز آپ کو‘ بھوکا پیاسا تلاش کرتا رہا۔ میرے پاس آپ کی کچھ رقم بطور امانت موجود تھی مگر اس سے خرچ کرنے کا تصور بھی میرے لئے سوہان روح تھا۔ آخر میری کیفیت اس حد تک دگرگوں ہو گئی جہاں شریعت لقمہ حرام کو بھی جائز قرار دے دیتی ہے۔ تب میں نے آپ کی رقم سے یہ روٹی سالن خریدا‘ للٰہذا یہ آپ ہی کا مال ہے‘ اطمینان سے شکم سیر ہو کر کھایئے اور مجھے اپنا مہمان تصور کیجئے" پھر وہ شخص امانت میں خیانت کے ارتکاب پر مجھ سے معذرت طلب کرنے لگا۔

غوث پاک کی حیات طیبہ کے یہ واقعات بالتفصیل دو وجوہات کی بنا پر بیان کئے گئے ہیں۔ پہلی یہ کہ آج کے طلباء اشیا کی فراوانی سے نگاہیں ہٹا کر صرف ایک پل کے لئے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھ سکیں اور اندازہ لگائیں کہ تحصیل علم کے لئے کن مصائب کا سامنا کر کے مقام مرتبے پر فائز ہوا جاتا ہے۔ علم دین حاصل کرنے والے طلباء بھی اس سے مستثنٰی قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ سنت رسولؐ کی اتباع میں سرمہ لگانا تو وہ ہرگز نہیں بھولتے مگر جہاں ذرا سی تنگی ترشی کا سامنا ہوا‘ جھٹ قرض حسنہ کا کشکول لئے ادھر ادھر بھاگنے لگتے ہیں اور دعوئ اتباع رسولؐ کا یا ان کے غلاموں کی پیروی کا کیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ اس بات کا احساس دلانا ہے کہ وسائل کی فراوانی کسی زمانے میں بھی‘ کسی جگہ مقام زمانہ تقرب الٰہی کی دلیل نہیں رہی بلکہ وجہ آزمائش و ابتلا ضرور رہی ہے۔ اس دور ابتلا کا زمانہ برسوں پر محیط ہے۔ فاقہ مستیاں رنگ لاتی رہیں مگر علم و آگہی پر‘ عمر عزیز چوبیس برس کی ہوئی تو 494ھ میں درس گاہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ دستار فضیلت باندھی گئی تو پورے بغداد میں مروجہ علوم کے لحاظ سے کوئی ہم پلہ نہ تھا۔ فخر و انبساط کا حق تھا‘ تمکنت روا تھی مگر کھنکتی ہوئی نیک مٹی سے خمیر اٹھایا گیا ہو تو فخر و تمکنت کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ ادھر میدان عمل میں قدم رکھا تو ایک طوفان بدتمیزی اپنی لپیٹ میں لینے کو بے قرار نظر آیا۔ بغداد کے کوچہ و بازار میں فروعی مسائل پر مناظرے کشتی گاہوں میں دنگلوں ہی کے انداز میں انعقاد پذیر ہوتے۔ دلائل کے خنجروں سے ایک دوسرے کو قائل و گھائل کیا جاتا۔ کہیں معتزلہ‘ عقل کی اپسراؤں کے ناز اٹھا رہے ہیں‘ کہیں رافضیت و شیعیت دست و گریباں‘ خلق قرآن کا مسئلہ الگ تھا۔ محدثین اپنے نکات ہائے فکر کی ترویج و ترقی میں کوشاں‘ غوث پاک کو محسوس ہوا جیسے اس طوفان میں گھر گئے تو سلامتی ایمان کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ان کے

سامنے دو راستے تھے۔ یا تو پوری تن دہی سے طوفان کا مقابلہ کرتے یا کترا کر نکل جاتے۔ حیران کن بات یہ ہوئی کہ آپ نے مؤخر الذکر پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کیا مگر اس کی وضاحت سے پیشتر اس وقت زیر بحث موضوعات کا مختصر تعارف بے حد ضروری ہے تاکہ سیاق و سباق کے تناظر میں صورت حال کی وضاحت ہو سکے۔

اسلام میں فرقہ بندی کا آغاز شیعہ خوارج سے کیا جاتا ہے جن کی بحث و تکرار کا تعلق عقائد کی بجائے آئین و سیاست سے تھا۔ دوسری صدی ہجری میں ان جماعتوں نے اپنے اپنے عقائد مرتب کئے۔ خالص عقائد کی بناء پر پہلی گروہ بندی واصل بن عطا کی ذہنی کاوش کا شاخسانہ تھا۔ یہ زمانے بھر کا چرب زبان شخص خواجہ حسن بصری کا شاگرد خاص تھا۔ مسئلہ جبر وقدر پہلا نزاعی مسئلہ تھا جس کی آڑ میں بنو امیہ خاندان نے اپنے مظالم کے جواز میں دلائل مہیا کئے۔ "ہر چیز جب منجانب اللہ ہے تو انسان مجبور محض ہوا لہٰذا ہماری طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں کی جا سکتی اگر ایسا کر بھی دیا جائے تو ہم گناہ گار نہیں ہو سکتے"۔

خواجہ حسن بصری کا حلقہ درس مذہبی اور فلسفیانہ بحث و تمحیص کا مرکز تھا مگر آپ اہل سنت والجماعت کا مسلک معتدل یعنی بین الجبر والاختیار کی تشہیر فرماتے جو حکام وقت کے سراسر خلاف تھا۔ حکام وقت انسان کو مجبور محض خیال کرتے لیکن اس کے برعکس واصل بن عطا انسان کو مختار مطلق تصور کرتا تھا۔

استاد و شاگرد کے درمیان اختلاف کی یہ خلیج اتنی وسیع ہوئی کہ واصل نے اپنا حلقہ درس الگ کر لیا اور عربی لفظ "اعتزلن" (ہم الگ ہوتے ہیں) سے فرقہ معتزلہ معرض وجود میں آیا۔

معتزلہ خالص عقل پرست تھے حتیٰ کہ روایت کو بھی عقل کی کسوٹی پر تولتے پرکھتے لہٰذا محدثین سے ان کا ٹکراؤ ناگزیر تھا جن کے نزدیک دین کی اساس ہی نقل و روایت پر تھی پھر یوں ہوا کہ یونانی فلسفہ جب عربی لباس پہن کر تشریف لایا تو معتزلہ نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس طرح تین گروہ واضح طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ یعنی خواجہ حسن بصری کا اتباع کرنے والے یا ہم خیال۔ روایت عقل اور وجدان میں توازن کے حامل معتزلہ عقل پرست اور محدثین روایت پرست۔ محدثین نے جب گناہ گار پر انعام اور بے گناہ کو سزا دینے کو ممکن قرار دیا تو معتزلہ نے اسے خلاف عدل ثابت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اہل عمل بھی کہنا

شروع کیا۔

محدثین نے کہا کہ اشیا میں کوئی شے فی نفسہ اچھی بری نہیں ہوتی نگہ شریعت میں وہ اچھی بری ہوتی ہے۔ معتزلہ نے اس کی سخت مخالفت کی۔ یعنی چیزیں اپنی اصل میں اچھی بری ہوتی ہیں اور شریعت سود مند اشیا کا حکم دیتی اور نقصان دہ سے گریز کی تلقین کرتی ہے۔ اور بھی اختلافات تھے مگر سب سے بڑا اختلاف ''خلق قرآن'' کا تھا۔ معتزلہ کے ہاں قرآنی الفاظ حادث اور نوپیدا ہیں اور قرآن مخلوق۔ لہٰذا کل نفس ذائقہ الموت کے تحت قرآن بھی تلخی موت چکھے گا یعنی مٹ جائے گا۔ محدثین نے اسے پرلے درجے کی جہالت قرار دیا انہوں نے کہا قرآن کلام خداوندی ہے اور کلام صفت الٰہی ہے۔ صفات الٰہی قدیم اور غیر مخلوق ہیں لہٰذا قرآن غیر مخلوق ہوا۔

اس فتنے کو اصل عروج مامون الرشید کے عہد خلافت میں ہوا۔ وہ خود عقیدۃ ''معتزلی تھا۔ اور یونانی فلسفہ اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس نے حکم جاری کر دیا کہ قرآن کو مخلوق ہونا تعلیم کیا جائے اور یہ کہ قرآن کو غیر مخلوق کہنا شرک ہے۔ مامون کے بعد اس کا بیٹا مستعصم باللہ بھی باپ کے نقش قدم پر چلا مگر امام احمد بن حنبل ان ملحدانہ عقائد کے سامنے دیوار چین بن کر کھڑے ہو گئے۔ مستعصم اس زمانے میں طرطوس میں مقیم تھا۔ امام احمد بن حنبل کو پابہ زنجیر طلب کیا گیا۔ عذاب زنداں میں کوئی نسبت علمی کام آئی نہ رشتہ آگہی۔ سب حوالے دھواں ہوئے۔ امام کی پشت پر کوڑے لگانے کا انداز یہ تھا کہ ہر دو کوڑوں کے بعد دست ستم تبدیل کر دیا جاتا اور تازہ دم جلاد' میدان میں مشق ستم فرمانے اترتا۔ اقلیم فراست میں سزا کوئی دلیل نہیں ہوا کرتی لہٰذا امام موصوف کے پائے استقامت میں لغزش نہ آسکی۔

امام احمد بن حنبل' امام شافعی کے مایہ ناز شاگرد تھے۔ ان کے نزدیک احکام شرعیہ کا مبنی بر مصلحت ہونا یعنی عقلی مصلحت کے عین مطابق ہونا ضروری نہیں تھا۔ انہوں نے تو اپنے استاد کے ''قیاس در فقہ'' کو بھی کم سے کم کر کے فقہ کو روایت پر منحصر کر دیا اور قیاس کو کتاب و سنت کی تفہیم و تعبیر کے لئے ناقص قرار دیا۔ ابتدا میں امام موصوف تصوف اور ارباب تصوف کے مخالف تھے بعد میں حارث محاسبی کی صحبت میسر آئی تو تصوف کے قائل و گھائل ہو گئے۔ اس حنبلی مسلک کی تعلیم شیخ عبدالقادر جیلانی نے اپنے اساتذہ سے حاصل کی اور اسی کے مطابق غنیتہ الطالبین زمانہ طالب علمی کے فوراً'' بعد تصنیف فرمائی جو ایک عام حنبلی

عقائد کے حامل انسان کا دستور زندگی ہے۔ معرفت خداوندی کو بھی حنبلی عقائد کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا دلچسپ ترین حصہ مسلمانوں میں تہتر فرقوں کے عقائد پر تبصرہ وغیرہ ہے۔

اسلام میں شریعت یعنی زندگی بسر کرنے کے ظاہری قوانین اور طریقت میں پہلا اختلاف سیدنا عثمان کے عہد خلافت میں پیدا ہوا۔ امیر معاویہ اور ان کے رفقاء پر کثرت دولت کی فراوانی سے چند ناپسندیدہ اشیا حاوی ہونا شروع ہوئیں۔ مثلاً نام و نمود کی نمائش، مفاد پرستی، سطحیت۔ جناب ابوذر غفاری نے ان پر اعتراض کیا۔ امیر معاویہ نے از روے شریعت اپنا دفاع کیا۔ معاملہ سیدنا عثمان غنی کی خدمت میں پیش ہوا تو امیر معاویہ اپنا موقف واضح کرنے میں زیادہ کامیاب و کامران ہوئے اس طرح ابوذر غفاری گوشہ نشین ہو گئے مگر ان کی جگائی ہوئی جوت دلوں کو روشن کرتی رہی۔

شریعت اور طریقت میں دوسری بار واضح ٹکراؤ جنابہ رابعہ بصریہ کے عہد میں ہوا۔ انہوں نے جزا و سزا کے تصور کو جو، خوف اور لالچ کے محدود حصار میں مقید ہو چکا تھا۔ محبت کی وسیع و عریض اور مضبوط بنیاد فراہم کی۔ محبت کے بحر بے کراں میں تمام تلخ جذبے خود بخود ڈوب گئے۔ طریقت کا یہ پہلو بڑا روشن بڑا دلکش اور من موہنا تھا۔ تیسری بار یہ اختلاف کھل کر اس وقت سامنے آیا جب حضرت جنید بغدادی نے درس گاہ کے عین سامنے در خانقاہ کھولا اور اسرار و رموز کے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔ طریقت کے حسن جہاں سوز کا مقابلہ اس کے سوز و گداز کا سامنا، شریعت کی "درشتی" کے بس کی بات نہ تھی لہٰذا اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

رہی سہی کسر امام غزالی نے اس وقت پوری کر دی جب درس گاہ نظامیہ کی صدر مدرسی کو لات مار کر وہ حلقہ درویشاں میں جا بیٹھے۔ پھر جب لوٹے تو تصور کو دینی اور فقہ کو دنیاوی علم قرار دے کر وسعت اختلاف کو ناقابل عبور بنا دیا۔

ایک اور گروہ بھی بغداد میں بڑا طاقت ور تھا۔ ان کے خیال میں سیاسی اور روحانی پیشوائی پر صرف اور صرف ایک خاندان کا حق ہے اور رہے گا۔ یعنی شیعیت۔ اس عقیدے کی ابتدا بنو امیہ کی سیاسی بالادستی کے خلاف جدوجہد کے دوران ہوئی۔ بنو ہاشم کے افراد نے جب اس کا آغاز کیا تو اپنے فضائل کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس

استحقاق کا رنگ غالب آتا گیا اور پھر افکار و عقائد کا پورا نظام وجود میں آ گیا۔ یہ سنجیدہ کوشش میمون القداح نے فرمائی جو محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق کا اتالیق تھا۔ میمون القداح سے پیشتر شیعیت کے مخصوص عقائد کا وجود کہیں نہیں ملتا۔ حد یہ کہ بنوامیہ کے خلاف بنوفاطمہ اور بنو عباس کی مشترکہ جدوجہد میں بھی بنوامیہ کے خلاف شدید نفرت کے سوا کسی نظام عقائد کا پتہ نہیں چلتا اور بنو عباس نے بھی بر سر اقتدار آکر سنی عقائد ہی کا اظہار کیا۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے جب عملی دنیا میں قدم رکھا تو مصر پر باقاعدہ شیعیت کی شاخ اسماعیلیوں کی حکمرانی تھی اور ان کی نزاری شاخ، جو خوف و دہشت کا نشان تھی اکابرین اہل سنت کے سر قلم کرنے میں مصروف تھی۔ اس طاقت کی موجودگی سے بغداد میں رافضیت و شیعیت کو تقویت مل رہی تھی۔ ان معروضی حالات کی بنا پر غوث پاک کو سلامتی، ایمان کی فکر دامن گیر ہوئی اور انہوں نے بغداد کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ پنچھی اور درویش دونوں سفر کی تیاری وغیرہ میں وقت برباد نہیں کرتے، بس ارادہ کیا، پر سمیٹے اور چل دیئے۔ حضرت شیخ نے بھی قرآن بغل میں دبایا اور چل دیئے۔ فصیل شہر کا دروازہ عبور کرنے لگے تو ندائے غیبی پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

"عبدالقادر! خلق خدا سے منہ موڑ کر خالق کو کن ویرانوں میں پاؤ گے؟" عجیب قسم کی گونج سماعت سے ٹکرائی۔ "مجھے خلق خدس سے کیا لینا دینا، مجھے بس سلامتی ایمان درکار ہے" شیخ نے زیر لب دہرایا۔ "ایمان لٹنے کے مواقع ویرانوں میں بھی کم نہیں ہوتے، خلق خدا کو محروم فیض نہ کر، بغداد میں تیرا ایمان سلامت رہے گا"۔

غوث پاک کی ہمت جواب دے گئی اور ترک بغداد کا خیال دل سے نکل گیا مگر افسردگی تھی کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اتنا کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی اندر کی آنکھ بصیرت کو ترس رہی تھی۔ ظاہری علوم سے فصیل جان کا گوشہ گوشہ منور تھا مگر پھر بھی تاریکی کا احساس پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ بازار سے گزر رہے تھے کہ کسی نے دریچہ کھول کر صرف ایک جھلک دکھلائی "عبدالقادر کل کیا معاملہ درپیش تھا" نورانی بزرگ نے یہ کہہ کر دریچہ بند کر لیا اور جلوگی سے بھی محروم کر دیا۔ حضرت شیخ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے اور کوشش بسیار کے باوجود دریچے کو تلاش نہ کر سکے۔ بند دریچہ بے شک نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر چہرہ گداز دل پر نقش ہو چکا تھا۔ آخر زمینی چہرہ تھا کوئی آسمانی مخلوق نہ تھی۔ غوث پاک نے سراغ پا ہی لیا۔

یہ تھے شیخ حماد الدباس بن مسلم، پیر طریقت اور حضرت شیخ کے استاد اول، جنہوں نے آپ کو رہ عشق کا راستہ دکھایا۔ وہی راستہ جس کا آغاز اضطراب اور انجام سوختہ سامانی ہے۔ بحر عشق واحد سمندر ہے جو ساحل پر بھی اتنا ہی گہرا ہوتا ہے جتنا ساحل سے دور بیچ بھنور میں۔

شیخ حماد دمشق کی نواحی بستی رحبہ کے باشندے تھے۔ عرصہ دراز سے بغداد نقل مکانی کر آئے تھے۔ محلّہ مظفریہ میں خرمے کا شیرہ فروخت کرتے کرتے، شیرینی قلب تک رسائی حاصل کرلی۔ اہل دل میں ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ باطنی لذت سے آشنا ہونا ہوتا تو لوگ در حماد پر آ دستک دیتے اور لذت قلب و نظر سے سرور حاصل کرتے۔ سرد اور تاریک رات میں زمستانی ہوا دو دھاری تلوار کی طرح کاٹ رہی تھی جب آپ شیخ حماد کے در دولت پر حاضر ہوئے۔

تمام مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ شیخ حماد دباس بن مسلم میں، زہد و طریقت اور مکاشفے کا کوئی ایک بھی وصف نہ ہوتا جب بھی ان کے مقام و مرتبے کے لئے غوث الاعظم کا استاد ہونا ہی کافی ہے۔ یہ تو رب کائنات کا کرم ہے جو مرتبہ جس کو عطا کردے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

بہرحال کوئی بدبخت ہی اس سے انکار کی جرات کر سکتا ہے ورنہ عبدالقادر جیلانیؒ کا استاد ہونا عظمت کی ایسی دلیل ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ حماد کا شمار اس دور میں بھی علما راسخین میں ہوتا تھا۔ شاگردان رشید کو علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ کرنے میں ان کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ شیخ ابو الوفا تک آپ کے اقوال زریں بصد احترام سنا کرتے تھے۔ کشف و کرامت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ ایک بار امیر شہر گھوڑے پر سوار نشے کی حالت میں سر پر غرور بلند کئے چلا آ رہا تھا، سامنے درویش بے ریا آگیا گویا تکبر اور خاکساری میں ٹکراؤ ہو گیا۔ امیر شہر کو لازم تھا کہ کترا کر نکل جاتا۔ مے نوشی اور رندی کا بھرم رہ جاتا مگر وہ اقتدار کے گھوڑے پر سوار تھا۔ پاپیادہ درویش کو کیسے خاطر میں لا سکتا تھا۔ ادھر اس کی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یہ گویا گناہ پر اترانے والی بات تھی۔ شیخ حماد نے قہر آلود نگاہ ڈالی تو انسان کی بجائے حیوان متاثر ہوا۔ لہٰذا آپ نے گھوڑے ہی سے خطاب فرمایا "اے اللہ کی مخلوق اس متکبر امیر کو بہت دور لے جا" ادھر یہ الفاظ ادا ہوئے ادھر گھوڑا برق رفتاری سے بھاگا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اسپ تازی اور سوار کو زمین کھا گئی کہ آسمان

نگل گیا۔ چند روز بعد خود شیخ حماد نے یہ عقدہ حل کیا "وہ دونوں اس سرزمین سے بہت دور جا چکے ہیں۔ گھوڑا اسے جبل قاف کی دوسری جانب لے گیا ہے اور خدا کی قسم اب وہ امیر، یوم حشر کو اسی جگہ سے اٹھایا جائے گا"۔

ان کے زہد و تقویٰ کا یہ واقعہ تو بڑا مشہور ہے۔ ایک روز شیخ حماد معروف کرخیؒ کی زیارت کو جا رہے تھے ان کے کانوں میں کسی مغنیہ کی سریلی آواز آئی۔ آلات موسیقی کی سنگت بھی ساتھ ہی تھی۔ شیخ وہیں سے واپس ہو لئے۔ گھر پر آ کر اہل خانہ کو جمع کیا اور سنجیدگی سے دریافت فرمایا "آج مجھے کس گناہ کی سزا دی گئی ہے؟" پتہ چلا کہ اہل خانہ نے ایک برتن خریدا تھا جس پر تصویر کندہ کی ہوئی تھی۔ تقوے کی انتہا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی کوتاہی کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ مناسب اسباب کی فراہمی خود صاحب بندہ فرما دیتا ہے۔ دوسری ذہن میں رکھنے والی بات یہ ہے کہ جن کے مراتب بلند ہوں ان کی آزمائشیں بھی کڑی ہوتی ہیں۔ ہوا کے دوش پر اڑ کر آنے والی موسیقی کی ایک لہر ہی لٹیا ڈبو سکتی ہے۔ وہ پکڑنے پر آئے تو رائی برابر کوتاہی کی پاداش میں پکڑ لے لہٰذا بندے کو ہر وقت یہ احساس ہونا چاہئے کہ بخشش، اعمال کی بنا پر نہیں صرف اور صرف اس کی کرم نوازی کے نتیجے میں ہو گی۔

جے میں ویکھاں عملاں ولے گھ نہیں میرے پلے
جے ویکھاں میں رحمت تیری بلے بلے بلے

بقول شیخ حماد، تقرب الٰہی کا مختصر ترین راستہ "حب اللہ" ہے اور یہ محبت اپنی ذات کی مکمل نفی سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی فنا فی الذات ہونے سے۔ ایک بار خلیفہ مسترشد باللہ کا ایک غلام شیخ موصوف کی زیارت کو حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا "میں تمہیں قرب الٰہی سے مال مال دیکھ رہا ہوں۔ خلیفہ کی بندگی چھوڑ کر اللہ کی بندگی میں آ جا" اس بدبخت نے نہ صرف یہ کہ قول شیخ پر عمل نہ کیا بلکہ خلیفہ سے شکایتاً" سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ شاید وہ دربار شاہ میں سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ خلیفہ بھی عقل سے شاید پیدل ہی تھا اس نے بھی درویش کا مذاق اڑایا۔

وہی غلام ایک بار پھر آستانہ درویش پر حاضر ہوا تو شیخ حماد نے زیر لب مسکرا کر کیا "برخوردار! حکم خداوندی کے مطابق تیرا احوال سلب کیا جاتا ہے اور تمہیں مرض برص میں مبتلا ہو جانے کا حکم میں دیتا ہوں" ابھی آپ کا فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ وہ غلام برص میں مبتلا ہو گیا۔ حاضرین حیران و ششدر رہ تو تھے مگر کسی میں لب کشائی کی جرات نہ تھی۔ ادھر جب غلام دربار

خلافت میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے اطباء کو اس مرض کے علاج کا حکم دیا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہوا تو اطباء نے اپنی بے بھی کا اعتراف کرلیا اور یہ مشورہ بھی دیا کہ غلام کو فوراً محل سے نکال دیا جائے۔ غلام' چاروناچار شیخ حماد کے قدموں میں آگرا اور تقرب الٰہی کے حصول کی باتیں کرنے لگا۔ آپ نے اسے کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اپنی قمیض پہنائی۔ مرض پل بھر میں جاتا رہا مگر غلام کے دل میں خیال آیا ”مرض تو ٹھیک ہو گیا' حاکم وقت کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے۔ شاید پھر دربار شاہی میں جگہ مل جائے“ شیخ حماد نے اس کی دلی کیفیت سے آگاہ ہو کر انگشت شہادت سے اس کی پیشانی پر لکیر کھینچ دی۔ وہ حصہ از سر نو برص میں مبتلا ہو گیا۔

”یہ حصہ تجھے وعدہ خلافی سے باز رکھے گا“ شیخ حماد نے مسکرا کر کہا۔

شیخ حماد نے بلاد شام سے نقل مکانی کے بعد بغداد محلّہ مظفریہ میں سکونت اختیار کی تو بھ تاحیات وہیں کے ہو رہے۔ 525ھ میں سر آخرت اختیار کیا۔ مزار مقدس قبرستان ” شونیزیہ“ میں ہے۔

سرد اور تاریک رات جب غوث پاک شیخ حماد کے در دولت پر حاضر ہوئے تو وہ عجیب سرد مہری سے پیش آئے۔ خادم کو حکم دیا ”دروازہ بند کر کے چراغ گل کر دو“ غوث پاک نے چراغ گل ہوتے دیکھا تو قدم روک لئے اور خانقاہ کے بند دروازے پر بیٹھ گئے۔ قلاند الجواہر از محمد یحییٰ تادئیؒ میں مرقوم ہے کہ تاریک سرد رات میں بند دروازے کے سامنے بیٹھے بیٹھے آپ کو بار بار اونگھ سی آجاتی اور سترہ بار غسل کی حاجت ہوئی۔ آپ فوراً اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے اور بند دروازے کے سامنے آکر بیٹھ جاتے۔ صبح حسب معمول در درگاہ کھلا تو آپ اندر داخل ہوئے۔ شیخ حماد نے فوراً اٹھ کر استقبال کیا اور معانقے کے بعد عجیب و غریب لہجے میں کہا ”نور نظر عبدالقادر! جو مقام و مرتبہ آج میرا ہے وہ کل تمہارے سپرد ہونے والا ہے۔ جب ساری نصیحتیں تمہیں حاصل ہو جائیں تو اس بوڑھی دنیا کی پرانی ہڈیوں کا خیال بھی رکھنا اور انصاف سے بھی کام لینا“ اور اس کے ساتھ ہی شیخ حماد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اب خدا جانے ان اشکوں کی نوعیت کیا تھی۔ خوشی کے آنسو تھے کہ مقام و مرتبے میں پیچھے رہ جانے کا خیال۔ بہرحال شاگرد کا یہ استقبال منفرد نوعیت کا ضرور تھا۔

شیخ حماد کی زیر تربیت سلوک کی منازل طے کرنا شروع کیں تو ان کی لذت ہی کچھ اور تھی۔ ہر طلوع ہونے والا سورج آپ کو نئے مقام پر فائز دیکھتا اور جب شام ڈھلے صف لپیٹ کر غروب ہوتا تو آپ نئے مقام پر ہوتے۔ پرانی منزل قصہ پارینہ بن چکی ہوتی۔

شیخ حماد کا رویہ بعض اوقات بڑا ہی تلخ بڑا دکھ دینے والا ہو جاتا مگر آپ کی جبیں نیاز پر ناگواری کی شکن تک نمودار نہ ہوتی۔ دیکھا دیکھی راہ سلوک کے دوسرے مسافر بھی آپ کا مذاق اڑانے لگے۔ قرآن و حدیث' فقہ اصول و فروع کے بحر بے کنار میں آپ پہلے ہی غوطہ زنی فرما چکے تھے یہ صفات دوسروں کی نگاہوں میں عیوب کا روپ دھار گئیں۔

"تم فقیہ ہو' بزم درویشاں میں تمہارا کیا کام؟" طنزو تضحیک کے تیروں سے سینہ چھلنی کیا جاتا۔ آپ صرف استاد مکرم کی نظر التفات کے تمنائی رہتے اور طنزو تضحیک کو خندہ پیشانی سے برداشت کر جاتے۔ آخر ایک روز شیخ حماد چھلک پڑے اور تیر برسانے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "تم لوگ بصارت و بصیرت دونوں سے محروم ہو' اس ہما کی بلند پروازی کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے' میں اسے آزمائش کی چکی میں پیس رہا ہوں تم لوگ اپنی زبانوں کو لگامیں دو ورنہ نہ زبانیں ہوں گی نہ لگامیں"۔

شاگردان حماد اپنے رویے پر شرمسار ہوئے۔ فصیل شہر سے باہر ایک ویرانے میں "برج عجمی" کی شہرت ہوئی۔ اس برج میں آپ نے برس ہا برس مجاہدے و ریاضت کی انتہا کر دی۔ آپ چوں کہ عجمی تھے لہٰذا زہاد نے اس برج کو آپ کے نام سے موسوم کر دیا۔ عراق کے ویرانے' غوث پاک کے پائے استقامت پر ورطہ حیرت میں ڈوب ڈوب جاتے۔ عرفان ذات کی منزل میں آپ نے بھوک کو بھوکا مار دیا اور پیاس کو تشنہ لب تڑپایا۔ نیند کو گہری نیند سلا دیا اور بیداری کی ہر حس کو بے دار کر دیا یہ محنت ریاضت پر خلوص طلب کی انتہا تھی۔

چشم فلک نے ایسی شدت طلب نہ دیکھی نہ سنی۔ پھر حب اللہ کا وہ مقام بھی آیا جہاں صاحب بندہ' بندے کے ناز اٹھاتا ہے۔ ایسا تو ایک روز ہونا تھا۔ انسانی قوت ارادی کی انتہا کیا ہے؟ جہاں تک تصور کی پرواز ممکن ہے اور پھر معراج مصطفیٰؐ نے تو شہناز تخیل کی انتہا کو بھی غلط ثابت کر دکھایا اور یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی رسائی وہاں تک ممکن ہے جہاں تصور کے بھی بال و پر جل جائیں۔ غوث پاک جب نقش پائے رسالت ماب کی اتباع فرمانے لگے تو سینے میں قلب سلیم دھڑکنے لگا (وہ دل جس میں تقویٰ' ایمان اور عرفان تینوں بیک وقت سما جائیں)

اس مقام پر "الست" کی نازش اور "بلا" کا نیاز دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور نازبرداریاں اسی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں "ایک بار میں نے پروردگار سے عہد کیا کہ اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں گا جب تک کوئی مرد صالح خود میرے منہ میں لقمے نہیں ڈالے گا" (یہ اس بے نیاز سے نازبرداری نہیں تو اور کیا ہے) مسلسل چالیس روز گزر گئے میں اپنے موقف پر قائم رہا۔ چالیس روز بعد ایک شخص آیا اور میرے سامنے انواع و اقسام کے کھانے رکھ کر چلا گیا۔ میرا نفس الجوع، الجوع (ہائے بھوک، ہائے بھوک) پکارنے لگا مگر میں نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ اسی اثنا میں ابو سعید مخزومیؒ ادھر آنکلے اور اپنی فراست باطنی سے یہ "شور" سن کر میرے قریب آگئے اور مجھ سے پوچھا "اے عبدالقادر یہ شور کیسا ہے؟" میں نے جواب دیا "یہ اضطراب نفس کا شور ہے مگر میری روح یاد الٰہی میں مطمئن ہے لہٰذا شور نفس کی مجھے چنداں پرواہ نہیں"۔

"میرے غریب خانے پر چلو" انہوں نے یہ فرمایا اور چلے گئے۔ میں نے دل میں ایک اور شرط عائد کر دی کہ جب تک کوئی خود لے کر نہ جائے میں ہرگز نہ جاؤں گا" میں اسی خیال میں تھا کہ خضر علیہ السلام تشریف لائے اور مجھے حضرت ابو سعید کے گھر لے گئے۔ شیخ موصوف دروازے میں کھڑے ہمارے منتظر تھے مجھے دیکھ کر فرمانے لگے "عبدالقادر کیا میرا کہنا کافی نہ تھا کہ خضر علیہ السلام کی ضرورت پیش آگئی" پھر وہ مجھے اپنے گھر میں لے گئے اور میری شرط کے عین مطابق اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں لقمے ڈال ڈال کر مجھے کھلانے لگے"۔

یہ واقعہ ناز و نیاز پر دلالت کرتا ہے اس میں عقلی دلائل یا وجوہات وغیرہ بیان کرنا پرلے درجے کی جہالت ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے

کشادہ دست کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

بعد ازاں تو غوث الاعظم اس مقام و مرتبے پر بھی فائز ہوئے جہاں وہ سارے جہاں کو کھلانے کے قابل ہو گئے۔ یہ بھی صاحب بندہ کی کرم نوازی تھی۔ سیدنا غوث الاعظم خلیفہ مستظہر باللہ کے عید خلافت میں بغداد تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے تیئس برس میں تکمیل ظاہری و باطنی کے بعد انہیں "محی الدین" کے مقام پر فائز کر دیا اس کے متعلق بھی انہوں نے

جو ارشاد فرمایا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

"511ھ میں ایک جمعہ کے روز میں سفر سے پا برہنہ سوئے بغداد آ رہا تھا کہ مجھے ایک ناتوان بیمار شخص دکھائی دیا۔ نقاہت سے وہ جان بہ لب دکھائی دے رہا تھا۔ "السلام وعلیک یا عبدلقادر" اس نے مجھ سے کہا۔ میں نے سلام کا جواب دیا تو وہ کہنے لگا "مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ" میں نے اس کی خواہش پوری کی تو پل بھر میں اس کے چہرے پر رونق آگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا لاغر جسم بھی خوب موٹا تازہ ہو گیا۔ میں حیرت زدہ ہوا تو وہ شخص مسکرا کر کہنے لگا" میں آپ کے جد پاک کا دین ہوں جو قریب المرگ ہو چکا تھا اب اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے مجھے از سر نو زندہ کر دیا ہے لہٰذا آپ "محی الدین" ہیں۔ اس کے بعد جب میں جامع مسجد کی حدود میں داخل ہوا تو ایک شخص نے مجھے جوتا پہنایا اور پہلی بار یا سیدی محی الدین کے نام سے پکارا۔ نماز جمعہ کے اختتام پر لوگ امڈ امڈ کر میری طرف آنے لگے اور محی الدین یا محی الدین پکار پکار کر میرے ہاتھوں کو بوسے دینے لگے۔ حالانکہ اس سے پیشتر مجھے کبھی بھی کسی نے اس نام سے نہیں پکارا تھا"۔

مناقب غوث پاک کے سلسلے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی شرح مشکوٰۃ شریف میں یوں رقم طراز ہیں "اسلام ظاہری اعمال کا نام ہے اور ایمان باطنی اعتقاد کا اور "دین" ان دونوں کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ گویا دین وہ جامع نظام ہے جو بنی نوع انسان کے عقائد و اعمال، ظاہر و باطن، صورت و معانی، روحانیت اور جسمانیت پر مشتمل ہے۔ ایسے نظام کا احیاء نبی، مرسل یا اس کے قابل ترین نائب کے بغیر ممکن نہیں۔ اگرچہ آں حضرتؐ نے ہر صدی کے سرے پر ایسی ہستیوں کی نشان دہی فرمائی ہے جن سے تجدید دین کا فریضہ انجام پذیر ہوتا ہے مگر تجدید اور احیاء میں ایک نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مجددین کی فہرست میں ابتدا سے لے کر اس وقت تک بہت سے حضرات کے اسمائے گرامی پائے جاتے ہیں مگر "محی الدین" کا لقب کسی اور کو عطا نہیں ہوا۔ تاریخ اسلام کے مطالعے سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ احیائے دین کا اہم ترین فریضہ حقیقتاً" جناب غوث الاعظم کی ذات گرامی قدر ہی سے پایہ تکمیل کو پہنچا اور یہ عظیم الشان لقب صرف آپ ہی کے وجود مسعود پر صادق آتا ہے"۔

پچیس برس تک مسلسل غوث پاک نے عراق کے بیابانوں میں صحرا نوردی کی۔ مخلوق سے رابطہ منقطع رہا یہ مجاہدے کا دشوار ترین دور تھا۔ رجال غیب، جناب کو سلوک کی تعلیم

عطا فرماتے رہے ان کے علاوہ جناب خضر علیہ السلام ہمدم دیرینہ و محرم راز تھے۔ ان سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ غوث پاک ان کے کسی حکم کی مخالفت نہیں کریں گے۔ ایک مرتبہ خضر علیہ السلام نے کسی مقام پر بیٹھنے کا حکم دیا تو غوث پاک تین برس تک صبر و استقلال سے اسی جگہ مصروف عبادت رہے۔ سال میں صرف ایک بار خضر علیہ السلام تشریف لاتے اور مسرور و مطمئن ہو کر غائب ہو جاتے۔ "دنیا" بارہا مختلف روپ میں آ کر بہکانے کی کوشش کرتی رہی اور منہ کی کھاتی رہی۔ شیاطین بھی مہیب شکلیں اختیار کر کے آ دھمکتے مگر غوث پاک کے پائے استقلال میں سر مو فرق نہ آیا اور راہ سلوک میں خوف و خطر سے مکمل نجات مل گئی۔ نفس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب غوث پاک پر زمینی مسافت مختصر کی گئی۔ بلاد شُستر جو بغداد سے بارہ یوم کی مسافت پر تھا چند لمحوں میں زیر قدم ہوتا صورت حال یہ ہو گئی کہ دنیا بذات خود ایک پارسا عورت کے روپ میں اکثر و بیشتر ظاہر ہوتی اور حوصلہ دیتی "تجھے اپنے احوال پر تعجب کیوں ہے جب کہ تو عبدالقادر ہے" اسی زمانے میں شیاطین سے جنگیں ہوئیں جو آتشیں شعلوں سے لیس ہو کر حملہ آور ہوتے مگر ان کے شعلے انہی پر لوٹا دیئے جاتے۔ ورطہ حیرت میں ڈبو دینے والے واقعات رونما ہوتے رہے مگر غوث پاک ان مقامات سے بہت آگے نکل گئے اور مقامات حیرت و استعجاب بہت پیچھے رہ گئے۔

ایک روز ابلیس نے پینترا بدل کر وار کرنے کی سعی لا حاصل کی۔ وہ غوث پاک کی خدمت میں اشک ندامت بہاتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ ”آپ نے میری اور میرا ایتاع کرنے والوں کی جان عذاب میں ڈال رکھی ہے لہٰذا میں اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے آپ کا طوق غلامی زیب گلو کرنے آیا ہوں۔“

غوث پاک نے قہر آلود نگاہوں سے ”حریف آدم“ کو دیکھا اور پوری قوت سے طمانچہ مارنے کا ارادہ کیا مگر اس سے پیشتر ہی شیطان کہ منہ پر زناٹے دار تھپڑ لگا اور وہ غائب ہو گیا۔ یہ گویا خدائی حصار میں آنے کے مترادف بات تھی۔ پل بھر میں وہ پھر آ دھمکا۔ اس بار وہ آتشیں نیزے سے مسلح تھا۔ غوث الاعظم کی حسب منشاء ان کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ آ گئی جسے دیکھتے ہی حملہ آور کی ترکی تمام ہوئی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اس کے بعد ابلیس نے ایسا حملہ کیا جس سے وہ اکثر اولیاؤں کو بے سرو سامان کر چکا تھا۔ اس کا یہ وار بڑا ہی مہلک تھا۔

ایک اندھیری رات میں آپ بے آب و گیاہ صحرا میں مصروف عبادت تھے کہ اچانک آپ کو روشنی کی ایک لکیر دکھائی دی جس سے رفتہ رفتہ سارا آسمان منور ہو گیا۔ پھر ایک گونج سنائی دی۔ ”اے عبدالقادر! میں تیرا پروردگار ہوں اور تیری عبادت سے راضی ہو کر تجھے ہر قسم کی عبادت کی مشقت سے آزاد کرتا ہوں۔“ یہ ندائے غیبی سنتے ہی آپ نے اپنے ظاہری و باطنی علم کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا تو اس ”کرم نوازی“ کا جواز نظر نہ آیا آپ کو فوراً خیال آیا ”آں حضرتؐ ختمی مرتبت عمر بھر عبادت کے مکلف و پابند رہے‘ کیا یہ ممکن ہے کہ ان کے بعد کوئی شخص‘ عبادت سے آزاد کر دیا جائے“ یہ خیال آتے ہی آپ نے لاحول پڑھا تو روشنی کا وجود مٹ گیا۔ اب ابلیس اپنی اصل شکل و صورت میں غوث پاک کے سامنے آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا ”میں نے اس وار سے جانے کتنے عبادت گذاروں کو چت کر دیا مگر عبدالقادر آپ اپنے علم کے زور سے صاف بچ نکلے“ یہ داؤ پہلے سے بھی خطرناک تھا مگر ”محی الدین“ نے اس کی توڑ بھی پیش کر دی۔ آپ نے فرمایا۔ ”مردود‘ دفع ہو جا میں اپنے علم کے زور سے نہیں تائید الٰہی اور اس کی کرم نوازی کے سہارے تیرے دام تزویر میں نہ آ سکا“ یہ سن کر ابلیس نے اپنا سر پیٹ لیا اور مگرمچھ کے آنسو بہانے لگا۔

”عبدالقادر! آج میں واقعی تجھ سے مایوس ہو گیا“ ابلیس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا ”تم

پر وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے میں کوئی اور ہدف تلاش کروں۔"

"ابلیس لعین! یہ بھی تیرا فریب ہے" حضرت شیخ نے جوابی حملہ کیا "میں تیرے ہر فریب سے اپنے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔"

یہ شیطان کی ذلت آمیز شکست تھی۔ ادھر شیخ حماد اپنے شاگرد کے مراتب سے آگاہ تھے وہ بھی اپنا فرض ادا کر چکے تھے۔ لوح محفوظ پر لکھے کے عین مطابق تعلیم کر چکے تھے۔ ظاہری و باطنی علوم کی تکمیل ہو چکی تھی۔ مگر خرقہ پوشی کسی اور کے حصے لکھی جا چکی تھی۔ وہ ابو سعید مخزومی تھے جنھوں نے باب ازج پر خضر علیہ اور آپ کا استقبال کیا تھا اور اپنے ہاتھوں سے لقمے کھلائے تھے۔ غوث پاک کی کیفیت ان دنوں بحر زخار کی سی ہو رہی تھی ایک آتش فشاں تھا کہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ ظاہر و باطنی علوم گنبد سر میں مقید تھے اور رشد و ہدایت کے سوتے پھوٹ پڑنے کو بے تاب مگر ایک عجیب سی ناقابل فہم الجھن راستہ روکے کھڑی تھی۔ برابر دل کے تاروں میں الوہی نغمات بے قرار تو تھے مگر مضراب سے چھیڑنے کی نوبت ہی نہیں آ چکتی تھی۔ بار بار یہی خیال ستاتا کہ آپ عجمی ہیں اور لب کشائی کی صورت میں، فصحائے عرب کے سامنے شاید آپ کا چراغ نہ جل سکے۔ اکثر اوقات یہ خیال فصیل جاں کو سپرد اضطراب کر دیتا۔

مدرسہ نظامیہ، درس گاہ حماد، اب قاضی ابو سعید مکدومی گویا منزل شوق کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔ کوئی کسر رہ تو نہیں گئی تھی، ایک آدھ آنچ کی ہو تو ہو۔ شیبانی سے کلیمی تک پہنچنے والی بات تھی جس کے لئے پروردگار نے ابو سعید مخزومی کی صورت میں مناسب اسباب فراہم کر دیئے۔ مشاہدوں مجاہدوں کا آغاز ہوا۔ ابو سعید بحر طریقت کے غواص ہونے کے ساتھ ساتھ قاضی اور فقیہ بھی تھے فقہ و حدیث کی تعلیم کے لئے درس گاہ بھی تھی جس کی سربراہی اب حضرت شیخ کو سونپ دی گئی۔ درس و تدریس اور راہ سلوک کی منازل طے کرنا، دونو مشاغل ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ یہی وہ مدرسہ ہے جہاں آفتاب غوثیہ طلوع ہوا۔

500ھ میں اس درس گاہ سے رشتہ استوار ہوا اور 521ھ میں آپ نے عوام الناس سے خطاب کا آغاز فرمایا۔ گویا درس و تدریس کا سلسلہ 21 برس پر محیط ہے ویسے تو یہ شغل دم آخر تک جاری رہا مگر 521ھ کے بعد اولیت "خطاب" کو دی گئی اور ہفتے میں تین روز وعظ کے لئے مختص تھے۔

خرقہ پوشی کو مبارک گھڑی بھی آ پہنچی۔ یہ خرقہ معمولی گدڑی پر مشتمل نہ تھا بلکہ بارگاہ احدیت کی خاص عطا تھی۔ جو حضور اقدس کے وسیلے سے' ولی اول حیدر کرار تک پہنچا اور سلسلہ در سلسلہ صلحائے امت سے ہوتا ہوا ابو سعید مخزومی کی ملکیت میں آیا جس کا مستقل ٹھکانہ اب غوث الثقلین کی ذات بابرکات ہونے والی تھی۔ یہ رسم خرقہ پوشی بھی منفرد نوعیت کی حامل تھی۔ انفرادیت کے حامل ابو سعید مخزومیؒ کا فرمان ہے "میں نے عبدالقادرؒ کو خرقہ پہنایا اور انہوں نے مجھے' اس طرح ہم دونوں نے ایک دوسرے سے فیض حاصل کیا" یہ فرمان بذات خود سینکڑوں تبصروں پر بھاری ہے۔

4 شوال 521ھ نماز ظہر سے پہلے اس اضطراب کا مداوا بھی ہو گیا جس نے غوث الاعظم کو پابہ زنجیر کر رکھا تھا۔ یعنی فصحائے عرب کے مقابلے میں اپنی کمتر حیثیت کا احساس۔ افصحا الفصحاصلہ کی نظر کرم نے یہ عقدہ بھی حل کر دیا۔ حضرت شیخ کو حضور اقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ "فرزند! تم کلام کیوں نہیں کرتے؟" آں حضورؐ نے دریافت فرمایا۔

"میں ایک عجمی' فصحائے بغداد کے سامنے لب کشائی کی جرات کیسے کر سکتا ہوں" غوث پاک نے اپنا مسئلہ دربار رسالت میں پیش کیا۔

"فرزند اپنا منہ کھول" کائنات کی ساری رحمت مائل بہ کرم ہوئی غوث پاک نے منہ کھولا تو کائنات کی فصاحت و بلاغت کا رس ٹپکایا گیا حضور اکرم نے سات بار لعاب دہن سے سرفراز فرمایاں اور ساتھ ہی تلقین فرمائی "حکمت اور عظمت کے ذریعے لوگوں کو صراط مستقیم کی دعوت دیتے رہو"

جلوگی اختتام پذیر ہوئی تو غوث پاک پر وجدانی کیفیت طاری تھی جس کا آغاز' قوت مدرکہ کی انتہا کے بعد ہوتا ہے پل بھر میں کیا سے کیا ہو گیا' فصاحت و بلاغت نے خود کلام غوث پر ناز کیا۔ یہ وجدانی کیفیت کوئی پل دو پل نہ تھی۔ نماز ظہر کی ادائیگی تک جاری رہی۔

مدینۃ العلم کی نظارگی سے طاری ہونے والی وجدانی کیفیت اختتام پذیر ہوئی تو نئی لذت کا آغاز ہوا۔ یہ کیفیت' پہلی سے ذرا مختلف۔ تھی فصیل جاں کا رواں دواں کیف و سرور کے نئے انداز میں جھوم رہا تھا۔ باب العلم' جلوہ افروز ہوئے۔ علی المرتضے نے فرمایا "منہ کھولو" غوث پاک نے تعمیل ارشاد کی تو باب العلم نے چھ بار لعاب دہن سے سرفراز فرمایا۔ غوث پاک کی کیفیت "ھل من مزید" والی ہو رہی تھی۔ عطا کی انتہا تھی تو شدت طلب بھی شمار و

قطار سے باہر تھی۔

"حضور! سات بار سرفراز نہیں فرمائیں گے؟" عبدالقادر جیلانیؒ نے سوال کیا

"نہیں فرزند' ادب رسالت ملحوظ خاطر ہے" علیؓ نے فرمایا اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اس روز غوث پاک نے منبر پر کھڑے ہو کر کلام کیا تو فصحائے بغداد دنگ رہ گئے آشنا حیران ہوئے تو نا آشنا پریشان۔ فصاحت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو انسانی عقلوں کو خشک پتوں کی طرح بہا لے گیا۔ کلام اول ملاحظہ فرمائیں:۔ "فکر غوطہ خور' دل کے بحرِ زخار میں موتیوں کی تلاش میں ہے اور ان موتیوں کو سینے کی گہرائی سے نکال کر قصہ گو زبان کے سپرد کر دیتا ہے وہ موتی جو دلوں کی پہنائی میں سجائے اور حسن اطاعت کے سرمائے سے خریدے جاتے ہیں۔"

اس بات پر کم و بیش تمام مشائخ کا اتفاق ہے کہ یہی کلام اول ہے جو آپ نے لوگوں کو تعلیم کیا۔ چند روز بعد خضرؑ تشریف لائے یہ گویا غوث پاک کا امتحان تھا اور کوئی انوکھی یا نئی بات نہ تھی بلکہ اولیاؤں کا امتحان ایک دستوری بات تھی مگر یہاں تو کایا ہی پلٹ چکی تھی غوث پاک نے فرمایا "آج میں آپ کے الفاظ آپ ہی پر لوٹا رہا ہوں وہ الفاظ جو آپ نے موسےؑ سے کہے تھے یعنی میرے جیسے صبر و تحمل کی آپ میں تاب ہے نہ مجال' اس لئے کہ آپ اسرائیلی ہیں اور میں "محمدی" ہوشیار ہو جائیں' ہم دونوں شہسوار ہیں اور میدان سامنے ہے۔ مگر میرے زین کسے ہوئے گھوڑے کو ملاحظہ فرمائیں اور کڑی کمان کے چلے پر چڑھے ہوئے تیر کو نگاہ میں رکھیں' میری کاٹ دار شمشیر براں کا بھی اندازہ لگا لیں۔" مناقب غوث پاک کی مستند کتب میں یہ مکالمات من و عن موجود ہے جو چاہے ملاحظہ فرما سکتا ہے۔ اس روز آپ نے ولائت کی خصوصیات بیان فرمائیں۔ مسند ولائت کے سجادہ نشیں میں بارہ خصائل کا ہونا ضروری ہے۔

(1) دو خصلتیں خالق کائنات کی

(2) دو صفات رسالت مآبؐ کی

(3) دو سیدنا صدیق اکبرؓ کی

(4) دو عمر فاروقؓ کی

(5) دو عثمان غنیؓ کی

(6) دو علی المرتضےٰ کی

سامعین حیران و ششدر یہ انداز تکلم سن رہے تھے اور تشریح طلب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے آپ نے حاضرین کی تشنگی ان الفاظ سے دور کی۔

ستار و غفار ہونا رب العزت کی خصلتیں ہیں، شفیق و رفیق، شیوہ رسالت مابؐ ہے۔ صادق و تصدق (تصدیق کرنے والا) صدیق اکبرؓ کی خصوصیات ہیں، عمر فاروق کی خصوصیات میں اوامر و نواہی کی پابندی کرنا اور کرانا سرفہرست ہیں، حضرت عثمان غنی کا طرہ امتیاز، بھوکوں کو کھانا کھلانا اور شب بیداری (عبادت کی غرض سے) ہے اور سیدنا علیؓ کی خصوصیات عالم اور شجاع ہونا ہیں۔ یہ بارہ صفات اگر کسی شخص میں بیک وقت موجود نہیں تو وہ مقام ولائیت ہے بہت دور ہے اس کا دعوے جھوٹا اور بھرم بھاؤ کھو کھلا ہے۔ پھر آپ نے منظوم کلام میں "شیخ" کے پانچ خصائل بیان فرمائے۔

(1) احکام شریعت سے مکمل واقفیت اور علم حقیقت کی اصل سے آشنائی۔

(2) حسن خلق کا بہترین نمونہ ہونا (اخلاق ساری عبادت کا نچوڑ ہے۔ اور یہ خلق خدا سے، بندے کے تعلق کا نام ہے)۔

(3) وہ قول و فعل سے مساکین کی تواضع کرنے والا ہو۔

(4) حرام و حلال میں امتیاز کرنے والی قوت مدرکہ کا مالک ہونا۔

(5) اپنے نفس اور طالبین کی طریقت کو کماحقہ، مہذب کرنے کی صلاحیت کا مالک ہو۔

رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا تو کلام میں الوہی رنگ کی دھوم مچ گئی۔ سامعین ایک عرصے کے بعد وجدانی لذتوں سے آشنا ہوئے۔ ان کے کان، فلسفے کی موشگافیاں سن سن کر عاجز آچکے تھے۔ سماعتیں مسلکی دلائل سے مجروح ہو چکی تھیں۔ اسی زمانے میں کرامات کے ظہور کا سلسلہ شروع ہوا ہر وعظ بذات خود ایک کرامت ہوا کرتا تھا۔ لوگ تڑپ تڑپ جاتے الفاظ بے شک وہی تھے جو دوسرے علماء استعمال کیا کرتے تھے لیکن بلحاظ تاثیر زمین و آسمان کا فرق تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ مدرسے کی قریبی سرائے (رباط) میں بیٹھنے لگے۔ انداز یہاں ایسا تھا جو بربط دل کے تاروں کو جا چھیڑتا اس صورت حال کے پیش نظر مدرسہ ابو سعید مخزومی کی توسیع ضروری قرار دی گئی۔ اردگرد کے مکانات دوکانیں سرائے وغیرہا مسمار کر کے درس گاہ کو وسیع

و عریض کر دیا گیا۔ چند روز بعد درس گاہ نے پھر تنگی داماں کی شکایت کی۔ لوگ اپنی اپنی سواریوں پر آتے اور درس گاہ کے اردگرد کھڑے ہو جاتے۔ یہ نطق غوث کا اعجاز تھا کہ جہاں کوئی کھڑا ہوتا مفہوم و معانی لب و لہجہ ہر سامع کے دل پر نقش ہو جاتا۔ اس زمانے میں برقی رو کا رواج تھا نہ لاؤڈ سپیکر ایجاد ہوا تھا پھر بھی صدائے غوث کی لہریں ایک جیسی گونج' ایک جیسی شدت کے ساتھ ہر سماعت کو فیض یاب فرماتیں۔ یہ بیان خلاف عقل تو ہے لیکن کرامت کہتے کسے ہیں؟

آج علوم سائنس کی ترویج و ترقی کے وسیلے سے ہم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ آواز کی لہریں مخرج سے خارج ہونے کے بعد ہوا کے دوش پر رقص کرتی ہوئی سماعتوں سے ٹکراتی ہیں تو مسافت کے مطابق کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسے ٹکنیکی زبان میں ”ATTENUATION“ عملی تخفیف) کہتے ہیں اور ان لہروں کی شدت کی پیمائش کے لئے جو اکائی مستعمل ہے اس کا نام ڈی بی ”DECIBEL“ ہے۔ اس کے برعکس صوتی لہروں کو طاقتور بنانے والے عمل کا نام ”AMPLIFICATION“ عمل توسیع ہے جو لاؤڈ سپیکر میں کار فرما ہوتا ہے لیکن کلام غوث پاک کو کون یکساں شدت کے ساتھ دور و نزدیک پہنچاتا تھا؟ کون ان کے ذکر کو بلند فرماتا تھا؟ یہی نکتہ قابل غور ہے۔ یہ عوام الناس کی جہالت کے خلاف جنگ تھی۔ دلوں پہ لگے ہوئے قفل کھل رہے تھے شیطانیت کا قلع قمع ہو رہا تھا مگر انداز غوث سے ہر چشم تماشا ورطہ حیرت میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔

دامن پہ کوئی چھنٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

پھر یوں ہوا کہ کلام غوث پاک کا دائرہ اتنا عمل وسیع ہو گیا کہ خطاب بغداد کی درس گاہ میں ہو رہا ہوتا مگر سامعین کالے کاسوں دور بیٹھے' استفادہ کر رہے ہوتے۔ خلق خدا کے ہجوم کے پیش نظر ایک عجیب و غریب اعلان ہوا۔ ”جو لوگ الوہی رنگ پسند کرتے ہیں اور میرا خطبہ صدق دل سے سننا چاہتے ہیں ان کے لئے مجلس میں حاضری کی قید ختم کی جاتی ہے“ یہ تمکنت' ناز' یہ انداز بیاں' جہلاء کی سمجھ سے بالاتر تھا تار برقی ولاسلکی کا زمانہ تو تھا نہیں اور نہ ہی ٹیلی وژن ایجاد ہوا تھا بات سمجھ میں آتی تو کیسے آتی لیکن ایک بات پر سب کا اتفاق ہے کہ علمائے سو تک مذاق اڑانے یا تردید کی جرات نہ کر سکے۔ غوث الاعظم کی جمالی شان دل کش

تھی تو جلالی شان راکھ بھی کر سکتی تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ چشم بینا کے حامل حضرات اس اعلان کی عملی وضاحت فرمانے لگے۔

غوث پاک کا معمول تھا کہ ہفتے میں تین بار عوام الناس سے خطاب فرماتے۔ جمعتہ المبارک کی صبح منگل کی رات اور اتوار کی صبح محافل کا انعقاد ہوتا۔ ہر مجلس میں عوام کے علاوہ عراق کے مشائخ، فقی اور علماء شرکت فرماتے ان میں شیخ بقاء بن بطو، شیخ ابو سعید قیلوی، شیخ علی بن ہیتی، شیخ ابو طبیب عبدالقادر سہروردی، شیخ ماجد کردی، شیخ مطر بادرانی رحمتہ اللہ تعالے علیہم اجمعین جیسے آفتاب و مہتاب شریعت و طریقت بھی موجود ہوتے۔ رجال الغیب اور فرشتے بھی گروہ در گروہ تشریف لاتے اور کلام غوث پاک سے مستفید ہوتے۔ دوران خطاب سامعین کو آہیں اور سسکیاں تو سنائی دیتیں مگر سوختہ ساماں عشاق دکھائی نہ دیتے۔ اکثریوں بھی ہوتا کہ کوئی شخص فرش زمین پر ہاتھ رکھتا تو اسے غیر مرئی وجود کا احساس ہوتا جیسے اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ پر آگیا ہو۔ حاضرین و سامعین کو رجال غیب کی موجودگی کا احساس ہر محفل میں ہوتا۔ خطاب اختتام پذیر ہوتا تو اس کا طلسم تادیر قائم رہتا لوگ وجدانی کیفیات میں سرشار ہو چکے ہوتے پھر غوث پاک فرماتے "قال تو ہو چکا اب حال کی طرف آیئے" اس اعلان کے ساتھ ہی محفل کا رنگ بدل جاتا اور لوگ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے۔ وفور شوق کا یہ عالم کہ ہر دل کی یہی تمنا ہوتی "یا الٰہی! یہ رنگ محفل ابد تک قائم رہے اور عمر عزیز اسی کیف میں تمام ہو جائے۔"

غوث پاک کے اس اعلان کی عملی وضاحت کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔ شیخ عبدالرحمٰن طفسونجیؒ کبھی بغداد میں نہیں آئے مگر اپنے شہر میں سر راہ، بصد احترام کھڑے رہتے اور لوگوں سے ارشاد فرماتے "لوگو! سیدنا عبدالقادر کا خطاب شروع ہونے والا ہے شائقین میرے غریب خانے پر حاضر ہو کر ارشادات عالیہ سماعت فرما سکتے ہیں"

لوگ گروہ در گروہ ان کے گھر جمع ہو جاتے۔ ادھر بغداد میں محفل کا آغاز ہوتا ادھر کالے کوسوں دور طفسونجیؒ کے گھر تشنگان اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے کانوں سے ایک ایک لفظ سنتے اور غوث پاک کی موجودگی کو محسوس کرتے۔ اکثر لوگ وقت اور تاریخ کو ضبط تحریر میں لے آتے اور موضوع سخن کی چیدہ چیدہ باتیں بھی لکھ لیتے۔ بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوتا کہ واقعی اس روز، اس وقت، غوث الاعظم نے فلاں موضوع پر گفتگو فرمائی تھی۔ پہلے تو خلق

خدا حیرت زدہ رہ جایا کرتی تھی رفتہ رفتہ لوگ اس کے عادی ہو گئے۔ اور مختلف شہروں میں ایسی محافل، بڑے اہتمام و احترام سے انعقاد پذیر ہوتیں۔

ایسی ہی ایک محفل "کوہ لالش" پر منعقد ہوا کرتی جس کا اہتمام سیدنا عدی بن مسافرؒ فرمایا کرتے۔ ان کی رہائش اس پہاڑ پر تھی وہ ہفتے میں تین بار، خطاب غوث سے پیشتر اعلان فرما دیتے اور خلق خدا پہاڑ کا رخ کرتی۔ یہ بات مستند ہے کہ ہر محفل میں چند افراد، مفہوم کی شدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے، جان بحق ہو جاتے جیسے پتنگے شمع کی لو پر قربان ہو جاتے ہیں۔ دم آخر ان کی کیفیت سے صاف عیاں ہوتا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک بار دوران وعظ آپ نے سلسلہ کلام منقطع کر کے اچانک کہا "اے اسرائیلی! ٹھہر جا اور" محمدی "کا کلام بھی سنتا جا" جب آپ سے (بعد میں) لوگوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا "جناب خضر علیہ محفل کے قریب سے گذر رہے تھے یہ خطاب ان کے لئے تھا۔"

قزاق، ڈاکو لٹیرے معاشرے کے رستے ہوئے ناسور جو غوث پاک کے دست حق پرست پر تائب ہوئے ان کی تعداد ایک لاکھ بیان کی جاتی ہے لیکن آپ کی محافل میں سینکڑوں یہود و نصاریٰ کا حلقہ بگوش اسلام ہونا، اس سے بھی بڑا کارنامہ ہے کیوں کہ یہودی بڑے پتھر دل واقع ہوئے ہیں۔

ایک بار بڑی عجیب و غریب صورتحال کا سامنا ہوا۔ گفتگو کا موضوع "ایثار" تھا۔ الفاظ و معانی کا سیلاب تھا جو خس و خاشاک کی طرح سامعین کو بہائے لئے جا رہا تھا کہ اچانک آپ خاموش ہو گئے اور بڑے غور سے ایک سمت دیکھنے لگے۔ تشنگان حیران و پریشان تو ہوئے مگر دم مارنے کی کسی میں مجال نہ تھی (آپ کی محافل میں کوئی کھانستا تک نہیں تھا) پھر آپ نے خلاف توقع کہا "ایک سو دینار معاوضہ طلب کئے بغیر میں خطاب نہیں کروں گا"

پہلے تو یہ بات لوگوں کی سمجھ ہی میں نہ آئی مفہوم آشکار ہوا تو چالیس افراد نے سو سو دینار پیش کئے۔ ہر شخص بخوبی آگاہ تھا کہ اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔ آپ نے ایک شخص کے دینار قبول کئے اور خادم خاص ابو رضا سے فرمایا۔ "فورا" شونیز کے مقبرے میں جاؤ، وہاں تمہیں ایک بربط نواز آلہ موسیقی سے کھیلتا ہوا ملے گا۔ یہ رقم اسے پیش کر کے، م سیقار

میرے پاس لے آؤ۔"

ابو رضا تعمیل ارشاد میں شونیز کے مقبرے کی طرف چل دیا۔ وہاں اسے وہ بربط نواز ملا جو واقعی قبرستان میں بربط بجا رہا تھا۔ ابو رضا نے سو دینار پیش کئے اور کہا "تمہیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے یاد فرمایا ہے۔" بربط نواز چند لمحے ہکابکا ہو کر خادم غوث کو دیکھنے لگا پھر چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو تاسف بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "ہائے قصہ رسوائی کس محفل تک جا پہنچا' کاش میری ماں نے مجھے جنم ہی نہ دیا ہوتا" خادم نے تسلی آمیز الفاظ میں اس کی دلجوئی کی اور دونوں محفل غوث پاک میں حاضر ہوئے۔ چشم فلک سے عجیب نظارہ دیکھا۔ غوث پاک نے گناہ گار کو منبر کے قدمچے پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ لوگوں کی حیرت دیدنی اس وقت ہوئی جب وہ شخص واقعی 'کاندھے پر بربط سجائے منبر پر بیٹھ گیا۔

"اب بتا! یہ قبرستان میں بربط بجانے کا کیا سبب ہے؟" غوث پاک نے تشریح طلب کی تو وہ سر جھکا کر خجل خجل سا فرش زمین کو دیکھنے لگا۔

"مہر سکوت توڑ اور داستان غم بیان کر" غوث پاک کے لبوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ جس نے اس گنہگار کو حوصلہ عطا کیا۔

"حضور! میں بچپن ہی سے فن موسیقی میں ماہر تھا" بربط نواز نے دلی کرب کا اظہار کیا۔ " میرے فن کی ہر طرف دھوم تھی' عہد شباب آیا تو میرا فن اور بھی نکھرا شہرت و دولت میرے گھر کی کنیز ہوئی مگر افسوس کے جب صنعیفی نے در پر دستک دی' قویٰ مضمحل ہوئے تو دنیا مجھ سے روٹھ گئی۔ قدردانوں نے دھتکار دیا۔ ہاتھوں میں ارتعاش کی بناء پر فن بھی رخصت ہو گیا۔ تب میں نے عہد کیا کہ اپنا شہر ناسپاس چھوڑ کر بغداد جا بسوں گا اور اپنا فن صرف مردوں کے سامنے پیش کروں گا اس لئے کہ زندوں سے تو میں مایوس ہو چکا تھا' بغداد پہنچا تو حسب عہد' میں نے قبرستان کا رخ کیا اور زیر زمین سونے والوں کو بربط سنانے لگا۔ جناب عالی! پھر ایک عجیب ماجرا ہوا ابھی میں نے مضراب سے تاروں کو چھیڑا ہی تھا کہ ایک پرانی قبر شق ہوئی' ایک شخص نے گردن باہر نکالی اور کہا۔ "اے بدبخت انسان' زندوں مردوں کے چکر میں مت آ' نغمہ سرائی کا شوق ہے تو اس ذات کی مدحت و ثنا بیان کر جو حی و قیوم ہے۔ پھر من کی مراد پا لے گا۔"

"میں نے اسی وقت رب العزت کی حمد کا آغاز کیا اور پہلا نغمہ ابھی اختتام پذیر بھی نہیں

ہوا تھا کہ آپ کا فرستادہ مجھ تک پہنچ گیا اور سو دینار کی خطیر رقم پیش کرنے کے بعد مجھے یہاں لے آیا۔ میں نے اس کی طرف پہلا قدم اٹھایا تو اس نے مجھے آغوش کریمی میں پناہ دی لہٰذا آج کے بعد میں اپنے بربط کو توڑتا ہوں اور اس ذات سے رشتہ جوڑتا ہوں" یہ کہہ کر بربط نواز نے اپنے عمر بھر کے ساتھی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ محفل پر سناٹا چھا گیا۔

"اے حق کے طلبگارو! غور کرو اس شخص کی داستان پر" غوث الاعظم نے سامعین سے فرمایا۔ اس شخص نے لہو و لعب میں صداقت اختیار کی تو اپنی منزل کو پالیا یہ الگ بات کہ وہ منزل کوئی اتنی پسندیدہ نہیں لیکن اگر راہ حق کا کوئی مسافر صداقت اختیار کرتا ہے تو اندازہ لگاؤ وہ تقرب الٰہی کے کس مقام پر ہو گا۔ تم پر لازم ہے کہ اپنے افعال کو صداقت اور خلوص سے نکھارو۔ اپنی کھیتیوں کو فریبی پانیوں سے مت سینچو، فصل حماقت لہلہائے گی جو تم کو سپرد ہلاکت کر دے گی" غوث پاک نے صرف ایک شخص سے سو دینار قبول کئے تھے باقی انتالیس افراد نے بھی بربط نواز کو سو سو دینار پیش کئے جو اس نے یہ کہہ کر ادا کر دیئے "اب مجھے ایسا خزانہ مل گیا ہے جس کے سامنے درھم و دینار کی کوئی حقیقت نہیں" اس محفل میں پانچ افراد نے جام شہادت نوش فرمایا۔

- ایک زمانے میں امام غزالیؒ نظامت بغداد کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے، زرق برق لباس زیب تن فرماتے علوم ظاہری میں یہ طولے رکھتے تھے۔ یونانی فلسفے کے ماہر، ایسی ایسی موشگافیاں بیان کرتے کہ لوگ جھوم جھوک جاتے۔ ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جب امام موصوف تشکیک کی دلدل میں پھنس چکے تھے پھر جب غوث الاعظم نے بغداد میں قدم رنجا فرمایا، رشد و ہدایت کا چراغ روشن ہوا امام غزالیؒ بھی اس سے فیض یاب ہوئے لباس فاخرہ کو خیرباد کہا سادگی کا وطیرہ اپنایا۔ ایسے تائب ہوئے کہ فلسفی ملت کے مقام و مرتبے پر فائز ہوئے تہافتہ الفلاسفہ اور احیا العلوم جیسی معرکتہ الاراکتب تصنیف کیں یہ فیض غوث پاک کا ادنے کرشمہ تھا۔

سرزمین عراق طریقت و حقیقت کے شہسوار پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی مگر چار مشائخ زیر زمین روپوش ہونے کے باوجود زندوں کی طرح تصرف کے حامل ہیں اور بہجتہ الاسرار کے مطابق ان میں سرفہرست شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہیں پھر شیخ معروف کرخیؒ شیخ عقیل مجی اور شیخ حیاۃ بن قیس حسرانیؒ کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ اسی طرح وہ بزرگ جو مادر زاد

اندھوں کو نور بصارت عطا کرنے پر قدرت رکھتے تھے ان میں بھی سرفہرست شیخ عبدالقادر جیلانی ہیں پھر شیخ بقابن بطو، شیخ ابوسعید قیلوی اور شیخ علی بن ہستیؒ ہیں۔

شیخ شہاب الدین سہروریؒ کے عنفوان شباب میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے شیخ موصوف کی کایا ہی پلٹ دی اسکی تفصیل پیش خدمت ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی آغاز جوانی میں تیز طبع جوشیلے نوجوان تھے۔ علم کلام، یونانی فلسفہ اور دیگر علوم مناظرہ و مجادلہ پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کے چچا ابو نجیب سہروردیؒ ان علوم سے گریز کی تلقین فرماتے مگر شہاب الدین اپنے مسلک سے باز نہیں آتے تھے۔ ایک روز چچا اپنے قابل صد افتخار بھتیجے کو لے کر دربار غوث میں حاضر ہوئے۔ راستے میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرا دی کہ دربار غوث کی اہمیت و فضیلت کرہ ارض پر لاثانی ہے۔ "دیکھ بیٹا" آج ہم اس شخص کی زیارت کرنے والے ہیں جو رموز ربانی کی خبریں دینے پر قادر ہے۔" چچا نے کہا "یہ ایسی بابرکت شخصیت ہے جو دلوں پر لگی مہریں مٹا دیتی ہے لہٰذا اگر کچھ حاصل کر سکو تو کر لو۔ یہ سنہری موقع، خوش نصیبوں کے ہاتھ آتا ہے، بس ادب و احتیاط کا دامن تھامے رکھنا، اللہ خیر کرے گا"

دونوں حضرات دربار غوث میں حاضر ہوئے تو ابو النجیب سہروردی نے بصد احترام درخواست پیش کی "حضور! یہ میرا فرزند، فلسفے اور علم کلام کے خار زاروں میں بھٹک رہا ہے میں نے بارہا ان علوم سے گریز کی تلقین کی مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں"

"اے عمر! عزیزم کون کون سی کتب کا مطالعہ کر چکے ہو" غوث پاک نوجوان فلسفی و منطقی کی طرف متوجہ ہوئے۔ شہاب الدین سہروردیؒ نے فر فر ان کتب کے نام گنوانے شروع کئے۔ لہجے میں غرور علم بھی تھا کہ تمکنت قیل و قال بھی۔

"ذرا میرے قریب تو آؤ" غوث پاک نے زیر لب مسکرا کر فرمایا۔ فلسفی قریب ہوا تو آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سینے پر اس طرح پھیرا جیسے پتھر سے دھول صاف کی جاتی ہے۔ ہاتھ ابھی سینے سے جدا نہیں ہوا تھا کہ فلسفی کے ذہن سے کتب فلسفہ کے سارے دلائل، سارے الفاظ حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ بقول شہاب الدین سہروردیؒ میرا ذہن کورے کاغذ کی طرف صاف ہو گیا۔ سارے مطالب ذہن سے محو ہو گئے تو میں حیران و ششدر ادھر ادھر دیکھنے لگا، غوث پاک نے زیر لب مسکرا کر میرے سینے پر انگشت شہادت رکھ دی۔ خدا کی قسم

علم لدنی کا سمندر میرے اندر موج زن ہو گیا اور میں عارفانہ گفتگو کرنے لگا"

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ عراق کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن پر باطنی علم کو بھی ناز تھا ہے اور رہے گا۔ خود غوث پاک نے ایک بار فرمایا تھا" شہاب الدین! تم مشاہیر کے آخری فرد ہو" المختصر آپ اسرار و رموز کا خزینہ تھے ایسا خزینہ جسے تا ابد زوال نہ ہو گا۔ آپ کے مصاحب خاص شیخ نجم الدین رقم طراز ہیں "ایک بار میں نے اپنے شیخ کو پہاڑ کی بلند چوٹی پر موجود پایا۔ آپ کے سامنے جواہرات کا انبار لگا تھا جسے مٹھیاں بھر بھر کر آپ ہجوم پر نچھاور فرما رہے تھے۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ گراں مایہ انبار میں کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔ بعد میں میں نے اپنے شیخ سے التماس کی کہ وہ مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کریں تو آپ نے فرمایا۔ "تیری چشم تماشہ نے جو کچھ دیکھا وہ سچ تھا مگر یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا کہ یہ سارا فیض، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ہے میں جو کچھ بھی ہوں ان ہی کی نظر کرم سے ہوں"

آپ کا وصال محرم 632ھ میں ہوا۔ رباط بسطامی، رباط ناصری اور رباط مامونیہ تین خانقاہیں آپ کے دم قدم سے معرض وجود میں آئیں۔ شافعی مسلک کے متبع تھے سلسلہ نسب سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ پیدائش سہرورد میں ہوئی بغداد میں مدفون ہیں۔

غوث الاعظم کے صبر و استقامت پر دلالت کرنے والا ایک واقعہ اہل علم حضرات میں بڑا مشہور ہے۔ اس زمانے میں آپ کی عمر مبارک ترپن برس کی تھی گویا یہ واقعہ 523ھ میں پیش آیا۔ شیخ کیمیائی، شیخ بزاز اور شیخ ابوالحسن یہ تینوں حضرات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہمراہ مقبرہ شونیز میں مزارات کی زیارت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ فقہاء اور قراء حضرات کی کثیر تعداد بھی ساتھ تھی۔ شیخ حماد بن مسلم کا وصال ہو چکا تھا۔ غوث پاک اپنے استاد مکرم کے مزار پر بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔ سورج رفتہ رفتہ بلند ہونے لگا اور گرمی کی شدت ناقابل برداشت ہونے لگی مگر چونکہ غوث پاک خاموش کھڑے تھے لہٰذا دیگر حضرات بھی آپ کے پیچھے دست بستہ کھڑے رہے۔ کافی عرصہ بعد آپ نے مڑ کر ساتھیوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ رخ روشن پر بشاشت تھی لوگوں نے طویل قیام کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "آج میں دلی مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ آج میں اپنے شیخ کے کام آیا۔ یہ میرے عنفوان شباب کا ذکر ہے۔ ایک روز میں شیخ حماد کی ہمراہی میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے جامع الرصافہ کی طرف جا رہا تھا۔ کثیر تعداد میں دیگر طلباء بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جب ہم قنطورہ یہود (قنطورہ بمعنی پل) کے قریب پہنچے تو جانے میرے شیخ کے دل میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے شدید سردی کو نظرانداز کرتے ہوئے مجھے برفیلے پانی میں دھکا دے دیا۔ میں نے اونی جبہ پہن رکھا تھا۔ پانی میں گرنے سے ایک پل پیشتر میں نے فوراً "بسم اللہ پڑھ کر غسل جمعہ کی نیت کر لی۔ شیخ حماد تو مجھے دھکا دے کر آگے بڑھ گئے میں پانی میں شرابور ٹھٹھرتا ہوا باہر آیا اور خاموشی سے اپنے شیخ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دیگر طلبا نے جب میری کیفیت دیکھی تو میرا مذاق اڑانے کی کوشش کی مگر شیخ حماد نے ان کو ڈانٹ دیا اور کہا "میں نے تو عبدالقادر کو آزمائش میں مبتلا کرنا چاہا تھا مگر یہ کوہ گراں اپنی جگہ سے متحرک ہی نہیں ہوتا۔ آزمائش کی گھڑی سے بھی اس نے استفادہ کر لیا" یہ اشارہ میری نیت غسل کی طرف تھا۔

"اس واقعہ کو ایک عرصہ بیت گیا شیخ حماد رحلت فرما گئے۔ آج میں نے شیخ موصوف کو پوری سج دھج میں دیکھا۔ ان کے جسم پر جواہرات سے مرصع لباس فاخرہ تھا سر پر تاج یاقوت ہاتھوں میں طلائی کنگن اور پاؤں میں طلائی جوتے۔ عجیب بات میں نے یہ دیکھی کہ آپ کا دایاں ہاتھ مفلوج تھا"۔

"آپ کے اس ہاتھ کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا" میں نے حیران ہو کر پوچھا تو آپ نے

فرمایا "فرزند اس ہاتھ سے میں نے تجھے قنطورہ یہود پر سے پانی میں دھکا دیا تھا' کیا تو مجھے معاف نہیں کر سکتا؟"

"استاد مکرم! میں صدق دل سے آپ کو معاف کرتا ہوں" میں نے فوراً کہا "اور رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کے دست مبارک کو صحت کاملہ عطا فرمائے" چنانچہ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے جب بارگاہ ایزدی میں دعا کر رہا تھا تو پانچ ہزار اولیا اپنے اپنے مزارات میں میری دعا پر آمین کہہ رہے تھے۔ میری دعا کو شرف قبولیت نصیب ہوا شیخ حماد کی تکلیف دور ہوئی اور انہوں نے ابھی ابھی مجھ سے مصافحہ کیا ہے"۔

اس واقعہ کی تشہیر بغداد کے گلی کوچوں میں ہوئی تو اکثر مشائخ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ علماء و صوفیاء کی جماعت' حقیقت حال سے آگاہی حاصل کرنے درس گاہ غوث الاعظم میں حاضر ہوئی مگر کوئی ایک فرد بھی رعب و جلال کے سبب حرف مدعا زبان پر نہ لا سکا۔ آپ نے خود ہی فراست غوثیہ سے کام لیتے ہوئے ان کا عندیہ پا لیا اور مسکرا کر کہا "آپ لوگ شیخ حماد والے واقعے کی تصدیق کرنے آئے ہیں بہتر ہے اپنے میں سے دو بزرگوں کا انتخاب کر لیں' حقیقت حال خود بخود ان کی زبان پر آ جائے گی"۔

چنانچہ شیخ ہمدانی جو بغداد میں بطور مہمان مقیم تھے اور ایک مقامی بزرگ عبدالرحمان کو منتخب کیا گیا۔

"آئندہ جمعہ تک ہماری زبانوں پر حقیقت حال آ جانی چاہئے" دونوں بزرگوں نے بیک زبان کہا۔ مگر غوث پاک مراقبے میں جا چکے تھے۔ حاضرین بھی خاموش ہو گئے۔ محفل پر سکوت بے کراں طاری تھا جب اچانک درس گاہ کے باہر شور بلند ہوا اور شیخ یوسف نامی بزرگ برہنہ پا بھاگتے ہوئے محفل میں حاضر ہوئے "خدا کی قسم مجھے ابھی ابھی شیخ حماد نے حکم دیا ہے کہ میں سارے واقعہ کی تصدیق کروں۔ ساری بات مبنی بر حقیقت ہے" حیران کن بات یہ ہوئی کہ وہ منتخب شدہ حضرات بھی سر محفل تصدیق فرمانے لگے اور علماء کی جماعت شدت خجالت سے معافی کی درخواستگار ہوئی۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا رنگ گندمی' آواز کڑکدار جس کی گونج میں کھنک واضح تھی' جسم اکہرا مگر سینہ مبارک کشادہ تھا' ریش مبارک گھنی اور لمبی تھی۔ اکثر خاموش رہتے مگر جب لب کشا ہوتے تو حاضرین و سامعین خود بخود مہر بہ لب ہو جاتے۔ ہر طرف سناٹا چھا جاتا

ارشادات عالیہ کا ایک ایک لفظ سماعتوں سے ٹکراتا ہوا دلوں تک اتر جاتا اور ان کی آلائشیں کدورتیں دور کر کے ان کو آئینہ تمثال بنا دیتا۔ لوگ مفاہیم کے موتیوں سے بصیرتوں کو سجاتے اور غوث پاک کی موجودگی پر سجدہ شکر بجالاتے۔

آپ مجتہد العصر بھی تھے۔ آپ کا ہر اجتہاد امت مسلمہ کے لئے باعث خیر و برکت ہوا۔ فتویٰ صادر فرماتے وقت آپ اپنے جد اعلیٰ حیدر کرار ہی کی طرح پل بھر میں بات کی تہ تک رسائی حاصل کر لیتے اور ایسا لاجواب فتویٰ دیتے کہ ہر شخص کی تسلی و تشفی ہو جاتی۔ واضح رہے کہ اس دور میں مفتیوں کی کمی تھی نہ علماء کی۔ بغداد تو ویسے بھی علم و آگہی کا گہوارہ رہا ہے ایک بار ایک شخص نے بڑا انوکھا مسئلہ چھیڑ دیا۔ فتوے کی نوعیت عقدہ کشائی کے بعد مناسب راہنمائی کا تقاضا کرتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی عجیب و غریب شرط رکھ دی جو پوری نہ ہوتی تو طلاق بائن ہو جاتی۔ شرط یہ تھی ”میں ایسی عبادت کروں گا جو اس وقت کرہ ارض پر کوئی اور نہ کر رہا ہو اور اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو میری بیوی کو طلاق ہو“ بغداد کیا امت مسلمہ کے سارے مفتی اور علما عاجز آ گئے۔ انداز عبادت کوئی سا بھی ہو یہ بات وثوق سے کون کہہ سکتا ہے کہ کرہ ارض پر اس قسم کی عباد کوئی اور نہیں کر رہا۔ رات بھر میں قرآن ختم کرنا، جنگلوں پہاڑوں میں یاد الٰہی کی جانب راغب ہونا، سطح آب پر نوافل ادا کرنا، ہر نوع کی عبادت میں شک و شبے کی بہرحال گنجائش ضرور ہوتی ہے کہ کرہ ارض کے کسی گوشے میں کوئی اور اللہ کا بندہ بھی اس قسم کی عبادت میں مصروف ہو۔ بہرحال یہ ایسا عقدہ تھا جسے حل کیا جانا ضروری تھا۔ مفروضہ تھا یا حقیقت، اس سے بحث نہیں، انسانی فہم و فراست کا امتحان ضرور تھا۔ اور اس کے لئے فراست ”باب علم“ درکار تھی۔ غوث پاک کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپ نے پل بھر میں اسے حل کر دیا ”یہ شخص فوراً“ بیت اللہ شریف میں حاضر ہو۔ حطاف کو خالی کرایا جائے اور یہ شخص تنہا طواف کرے، طلاق نہیں ہو گی“۔

فتوے اور فیصلے کی خوبی یہی ہے کہ وہ مبنی بر انصاف محسوس ہو اور دل مطمئن ہو جائے۔ متن کو حاشیہ آرائی سے سہارا دینا فیصلہ ہوتا ہے نہ فتویٰ اور یہی علوم ظاہری و باطنی میں فرق ہے۔

مشہور کتب روایات کے مطابق، سدنا غوث الاعظم حنبلی مسلک رکھتے تھے۔ دنیائے

اسلام کے مختلف ممالک سے استفتاء (فتویٰ حاصل کرنے والے) آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ کی رائے حرف آخر سمجھی جاتی اور آپ فقہی مسائل میں امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل (780ء تا 855ء) کے مسلک پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ویسے بھی بغداد میں علماء حنابلہ کی اکثریت تھی امام موصوف چونکہ کافی عرصہ بغداد میں مقیم رہے لہٰذا انکی تعلیمات کا اثر زیادہ تھا۔ یہ بات بھی مناقب غوث کی مستند کتب میں مرقوم ہے کہ غوث الاعظم حصرت امام ابو حنیفہ سے بعض فقیی مسائل میں اختلاف رکھتے تھے اور امام احمد بن حنبل سے آپ کو دلی لگاؤ تھا چنانچہ اکثر مقامات پر آپ نے "امامنا احمد بن حبنل" تحریر فرمایا ہے۔

ایک روز علی بن الہیتیؒ اور شیخ بقا بن بطوؒ دونوں حضرات غوث الاعظم کے ہمراہ امام احمد کے روضے پر زیارت کے لئے گئے تو امام موصوف بہ نفس نفیس قبر مبارک سے باہر تشریف لائے غوث پاک کو سینے سے لگایا، خلعت پہنائی اور کہا "عزیزم عبدالقادر! علم شریعت، طریقت و حقیقت، علم و حال اور فعل الرجال، اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد کیے" اس میں شک و شبے کی بحرحال کوئی گنجائش نہیں کہ غوث الاعظم کو امام احمد بن حنبل سے غایت درجے کا دلی لگاؤ تھا اور وہ فتویٰ بھی ان ہی کے مسلک پر صادر فرمایا کرتے تھے لیکن راقم اپنی تحقیق بھی پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے (فیصلہ قارئین کی صوابدید پر چھوڑا جاتا ہے)۔

شیخ ابو تقی محمد بن ازہر صیر فینیؒ ایک برس تک کسی رجال الغیب سے ملاقات کی حسرت لئے پھرا کرتے تھے ایک بار انہوں نے عالم رویا میں مزار احمد بن حنبل پر گوہر مقصود حاصل کر لیا۔ بے دار ہوئے تو فوراً "مزار مبارک کی طرف چل دیئے۔ وہاں عالم خواب کا ملاقاتی موجود تھا آپ اس کی طرف لپکے تو وہ دریائے دجلہ کی طرف برق رفتاری سے چلنے لگا۔ صیر فینی کو یقین تھا کہ اس شخص کا تعلق رجال غیب سے ہے لہٰذا آپ بھی اس کا پیچھا کرنے لگے۔ دریائے دجلہ پر پہنچے تو اس شخص کے سامنے دریا کے دونوں کنارے سمٹ کر ایک قدم کے فاصلے پر آ گئے۔ چنانچہ وہ شخص دریا کے اس پار جا پہنچا۔ صیر فینی نے بہ آواز بلند اسے رب العزت کا واسطہ دے کر رک جانے کو کہا۔ خیر دونوں کی ملاقات ہوئی تو بزرگ موصوف نے رجال غیب سے دریافت کیا "آپ کا مسلک کیا ہے؟"۔

"الحمدللہ میں ملت حنفیہ کا پیروکار ہوں"۔

ملاقات سے واپسی پر صیر فینیؒ اس ملاقات کی روداد، غوث الاعظم کے گوش گزار کرنے

آستانہ غوثیہ پر حاضر ہوئے۔ مدرسے کے دروازے پر پہنچے تو دروازہ کھولے بغیر ہی غوث الاعظم نے فرمایا ''اے محمد صیر فینی! روئے زمین پر مشرق و مغرب میں اس وقت کوئی ولی اللہ سوائے عبدالقادر کے، حنفی مسلک کا موجود نہیں'' یہ واقعہ بہجت الاسرار کے علاوہ قلائد الجواہر میں بھی مرقوم ہے۔

غوث پاک کے عہد شباب میں جس شخصیت نے سب سے پہلے ان کے مقام و مرتبے کو کماحقہ پہچانا وہ کرد قبیلے کے مایہ ناز اور قابل صد افتخار بزرگ تاج العارفین شیخ ابوالوفابن محمد حلوانی المعروف کاکیس ؒ ہیں۔ خود غوث پاک فرمایا کرتے تھے کہ ''کرد قبیلے میں تقرب الٰہی کے اعتبار سے کاکیس ؒ لاثانی ہیں۔ خدا سے ان کی وابستگی ہر ولی کے لئے باعث رشک ہونی چاہیے۔

جس بزرگ کے بلند مقام و مرتبے کی شہادت خود زبان غوث پاک دے رہی ہو، اہل قلم اس کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں۔ پہلی بار غوث پاک جب عنفوان شباب میں ابوالوفا ؒ کی خدمت میں خانقاہ قلمینیا حاضر ہوئے تو بڑی عجیب صورت حال کا سامنا ہوا۔ واضح ہو شیخ ابوالوفا عمر میں غوث پاک سے ترپن برس بڑے تھے اور مقام ولایت پر کافی عرصہ پہلے فائز ہو چکے تھے۔ اس لحاظ سے نو عمر طالب علم پر ایک بزرگ ولی اللہ کا ادب و احترام واجب تھا۔ ابھی آپ درخانقاہ سے کافی دور تھے کہ ابوالوفا نے مرید خاص مطر ؒ کو حکم دیا ''اے مطر! دروازہ بند کر دو اگر کوئی اندر آنے کی اجازت طلب کرے تو صاف انکار کر دینا'' مطر اپنے شیخ کے اس عجیب و غریب حکم پر حیران تو ہوئے کہ یہ دربار شاہی نہیں، آستانہ فقیر تھا جہاں ہر شخص بلا روک ٹوک حاضر ہو سکتا تھا مگر لیت و لعل وغیرہ سے کام لینا بھی دستور خانقاہی کے منافی تھا لہٰذا انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

''عبدالقار جیلانی کو اندر آنے کی اجازت درکار ہے، دروازہ کھولئے'' نوجوان طالب علم نے اجازت طلب کی تو مطر ؒ نے اپنے شیخ کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ شیخ اشارے سے انکار کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ ادھر شیخ عبدالقار مضطرب انداز میں خانقاہ کے سامنے ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ غیر متوقع صورت حال کا سامنا ہو تو طبیعت سپرد اضطراب ہو ہی جاتی ہے۔ کافی دیر کے بعد شیخ ابوالوفا مراقبے سے باہر آئے تو گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مطر کو فوراً'' دروازہ کھولنے کا حکم دیا اور خود نوجوان طالب علم کے استقبال کو آگے بڑھے۔ تین بار

غوث پاک سے معانقہ کیا۔ مطرؒ ان کے مرید خاص بھی حیران و ششدر رہ اپنے شیخ کو تک رہے تھے کہ شیخ موصوف کی طبیعت میں جلالی شان کچھ زیادہ ہی تھی۔ کاکیسؒ نے معانقے کے بعد فرمایا "اے عبدالقادر! دروزاہ بند کرنے کا سبب بد اخلاقی یا غرور تکبر نہیں' میری ناشنائی تھی۔ تمہارے مستقبل کے مقام و مرتبے سے آگاہ ہو کر سچ بات تو یہ ہے کہ میں خوف زدہ سا ہو گیا ہوں خیر' عزت و ذلت تو خدا کے ہاتھ ہے۔ اب جب کہ تمہاری آمد کے مقصد سے میں بخوبی واقف ہو چکا ہوں تو میرا خوف بھی زائل ہو گیا ہے خوش آمدید' فرزند صد افتخار' خوش آمدید۔

اس کے بعد جب بھی غوث الاعظم زمانہ طالب علمی میں شیخ ابوالوفا کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ فوراً "اٹھ کر استقبال کرتے بلکہ حاضرین مجلس کو حکم دیتے "لاثانی ولی اللہ کی تعظیم بجالاؤ' کھڑے ہونے میں تاخیر مت کرو" ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران شیخ مطرؒ نے اپنے شیخ سے غوث پاک کے مقام و مرتبے سے واقفیت حاصل کرنا چاہی تو شیخ موصوف نے فرمایا " میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ لڑکا بغداد میں نعرہ زن ہو گا" قدمی ہذہ علیٰ رقبہ کل ولی اللہ (میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے) اور پھر تمام اولیاء کرام اپنی گردنیں خم کر دیں گے" پھر ابوالوفا نے حاضرین مجلس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور مزید فرمایا۔ "تم میں سے جو شخص اس وقت موجود ہو' عبدالقادر کے سامنے سر تسلیم خم کر دے' کہ یہی لوح محفوظ پر مرقوم ہے"۔

محفل پر سناٹا طاری تھا کہ یہ کلمات افتخار تو بظاہر تکبیر کی حدود چھو رہے تھے۔

خانقاہ میں استقبال کے علاوہ بھی کاکیسؒ نے شیخ عبدالقادرؒ کا عالم شباب میں انوکھا تعارف پیش کیا جو بظاہر توہین آمیز دکھائی دیتا تھا مگر وضاحت کے بعد ہر شخص کی تسلی و تشفی ہو گئی۔

ایک روز ابو الوقارؒ خانقاہ قلمینیا بغداد میں وعظ فرما رہے تھے کہ غوچ پاک بھی محفل میں شرکت کی غرض سے ادھر آ نکلے شیخ موصوف نے سلسلہ وعظ منقطع کر کے آپ کو محفل وعظ سے چلے جانے کا حکم دیا اور ان کے چلے جانے کے بعد وعظ کا از سر نو آغاز کیا۔ تھوڑی دیر بعد غوث الاعظم پھر محفل میں آ گئے اور شیخ ابو الوفاؒ نے حسب سابق ان کو بزم وعظ سے نکال دیا۔ تیسری بار جب غوچ پاک تشریف لائے تو کا کیسؒ نے وعظ روک کر ان کا استقبال کیا منبر سے اتر کر ان سے مصافحہ فرمایا اور روشن جبیں پھر بوسہ ثبت فرمانے کے بعد حاضرین مجلس سے کہا ”سب لوگ ولی اللہ کی تعظیم میں کھڑے ہو جائیں“ پھر انہوں نے اہل بغداد کو تنبیہ فرمائی۔ ”اے اہل بغداد، میری بات ہمہ تن گوش ہو کر سنو، عبد القادر کو محفل میں شرکت سے باز رکھنے سے مراد ان کی توہین نہیں تھی بلکہ میرا مدعا ان کا تعارف کرانا تھا، غور سے دیکھ لو اور پہچان لو، قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہ قدرت میں ساری کائنات ہے۔ عبد القادر کے سر پر بے مثال تاج ہے جس کا دائرہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے“ پھر وہ غوچ پاک سے مخاطب ہوئے ”اے عبد القادر! بے شک یہ ہمارا دور ہے مگر عنقریب عراق میں تمہارے مرغ کے سوا سب کے فرعان خوئی گلو خاموش کر دیئے جائیں گے اور پھر تمہارا مرغ خوش الحان، تا قیامت بانگ دیتا رہے گا“

محفل وعظ اختتام پذیر ہوئی تو شیخ ابو الوفاؒ نے غوث پاک کو پانچ اشیاء عنائیت فرمائیں اپنا مصلیٰ قمیض، تسبیح پیالہ اور عرصا، لوگوں نے دلی لگاؤ دیکھا تو اصرار کیا ”اپنے دست حق شناس پر عبد القادر سے بیعت لے لیں“

”کاش ایسا ممکن ہوتا“ کا کیسؒ نے فرمایا ”اس روشن جبیں پر میرا نہیں کس اور کا نام لکھا ہے“

”جب تمہارا دور آئے تو ان بوڑھی ہڈیوں کو نظر انداز نہ کر دینا“ ایک بار پھر شیخ ابو الوفاؒ نے غوچ پاک کے مقام مرتبے کو اجاگر کیا۔ یہ تبرکات جو مستقبل کے ولی الزماں کے سپرد کئے تھے معمولی اشیاء نہ تھے بلکہ غیر معمولی خصوصیات کے حامل تھے مثلاً ”اس تسبیح کا ہر دانہ خود بخود گردش کرتا رہتا تھا (وصال شیخ عبد القادرؒ کے بعد تسبیح شیخ علی بن الہیتی کے ہاں جا پہنچی) اس پیالے کی خصوصیت یہ تھی کہ جب کوئی غیر شخص اسے چھوتا تو اس کا سارا بازو لرزنے لگتا۔

تاج العارفین شیخ ابو الوفاؒ جنہوں نے غوث پاک کے مقام کا وقت سے پہلے اعلان کر دیا تھا چونکہ متقدمین کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں نیز غوث پاک سے گہرے لگاؤ کا تقاضا ہے کہ ان

کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔ آپ اپنے دور کے سردار مشائخ مشہور تھے لاتعداد کرامتیں آپ سے ظہور پذیر ہوئیں۔ فیض یافتگان میں شیخ الہیتی اور بقا بن بطورؒ جیسی شخصیات کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ مشائخ عراق کے بقول آپ کے جھنڈے تلے سترہ اولیا تھے۔ جب شیخ ابو محمد شکیؒ نے آپ کو بیعت کیا تو تاریخی الفاظ کہے تھے۔ ”آج میرے جال میں ایسا شاہین آگیا ہے جس کی مثال کسی شیخ کے پاس نہیں“

ایک زمانے میں شیخ ابو الوفاؒ نامی گرامی ڈاکو تھے، ستم گری پیشہ تھا۔ ایک بار شیخ شکیؒ کی عملداری میں واردات کا ارتکاب کیا لوگ آستانہ فقیر پر روتے پیٹتے حاضر ہوئے اور عرض کی ”ڈاکوؤں نے ہمیں بے سروسامان کر دیا، ہم نہ یہ نقصان برداشت کر سکتے ہیں نہ ان کا مقابلہ، ہماری دادرسی کی جائے“

شیخ شکی خلق خدا کی آہ فغاں سے بڑے متاثر ہوئے اور تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچتے رہے پھر انہوں نے اپنے خادم خاص کو حکم دیا۔ ”ڈاکوؤں کے سردار کے پاس جاؤ اور اس سے کہنا ”زیادہ بلندی پر پرواز کرنے والا پرندہ جب گرتا ہے تو کبھی نہ اٹھنے کے لئے گرتا ہے۔ ہم صرف پر نوچ رہے ہیں ضرورت پڑنے پر بازو بھی توڑ سکتے ہیں کافی اودھم مچا لیا اب گھر لوٹ آؤ“

خادم جب ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچا تو سردار کی ہیبت سے لرزنے لگا ادھر سردار نے شعلے برساتی آنکھوں سے فرستادہ فقیر کو دیکھا تو اس خادم کے حواس کوچ کر گئے پھر جانے کیا ہوا کہ خود ڈاکوؤں کے سردار نے، زمین بوس خادم فقیر کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب خادم کو ہوش آگیا تو وہ ڈاکو کے طرز عمل سے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”تمہارے شیخ نے کیا پیغام بھیجا ہے، جلد بتاؤ مجھے بڑی وحشت ہو رہی ہے“ ڈاکوؤں کے سردار نے کہا۔

”نے کہا ہے، گھر لوٹ آؤ“ خادم نے سارا پیغام من و عن ڈاکو کے گوش گزار کیا۔ الفاظ تو عام سے تھے مگر ان کی تاثیر غیر معمولی ثابت ہوئی۔ سردار نے سوئے آسمان دیکھا اور کہا ”اچھا چلو اٹھو گھر چلیں“ اور اسی وقت شیخ ابو الوفا خادم کے ہمراہ آستانہ شیخ شکیؒ کی طرف روانہ ہو گئے اور ایسی توبہ کی کہ توبہ بھی نازل ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق خادم اکیلا واپس چلا گیا تھا اور

شیخ ابوالوفا بعد میں چاک گریباں، شیخ شنکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے بہرحال دونوں کی ملاقات ہوئی تو درویش نے اپنا دست حق شناس آگے بڑھایا جسے ڈاکو سردار نے کبھی نہ چھوڑنے کے لئے تھام لیا۔ شیخ شنکی نے بیعت لینے کے بعد فورا" اپنا حرقہ "تائب نو" کو پہنا دیا اور اپنے پہلو میں بٹھا کر دعائے خاص سے نوازا۔ اتنے میں موذن نے ظہر کی اذان دی۔ شیخ شنکی نماز کے لئے اٹھنے لگے تو انوکھے مرید نے بعد احترام عرض کی "حضور مرغ عرش کی اذان کا تو انتظار فرمائیں"

شیخ شنکی نے چونک کر اپنے شاگرد رشید کو دیکھا اور فرمایا "فرزند! یہ اذان تم کب سے سن رہے ہو؟" "حضور! کوئی عرصہ 23 برس سے یہ اذان میری سماعت سے ٹکرا رہی ہے" ابوالوفا نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

"اللہ تمہاری تاخیر" سے درگزر فرمائے اور بساط علم کو وسیع کرے" شیخ شنکیؒ نے صدق دل سے دعا کی۔ مشہور روایت ہے جب شیخ ابوالوفا بغداد میں داخل ہوئے تو گلی کوچوں میں ندائے غیب گونجی "لوگو! مینار نور کی تعظیم کے لئے تیار ہو جاؤ"

حنبلی مسلک کی یہ عظیم شخصیت 501ھ میں دنیا سے روپوش ہوئی۔ مزار مقدس .قلمینیا (بغداد) میں ہے۔ بعض کتب میں آپ کا مسلک "شافعی" مرقوم ہے۔

مناقب غوث پاک ان کے کشف و کرامات کی تفصیل تو بے حد طوالنی ہے ہم ان کے "نعرہ افتخار" کی تشریح کرتے ہیں جو منجانب اللہ تھا اور جس کی تصدیق متقدمین اور متاخرین نے فرمائی۔ حلب کی خانقاہ میں مشائخ عراق کی کثیر جماعت موجود تھی۔ حافظ ابوالعزیز عبدالمغیث، شیخ علی بن الہیتی، شیخ ابوالنجیب سہروردی مرشد و عم محترم شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور دیگر بڑی بڑی شخصیات موجود تھیں۔ غوث الاعظم سب کے روبرو وعظ فرما رہے تھے۔ خطاب کے عین درمیان آپ اچانک خاموش ہو گئے اور مکاشفے کے بعد فرمایا۔ "**قدمی ھذہ علی رقبہ کل ولی اللہ**" (میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے) محفل پر چھایا ہوا سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا سب سے پہلے شیخ علی بن الہیتی کو ہوش آیا آپ نے عملاً" آگے بڑھ کر آپ کا قدم اپنی گردن پر رکھ لیا۔ پھر شیخ ابوالنجیب سہروردی نے اپنی گردن اتنی جھکا دی کہ پیشانی زمین کو چھونے لگی ہونٹوں سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے "**علی راسی علی عینی و راسی**" (میرے سر [illegible] ر)

غوث پاک نے جب قدمی..... الخ والے والے الفاظ ادا کئے تو اطراف عالم میں دور و نزدیک کوئی ایسا ولی نہیں تھا جس نے قطبیت کے اس پرچم کا مشاہدہ نہ کیا ہو جو آپ کے دست مبارک میں تھا۔ اور تاج غوثیت جو سر مبارک کو زینت بخش رہا تھا سب کے زیر مشاہدہ تھا اور خلعت فاخرہ چشم تماشا کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ اس وقت روئے زمین پر 313 اولیاء موجود تھے جن میں سترہ حرمین شریفین میں ساٹھ عراق میں چالیس عجم میں، تیس شام میں، بیس بلاد مصر میں، ستائیس مغرب میں، گیارہ حبشہ میں، گیارہ وادی یاجوج ماجوج میں، سات سراندیپ میں، سینتالیس کوہ قاف میں اور چوبیس بحر محیط میں (یہ کل تعداد 294 بنتی ہے بقیہ 19 کے متعلق اللہ بہتر جانتا ہے) ان اولیا اللہ میں دس حضرات ابدال وقت تھے باقی سلاطین طریقت۔ ابدال کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

(1) شیخ بقابن بطو (2) شیخ ابو سعید قیلوی (3) شیخ علی بن الہیتی (4) شیخ عدنان بن مسافر (5)
شیخ موسے زولی (6) شیخ احمد بن وفاعی (7) شیخ عبدالرحمن طفسونجی (8) شیخ ابو محمد بصری
(9) شیخ حیات بن قیس اور شیخ ابو مدین مغربی (رضوان اور علیھم اجمعین) شیخ احمد رفاعی اس وقت مجلس میں خطاب فرما رہے تھے اچانک انہوں نے خاموشی اختیار کی اور بے ربط سا جملہ ادا کیا "میری گردن پر" لوگوں نے اس بے ربط سے جملے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے کہا "ابھی ابھی شیخ عبدالقادر نے کہا ہے" میرا قدم تمام اولیاء کی گردن پر"

شیخ ابو مدین بلاد مغرب میں تھے انہوں نے بھی اس پر لبیک کہا اور فرمایا "اے اللہ میں تیرے فرشتوں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے سنا اور سر تسلیم خم کر دیا" بعد میں مشائخ نے اس کی تشریح فرمائی کہ یہ الفاظ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے رب العزت کے حسب حکم ادا کئے تھے اور یہ اختیار بھی ان کو عطا فرمایا تھا کہ اگر کوئی سر تسلیم خم نہ کرے تو اس کا مقام سلب کر لیا جائے۔ حضرت خوانہ معین الدین چشتیؒ ان دنوں خراسان کے پہاڑوں میں مجاہدات و ریاضیات میں مصروف تھے ہواؤں کے دوش پر اڑتا ہوا یہ حکم ان تک پہنچا تو انہوں نے بھی اپنی گردن اس قدم رخم کی کہ پیشانی زمین کو چھونے لگی اور بے اختیار ان کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے "**قدما ک علی راسی و عینی**" خود غوث الاعظم اس اظہار نیاز سے اتنے متاثر ہوئے کہ بھری بزم میں اعلان فرمایا۔ "غیاث الدین کا صاحب زادہ اطاعت میں بازی لے گیا عنقریب اس کے عوض ولایت ہند پر متمکن ہو گا"

اصفہان کے ایک ولی اللہ شیخ صنعانؒ، غوث پاک کے ہم عصر تھے غواص طریقت و حقیقت تھے مگر تمام غوث کے ادراک میں ٹھوکر لگا گئے اور گردن جھکانے میں متامل ہوئے حالانکہ روحانی وسیلے سے پیغام ان تک پہنچ گیا تھا۔ ان کی ولایت و بصیرت سلب ہو گئی حتکہ ایمان تک کو خطرہ لاحق ہوا۔ آخر کار ان ہی کے ایک ارادت مند کی عاجزی و خدمت گزاری کام آئی اور غوث الاعظم نے متوجہ ہو کر ان کو ڈوبنے سے بچالیا۔ اس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ غوث پاک کے یہ الفاظ حکم الٰہی کے مطابق ادا ہوئے تھے مگر وسعت فرمان کے متعلق موجودہ دور کے بعض اکابرین نے اختلاف کیا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ یہ فرمان اولیائے وقت یعنی اس زمانے کے اولیاء تک محدود تھا۔ کیوں کہ اولیائے متقدمین میں صحابہ کرام' تابعین اور اولیائے متاخرین میں حضرت امام مہدی بھی شامل ہیں۔ لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ اس قول کے تحت تمام اولیائے متقدمین و متاکرین بھی آتے ہیں مگر اصحاب رسولؐ اور اہل بیت کے اولیاء اس زمرے میں نہیں آتے کہ ان کا مقام بہرحال بلند و بالا ہے۔

شیخ ابو سعید قیلوی نے اس فرمان کی تشریح یوں فرمائی کہ یہ حکم خداوندی کے عین مطابق تھا اور چوں کہ شیخ عبدالقادرؒ قطبیت کے اکمل ترین مقام پر خاکستر تھے لہٰذا اس کا اعلان ضروری تھا کیوں مقام قطبیت' شفاعت کی علامت بن جاتا ہے۔ لیکن بعض حضرات نے قدم سے مجازی معنی بھی مراد لیتے ہیں۔ یعنی قدم سے مراد طریقہ بیان۔ راستہ وغیرہ جیسے عربی میں کہا جاتا ہے "**فلا ن علی قلم حمید**" یعنی فلاں عمدہ راستے پر ہے۔ استدلال وہی ہے کہ اگر " قدمی" سے مراد ماضی و مستقبل کے اولیائے کرام مراد لی جائے تو بزرگان اسلاف کا احترام بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے بقول حضرت جنید بغدادی "طریقت کی اساس 'احترام پر ہے"

علاقہ عسقلانی نے اس جملے کی تشریح میں فرمایا کہ اس سے مراد "کثرت کرامت" ہے جس سے بہرحال انکار کی گنجائش نہیں۔ ہم نے غوث پاک کے نعرہ "قدم و رقبہ" کے متعلق تمام نکات ہائے نظر پیش کر دیئے۔ (باقی واللہ اعلم بالصواب)

ہر مقام و جگہ پر ہر طرح کے لوگ آباد ہیں اور رہیں گے۔ فرخ بن حمامی درس گاہ غوثیہ کے قریب ہی رہتا تھا مبالغہ آمیز حرق عادت کرامات کا سن سن کر ہمیشہ ان کو بعید از قیاس تصور کرنے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ صفات کا تو منکر تھا مگر "ذات" کے نیاز حاصل کرنے کا دل سے مشتاق بھی تھا ایک روز وہ اتفاقاً" درس گاہ میں پہنچ گیا اس وقت موذن اقامت کہنے میں

مشغول تھا چنانچہ ابو فرح نے سوچا کہ نماز ادا کرنے کے بعد بیاز بھی حاصل کر لوں گا لہٰذا وہ بھاگ کر کھڑی ہونے والی نماز میں شامل ہو گیا لیکن اس افراتفری میں وضو کرنا اسے یاد ہی نہ رہا۔ نماز اور دعا کے بعد غوث پاک نے بڑی میٹھی سی مسکراہٹ سے نوازا اور کہا "صاحب زادے، کسی خدمت کا موقع مجھے دیتے تو میں ضرور تمہارے کام آتا، مگر تمہاری غفلت کا تو یہ حال ہے نماز بھی بے وضو ہی ادا کر لی یعنی زندگی میں نہ ضبط و نظم ہے نہ ترجیحات کا خیال" ابو فرح تو گویا بھرے بازار میں ننگا ہو گیا مارے وحشت سے ہوش اڑ گئے۔ شدت خجامت سے زمین میں گڑے کا گڑا رہ گیا۔ مشہور ہے کہ ابو فرح نے اپنی سوچ کا انداز بدلا تو غوث الاعظم کی نظر کرم سے بلند مرتبے پر فائز ہوا۔

یہ بات بھی مستند ہے کہ غوث پاک کے جسم پر مکھی نہیں بیٹھا کرتی تھی۔ یہ بڑا لطیف مسئلہ ہے۔ از روئے شریعت سوئی کے ناکے برابر نجاست، لباس کو پلید نہیں کر سکتی مگر اتقی کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔ پیکر اندر باہر سے پاک ہو تو نجاست میں لتھڑے ہوئے مکھی کے پاؤں بھی ناپسندیدہ گردانے جاتے ہیں یہی پیکر غوث پر مکھی نہ بیٹھنے کی وضاحت ہے۔

غوث پاک کو پیدائش سے بہت پہلے شیخ ابو بکر ہواز نے ایک مرتبہ دوران وعظ فرمایا کہ عراق میں پیدا ہونے والے، اوتاد کی تعداد آٹھ ہے۔ (اولیائے کرام کے مدارج میں ولی، غوث، قطب ابدال اور رفقاء شامل ہیں) حضرت معروف کرخیؒ امام احمد بن حنبلؒ، بشیر الحافیؒ منصور بن عمارؒ، جنید بغدادیؒ سری سقطیؒ، سہیل بن عبداللہ تستری اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حاضرین مجلس نے پوچھا شیخ عبدالقادر جیلانی کون بزرگ ہیں؟"

"شیخ پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہو گا" آپ نے تعارف پیش کیا "ایک عجمی شریعت النسب، صدیقین و اقطاب دوراں میں منفرد ہستی کا حامل ہو گا"

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے غوث پاک جلالی و جمالی صفات کا دلنواز مرقع تھے ایک نظر میں خلق خدا کے دلوں کو دھندلا دینے والی اشیاء کو پہچان لینے کے بعد اس کا تدارک بھی فرما دیتے۔ شیخ مظفر بن مبارک واسطی المعروف شیخ حداد عنفوان شباب میں خدمت غوث پاک میں حاضر ہوئے ان کے پاس فلسفے کی ایک مشہور کتاب تھی جو شیخ حداد کو دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ غوث پاک نے نووارد کی بغل میں کتاب پر نگاہ ڈالی اور بند کتاب کا مفہوم فراست قطبیت سے سمجھ لیا اور کہا "صاحب زادے! یہ کتاب مار آستین سے کم نہیں اس کے حروف کو دھو ڈال"

پہلے تو شیخ حداد کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آسکا بات جب پلے پڑی تو وہ بے حد پیشان ہوئے۔ کتاب سے جدائی بھی ناقابل برداشت تھی اور حکم غوث بھی ٹالا نہیں جا سکتا تھا اسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ ان کو ایک ترکیب سوجھی "کتاب کسی ایسی جگہ چھپا دیتا ہوں جو ہر نظر سے اوجھل ہو بعد میں چپکے سے اٹھا لوں گا" یہ سوچ کر شیخ حداد اٹھنے لگے تو محسوس ہوا کہ ہاتھ پاؤں نے علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ وہ تو گویا مفلوج سے ہو کر رہ گئے۔ ادھر غوث پاک نے زیر لب مسکرا کر دیکھا۔ ان نظروں کا مفہوم شیخ حداد نے کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیا۔

"عزیزم، ادھر لاؤ یہ کتاب" غوث پاک نے بڑی رسان سے کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ شیخ حداد نے کتاب پیش کرنے سے پہلے ایک حسرت بھری نگاہ سے اس کی ورق گردانی کرنا چاہی مگر وہ حسرت بھری نگاہیں، ورطہ حیرت میں ڈوب گئیں۔ کتاب کے حروف غائب ہو چکے تھے بہرحال وہ "سادہ کاپی" شیخ حداد نے غوث پاک کے حوالے کر دی۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے ورق گردانی کرتے ہوئے فرمایا "کتنی مبارک ہے یہ کتاب، ابن ضریس محمد کی فضائل قران ہے نا" کتاب شیخ حداد کے پاس پہنچی تو وہ واقعی "فضائل قران" از ابن ضریس بن چکی تھی خط بھی بڑا دل کش تھا۔

"اپنی زبان اور دل کا رشتہ مضبوط بنا لو، زبان اور دل میں تضاد بندے کو لے ڈوبتا ہے" غوث پاک نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا۔ "اب رخصت ہو جاؤ"

شیخ حداد محفل سے نکلے تو فلسفے کے سارے اسباق ذہن سے مٹ چکے تھے بالکل کتاب کے اوراق کی طرح دوسرے روز شیخ حداد دلی رغبت اور روح کا میدان لے کر خدمت غوث پاک میں حاضر ہوئے۔ خود آمدید بھی اسی انداز میں کہا گیا۔ اسی محفل میں کسی شخص نے ایک بزرگ کا قصہ چھیڑ دیا جو صاحب کشف و کرامت تھا۔ اس کے زہد و تقوے کی بڑی دھوم تھی قصہ گو نے بڑے دکھ سے کہا "وہ بزرگ کہتا ہے کہ وہ یونس بن متی علیہ السلام سے بلند مقام پر فائز ہو چکا ہے۔"

یہ سنتا تھا کہ غوث پاک کی آنکھوں سے گویا شعلے برسنے لگے۔ "کوئی ولی شان نبوت کی ہمسری نہیں کر سکتا" آپ نے فیصلہ صادر فرما دیا۔ پھر اپنے قریب پڑے تکیئے کو پکڑ کر مسلنا شروع کر دیا۔ "یہ وہ ناپاک دل ہے جس میں ابلیس گھر کر چکا تھا تو ہم نے اسے مسل ڈالا" یہ سنتے ہی محفل سے کچھ لوگ فوراً" اس بزرگ کے گھر کی طرف دوڑے۔ وہاں تو کہرام مچا تھا۔

مریدان باوفا آہ وفغاں میں مشغول تھے” ہمارے شیخ اچھے خاصے بیٹھے ہم سے محو کلام تھے کہ اچانک گر کر تڑپنے لگے“ سب نے بیک زبان صورت حال کی وضاحت کی۔ بعد میں یہی بزرگ اپنے ایک مرید کو خواب میں بڑے خوش و خرم دکھائی دیئے اور اپنی شادمانی کا سبب

یوں بیان کیا "اگرچہ میری لغزش ناقابل معافی و تلافی تھی مگر شیخ عبدالقادرؒ کی دعاؤں کے طفیل میرا ناپسندیدہ قول حضرت یونسؑ نے معاف فرما دیا اور اس طرح خالق کائنات نے بھی مجھے تجسّس سے نوازا۔" "جو شخص اللہ کی محبت کا دم بھرتا ہے وہ اس کے بندوں سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔" غوث پاک مجلس خاص میں ارشادات عالیہ سے نواز رہے تھے۔ "گناہ بندے کی ذات نہیں اس کی صفت ہے۔ گناہ قابل نفرت سہی مگر بندہ قابل نفرت نہیں ہونا چاہئے۔ قلب انسانی کی مثال آئینے کی سی ہوتی ہے جو گناہوں سے دھندلا جائے تو دست ہنرمند اسے صیقل کر سکتا ہے۔ دھندلائے ہوئے آئینے کو توڑ دینا دانش مندی نہیں۔" یہ کہہ کر اچانک آپ خاموش ہو گئے اور سلسلہ کلام موقوف کر کے معذرت کرتے ہوئے مجلس سے باہر نکل گئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ جاتی دفعہ اپنا مصلیٰ بھی اٹھا کر لے گئے۔ اکثر حضرات مزاج آشنا تھے لٰہذا وہ مہر بہ لب رہے۔ وہ جانتے تھے کہ غوث پاک کا کوئی عمل مقصد سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات کہ ظاہر کی آنکھ اس مقصد سے آشنا نہ ہو سکے۔

گھر سے نکل کر آپ اپنے پڑوسی عبداللہ بن نقطہ کے ہاں پہنچے وہاں عجیب دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ قمار بازوں کا گروہ، اپنے کام میں مشغول تھا۔ شطرنج کی بساط بچھی تھی اور عبداللہ شرط لگا کر کھیل رہا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ غوث پاک کا پڑوسی اس روز مسلسل ہارتا چلا گیا _ نقدی، زیورات حتیٰ کہ اپنا مکان بھی اس نے داؤ پر لگا دیا اور وہ بھی ہار گیا۔ "جوا کسی کا نہ ہوا۔" کے مصداق وہ مفلس و قلاش ہو گیا تو ہارے ہوئے جواری کی طرح دل شکستہ ہو کر بیٹھ گیا۔ جیتنے والوں نے آخری بازی لگانے پر اکسایا "اب تو میرے پاس ہارنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔" عبداللہ نے رحم طلب نظروں سے دشمن دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہارے پاس بہت کچھ ہے" جیتنے والے شخص نے کہا "اپنا ہاتھ داؤ پر لگا دو۔ شرط یہ ہوئی کہ جیتنے والا شکست خوردہ کا ہاتھ قلم کر دے۔"

"مجھے منظور ہے اگر میں جیت گیا تو ہاتھ قلم کرنے کے بجائے اپنا ہارا ہوا مکان واپس لے لوں گا۔" عبداللہ نے شرط میں ترمیم پیش کی جو حریف نے قبول کر لی۔ بازی کا آغاز ہوا تو قسمت پھر دغا دے گئی۔ جب غوث پاک پڑوسی کے دولت خانے میں داخل ہوئے تو وہاں عبداللہ کا ہاتھ قلم کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اور خنجر آب دار کو دیکھ عبداللہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ غوث پاک تو کشف سے سب کچھ سمجھ چکے تھے قمار باز البتہ ان کی آمد پر حیران و ششدر

رہ گئے۔ آئینہ دل جب تک بالکل سیاہ نہ ہو جائے گنہگار حضرات، اللہ والوں کا احترام، عام انسانوں سے زیادہ کرتے ہیں کہ ان کو اپنی بے سروسامانی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ احساس زیاں کا مٹ جانا تو خیر پستی کا آخری درجہ ہوتا ہے جو بہت دیر میں آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ واپسی کے کئی راستے ہوتے ہیں۔ مختصر سے لے کر مختصر ترین بھی۔ بعض اوقات تو منزل واقعی ایک پل کی مسافت پر موجود ہوتی ہے۔ بشرطیکہ قدم صدق دل سے اٹھایا جائے۔

"جناب آپ؟" قمار بازوں نے بیک زبان پوچھا۔

"محترم حضرات! میں اپنے پڑوسی نیک دل عبداللہ کی مدد کو آیا ہوں" غوث پاک نے سرسری لہجے میں فرمایا۔ "معلوم ہوتا ہے آج ہمارا دوست بدنصیب ثابت ہو رہا ہے؟" پھر آپ نے اپنا مصلی عبداللہ کی طرف بڑھایا۔ "لو عزیزم، ہمارا مصلی داؤ پر لگا دو، مگر احتیاط سے کھیلنا شکست کا الزام ہمیں نہ دینا۔ پہلے تو وہ جواری لوگ ذرا حیران ہوئے پھر انہوں نے غوث پاک کے مصلے کو داؤ پر لگانا قبول کر لیا۔ غوث پاک واپس ہوئے تو شدت کرب سے ان کی آنکھوں میں آنسو آچکے تھے۔ وہ دل جو صبر و استقلال کا پہاڑ تھا، جسے جنگلوں ویرانوں میں شیاطین عاجز نہ کر سکے وہ رو رہا تھا۔ بھوک پیاس کی یلغار۔ جاں لیوا تکالیف جن مبارک آنکھوں میں نمی پیدا نہ کر سکیں اور جو پلکیں آنسوؤں سے ناآشنا تھیں وہ ایک گناہوں کی دلدل میں ڈوبے انسان کی رائیگانی پر اشکوں سے تر تھیں۔ جب آپ محفل میں واپس آئے تو مزاج آشنا بھی پلکوں پر لرزتے آنسو دیکھ کر بیتاب ہو گئے۔

"حضور! کیا کسی سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی، ان آنکھوں میں آشکوں کا سبب؟" تمام دلوں کا مدعا زبانوں پر آگیا۔

"کوئی خاص بات نہیں عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔" غوث پاک نے سب کو تسلی و تشفی سے نوازا اور سلسلہ کلام کا از سر نو آغاز کیا۔ یہ محفل کافی طویل ثابت ہوئی۔ ادھر غوث پاک کے پڑوسی نے وہ مصلے داؤ پر لگا کر کھیل کا آغاز کیا جو غوث الثقلین، محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی کی روشن جبیں کا محرم راز تھا۔ کھیل کا پانسہ پلٹ گیا۔ جیتنے والے شکست پہ شکست کھاتے چلے گئے۔ عبداللہ بن نقطہ نے اپنا سب کچھ جیت لیا اور مصلی لے کر خدمت غوث میں حاضر ہوا جہاں افق طریقت کے درخشندے ستارے اور وہ بھی ایک سے ایک بڑھ کر تشریف فرما تھے۔ غوث اعظم ان درخشاں ستاروں میں ماہ کامل کی صورت نور رشد و

ہدایت بکھیر رہے تھے۔

"آؤ عبداللہ اس محفل میں خوش آمدید، کہو کیسی رہی؟" غوث پاک نے گنہگار کا بھرم رکھتے ہوئے اشارے کنائے میں بات کی۔

"جناب اللہ تعالیٰ کا اتنا کرم ہوا کہ بس تنگی داماں کا احساس ہونے لگا" عبداللہ اس پردہ پوشی پر دل ہی دل میں قربان ہو رہا تھا۔

"پیاسے ہو، اسی لئے سادہ پانی بھی لذیز لگتا ہے" غوث الاعظم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عبداللہ ایسا بیٹھا کہ بس اسی آستانے کا غلام ہو گیا۔ دوسرے دن وہ اپنے گھر گیا اور سارا مال و متاع راہ خدا میں خیرات کر کے پھر اسی محفل میں آبیٹھا۔ آستانے کے خادم نے دبے الفاظ میں پوچھا "بھائی اپنے لئے بھی کچھ بچایا ہے یا سب کچھ خیرات کر دیا؟"

"جو کچھ میرے پاس بچ رہا ہے وہ ہفت اقلیم کے خزانوں سے بھی زیادہ ہے۔" عبداللہ نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

کہتے ہیں غوث الاعظم کی نظر کرم سے عبداللہ بغداد کا دیانت دار و امین تاجر مشہور ہو گیا۔ دو سو دینار تک یومیہ آمدن ہو گئی مگر راہ خدا میں خرچ کرنے کا ایسا چسکا پڑا کہ ساری آمدنی غربا و مساکین کو کھانا کھلانے میں خرچ کر دیتا اور نماز عشاء سے پہلے دسترخوان جھاڑ کر کہتا "لو جناب آج کا حساب بے باق کل سے نیا حساب شروع" غوث پاک اپنے "نوگرفتار" سے مہر محبت کا سلوک فرماتے اور عبداللہ تو خیر کشتگان غوث میں داخل ہو ہی چکا تھا۔

ایک بار آپ نے عجیب و غریب خطاب فرمایا "مرد کامل وہ ہے جو تقدیر سے جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ کیسا مرد ہے جو تقدیر کے سامنے سرنگوں ہو جائے؟" گویا صدیوں بعد جو نعرہ مستانہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے بلند کیا تھا۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تو وہ کوئی غلط نہیں تھا شرط صرف یہ ہے کہ وہ نگاہ، ایک مرد مومن کی ہونی چاہئے۔

آیئے دیکھتے ہیں علامہ موصوف کیسی نگاہ کی طرف ہماری راہ نمائی فرماتے ہیں۔ ابوالمظفر حسن بن نعیم ایک تاجر شیخ حماد بن مسلم کا عقیدت مند تھا سفر سے پہلے وہ شیخ حماد کی خدمت حاضری دیا کرتا تھا حسب دستور وہ شیخ حماد کی خدمت میں حاضر ہوا اور دعائے خیر کی درخواست

پیش کی۔ حضور! اس بار ملک شام جا رہا ہوں سات سو دینار کی سرمایہ کاری کی ہے۔ دعاؤں سے فیض یاب ہونے حاضر ہوا ہوں۔"

شیخ حماد مراقبے میں گئے اور پھر گھبرا کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ "بہتر ہے یہ سفر ملتوی کر دو۔" انہوں نے وضاحت فرمائی "اس سال اگر تم سفر کرو گے تو وہ سفر آخرت ہو گا۔ کیونکہ تم قتل کر دیئے جاؤ گے یہی لوح محفوظ پر مرقوم ہے۔"

حسن بن نعیم مغموم صورت بنائے درس گاہ حمادؒ نکلا راستے میں غوث الاعظم سے ملاقات ہو گئی۔ (یہ واقعہ ان کے عہد شباب کا ہے) غرض مند تو ویسے بھی دیوانہ ہوتا ہے اگرچہ ہر ایک سے مصیبت کا احوال کہنا بذات خود ایک مصیبت سے کم نہیں لیکن مصیبت اگر موت کی صورت' دندان ہلاکت کے ساتھ منتظر ہو تو حال دل سنانا دشوار نہیں ہوتا۔ تاجر نے من و عن شیخ حماد سے ملاقات کا حال بیان کیا اور اس لب و لہجے میں "گویا دست وفا پر دل سجا کر پیش کر دیا۔ غوث پاک نے داستان غم سماعت فرمائی اور مراقبے میں تشریف لے گئے۔ تاجر بیم و رجا کی حالت میں رخ انور کا نظارہ کرنے لگا۔ ہر پل اس پر قیامت گزر رہی تھی قربت غوث کا فیض تھا کہ خود تاجر کا احساس بے دار ہو چکا تھا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ گلاب کے پودے تلے کی مٹی بھی مہکنے لگتی ہے لہٰذا چشم تصور سے تاجر حسن کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آخر جب وہ اپنے اضطراب پر قابو نہ رکھ سکا تو لپک کر غوث پاک کے قدموں سے لپٹ گیا اور کیفیت مراقبہ مجروح ہو گئی۔ یہ اگرچہ غایت درجے کی بے ادبی تھی مگر الاعمال بالنیات کے مصداق اس کی نیت خراب نہ تھی۔ حالت عشق و مستی میں سرزد ہونے والی کوئی حرکت بے ادبی کے زمرے میں نہیں آتی۔ غوث پاک نے اس دیوانے کو بغور دیکھا اور زیر لب تبسم سے فرمایا۔ "سودائی! میرے پاؤں تو چھوڑ" "حضور! میں ٹھہرا تاجر۔ اب مفت میں یہ پاؤں چھوڑنے سے تو رہا" غوث پاک کے تبسم نے تاجر کو تقویت بخشی۔

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم شوق فزا ہوتا ہے

"خدا تیری عمر دراز کرے پاؤں چھوڑ اور آرام سے میری بات سن" غوث پاک نے دست کرم اس تاجر کے سر پر رکھ کر فرمایا "تو سفر پر جا انشاء اللہ فائدے میں رہے گا۔"

تاجر اپنی سلامتی کی ضمانت لے کر واپس آیا تو زیر لب مسکرا کر کہہ رہا تھا "اب دیکھتا

ہوں موت میرا کیا بگاڑ لیتی ہے۔" مناقب غوث پاک کی ساری کتب گواہ ہیں کہ حسن بن نعیم ملک شام میں اپنا تجارتی مال فروخت کر کے واپس آیا اس سفر میں اس کو تین سو دینار کا فائدہ ہوا۔ یعنی سات سو دینار کا مال اس نے ایک ہزار دینار میں فروخت کیا۔ اس کے بعد ظہور پذیر ہونے والے واقعات البتہ صورت حال کی مکمل وضاحت کرتے ہیں کس طرح اور کیسے ہوا اس سے بحث نہیں۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ کیا ہوا؟ بغداد میں یہ ہوا کہ حسن بن نعیم جب صحیح سلامت، سفر سے واپس آ رہا تھا تو حلب کے ایک حمام میں گیا۔ ہزار دینار والی تھیلی حمام کے طاق میں بھول کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا اس رات اس نے بڑا بھیانک خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ شام سے واپس آنے والے اس کے قافلے پر راہزنوں نے حملہ کر دیا ہے اور سارا مال و متاع لوٹ کر اہل قافلہ کے ہر فرد کو قتل کر دیا ہے۔ ایک راہزن نے حسن بن نعیم کی گردن پر بھی مہلک وار کیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ حسن ہڑبڑا کر خواب سے بے دار ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو وہ خواب کی دہشت سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا گویا سینے کے حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے گا اور سب سے حیران کن بات یہ کہ گردن پر نہ صرف ضرب کی شدت کا احساس تھا بلکہ خون کا نشان بھی موجود تھا۔ اور آخری بات یہ کہ اسے اپنے ہزار دینار والی تھیلی بھی یاد آ گئی۔ وہ بھاگم بھاگ حمام میں پہنچا تو اس کا سارا سرمایہ محفوظ تھا۔ اس نے تھیلی قبضے میں کی اور سوئے بغداد چل پڑا۔ بخیر و عافیت شہر میں داخل ہوا تو معمر بزرگ ہونے کے ناطے اس نے سب سے پہلے شیخ حماد سے ملاقات کی۔ ولی اللہ کی توہین و تضحیک مطلوب تھی نہ ان کو غلط ثابت کرنا۔ ان کی عمر کا تقاضہ تھا کہ پہلی ملاقات ان ہی سے کی جائے۔ شیخ حماد تاجر کو دیکھتے ہی کھل اٹھے۔ "آؤ برخوردار، تمہیں زندہ سلامت دیکھ کر عبدالقادر کے مقام و مرتبے کا صحیح ادراک ہوا۔" شیخ حماد نے واقعات کی وضاحت کر دی" لوح محفوظ پر تمہارا قتل مرقوم تھا، ایک دو بار نہیں ستر بار شیخ عبدالقادرؒ نے تمہارے حق میں دعائے خیر کی اس طرح عالم بے داری والا قتل، عالم خواب میں تبدیل کر دیا گیا اور تمہاری تقدیر میں لٹ جانے والے مال کو نسیان میں بدل ڈالا گیا اس بنا پر تم اپنی تھیلی حمام کے طاق میں بھول گئے تھے۔ بہر حال مال سے محروم تو ہوئے اور تلخی قتل کا احساس بھی تمہیں دلا دیا گیا۔"

تاجر نے شیخ حماد کے ہاتھوں کو عقیدت بھرا بوسہ دیا اور غوث الاعظم کی خدمت میں

حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا "میرے محترم استاد شیخ حماد نے درست فرمایا ہے' تیری تقدیر بدلنے کے لئے مجھے واقعی ستر بار رب العزت کے حضور دست بہ دعا ہونا پڑا۔"

واقعی نگاہ مرد مومن سے تقدیر بدل جاتی ہے مگر اس شہادت گہ الفت میں قدم کون رکھے' کون راحت و آرام سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔ پہلے ان اولیائے کرام کی سنت پر کوئی عمل تو کر کے دکھائے آج بھی دہکتے شعلے انداز گلستان پیدا کرسکتے ہیں شرط فنائی الذات ہونا ہے لقمہ حرام سے شکم سیری کے بعد دست دعا بلند کرنا ہی حماقت ہے اور حماقت کی بلند پروازی کیا اور پائے عرش کو ہلانا کیسا۔

غوث پاک کے عقیدت مندوں میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ رنگین مزاج بھی یقیناً تھے مگر جب وہ "سایہ عافیت" میں آجاتے تو ان کے مزاج بھی بدل جاتے۔ انداز فکر میں تبدیلی پیدا کرنا معمولی کارنامہ نہیں ہوا کرتا۔ آپ کا ایک خادم خاص ایک رات' بار بار محتلم ہوا۔ ہر مرتبہ خواب میں ایک نئی "صورت" نظر آتی۔ بعض خواتین سے تو وہ آشنا تھا مگر بعض صورتیں اس کے لئے اجنبی تھیں۔ صبح وہ عالم پریشانی میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے لب کشائی کا موقع دیئے بغیر ہی خجالت سے بچالیا۔ <رات والے سارے واقعات کو بھول جاؤ لوح محفوظ پر مرقوم تھا کہ تم فلاں فلاں عورت سے زنا کا ارتکاب کرو گے۔" پھر آپ نے ان خواتین کے نام اور حلئے بیان فرمائے <مجھے تمہاری تباہی پسند نہ تھی لہٰذا میں نے رب العزت کے حضور دعا کی اور عالم بیداری میں وقوع پذیر ہونے والا ہر اختلاط' حالت خواب میں تبدیل کر دیا گیا۔" غوث پاک نے صورت حال کی وضاحت فرمائی تو خادم سجدۂ شکر بجالایا۔

بغداد کا ایک صاحب ثروت تاجر عبدالصمد بن ہمام علم کلام اور فلسفے کا ماہر بھی تھا۔ کرامات غوثیہ کو خلاف عقل قرار دینے میں مشہور تھا۔ اچانک ہی اس کی کایا پلٹ گئی۔ ہر روز کاروبار زندگی کا آغاز زیارت غوث پاک کے بعد کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی دیوانگی کے قصے بغداد کی گلیوں میں عام ہونے لگے۔ پڑھا لکھا صاحب حیثیت انسان تھا لوگ اس کی مالی حالت اور اثر و رسوخ کے پیش نظر ہر زیادتی نظر انداز کر جاتے لیکن نوبت بہ ایں جا رسید کہ وہ غوث پاک کے متعلق معمولی مخالفانہ گفتگو سن کر ہی آتش زیر پا ہو جاتا اور مرنے مارنے پر تل جاتا۔ "میں شیخ کائنات کی شان میں گستاخی کرنے والی زبان کو گدی سے نکال پھینکنے کی طاقت رکھتا ہوں جو چاہے اور جب چاہے آزما دیکھے۔" مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ اپنی کایا پلٹ

کیفیت کے راز میں کسی کو شریک نہیں کرتا تھا۔ غوث پاک کے علم میں فانی سے روپوش ہو جانے کے بعد اس نے اس راز سے پردہ ہٹایا جس کا متن پیش خدمت ہے۔ "یہ میری بد نصیبی کی انتہا تھی کہ میں آب حیات کے چشمے کو دیکھ کر بھی تشنہ لب رہا" عبدالصمدن بن ہمام نے کہا "سارا بغداد گواہ ہے کہ میں غوث پاک کی ہر کرامت کا نہ صرف منکر تھا بلکہ خلاف عقل ثابت کرنے میں بھی مشہور تھا ایک روز میں آپ کے مدرسے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اذان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے بیت الخلا جانے کی ہلکی سی حاجت محسوس ہوئی جو کوئی پریشانی والی بات نہ تھی کہ مجھے اپنے "نظام" پر بھروسہ تھا بہرحال میں نے یہی سوچا کہ نماز کے بعد حاجت سے فراغت حاصل کرلوں گا۔ لہٰذا میں مسجد میں داخل ہوا اور وضوع وغیرہ سے فارغ ہو کر منبر کے قریب اگلی صف میں جا بیٹھا۔ اس وقت قضاء حاجت کا احساس بھی مٹ چکا تھا اصل بد قسمتی یہ ہوئی کہ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ اس روز جمعہ کا دن تھا۔ مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تو مجھے احساس ہوا کہ آج تو جمعۃ المبارک ہے۔ غوث الثقلین منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ تقریر کا آغاز ہوا تو میری آزمائش کی گھڑی بھی سر پر آ پہنچی۔ خلق خدا کا ہجوم تھا اور مسجد سے باہر نکلنے کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ میں منبر کے بالکل قریب بیٹھا تھا مگر میری حالت متغیر ہونے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے مزید "ضبط" کیا تو میری جان ہی نکل جائے گی۔ بصورت دیگر میں خلق خدا کے سامنے ایسا تماشہ بن جاتا جس کے بعد شاید میں خودکشی پر مجبور ہو جاتا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کرب سے گزرے بغیر کوئی میری ابتلا کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ میرے منطقی دماغ نے اس ساری مصیبت کا ذمہ دار، منبر پر تقریر کرنے والی ہستی کو ٹھہرایا اور میرے بغض و عناد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس خیال سے میرا دم گھٹنے لگا کہ چند لمحوں بعد بھری دنیا میں میرا کیا حشر ہو گا۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

"میری گنہگار آنکھوں نے دیکھا کہ غوث الاعظم منبر سے نیچے اترے اور انہوں نے اپنی عبا میرے اوپر ڈال دی اس کے ساتھ ایک محیرالعقول بات بھی ہو چکی تھی اگر آپ لوگ یقین کریں تو اس کا اظہار بھی کئے دیتا ہوں" عبدالصمد بن ہمام نے جواب طلب نظروں سے سامعین کی طرف دیکھا۔

"اور وہ محیرالعقول واقعہ کیا تھا" یک از سامعین نے پوچھا۔

جس لمحے غوث الاعظم کا نورانی پیکر مجھے اپنی عبا اوڑھا رہا تھا‘ اس وقت ان کا ایک پیکر سر منبر تقریر بھی کر رہا تھا گویا مسجد میں کسی شخص کو احساس تک نہ ہونے پایا کہ مجھے عبا سے ڈھانپ دیا گیا ہے کیونکہ خطاب کا سلسلہ منقطع ہی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو ایک سرسبز و شاداب جنگل میں پایا قریب ہی ایک چشمہ بھی جاری تھا۔ میری مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ میں نے بول و براز سے فارغ ہو کر اس چشمے کے شفاف پانی سے وضو کیا پھر دو رکعت "تحیتہ الوضو" ادا کیں تب مجھ گناہ گار کے سر سے عبا ہٹا دی گئی۔ وہی جگہ تھی وہی مسجد‘ وہی میرا محبوب شیخ سر منبر خطاب فرما رہا تھا۔ میری حالت درست ہو چکی تھی اور وضو کے اثر سے میرے اعضا بھی بھیگے ہوئے تھے۔ اس وقت میری عقل زائل ہو گئی یہ سب کچھ مجھ پر بیتی تھی کوئی سنی سنائی بات نہ تھی میرا منطقی دماغ ساری صورت حال کی توجیہہ تلاش کرتے کرتے عاجز آگیا۔"

نماز اختتام پذیر ہوئی مسجد خالی ہو گئی شیخ مجھ پر اک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے رخصت ہو گئے میں اسی جگہ بیٹھا رہا۔ میرے رومال کے ساتھ ایک چابی بندھی تھی جو مجھے نہیں مل رہا تھا میں نے اپنی نشست کے قریب ادھر ادھر دیکھا مگر اپنی تلاش میں ناکام رہا۔ پھر مجھے یاد آگیا کہ اس چشمے کے کنارے جہاں میں نے وضو کیا تھا‘ ایک درخت کی شاخ پر میں نے اپنا رومال رکھا تھا‘ مگر وہ جگہ وہ مقام‘ جانے روئے زمین کے کس گوشے پر تھا۔ وہ چابی میرے لئے بڑی اہم تھی مگر اس جگہ کے متعلق میں کس سے دریافت کرتا اور کن الفاظ میں اپنے منطقی احباب کو یقین دلاتا۔ لہٰذا میں نے چپ سادھ لی۔ میری راتوں کی نیند اڑ چکی تھی اور دن کا چین حرام ہو چکا تھا۔" اس سارے واقعہ کی کوئی نہ کوئی عقلی دلیل ضرور ہو گی" سوتے جاگتے‘ اٹھتے بیٹھتے بس یہی خیال مجھے ستاتا رہتا۔"

چند روز بعد مجھے ایک طویل سفر درپیش ہوا۔ میں نے لوہار سے اپنے صندوق کی دوسری چابی بنوا کر ضروری سامان نکالا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ بغداد سے تین یوم کی مسافت طے کرنے کے بعد میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جو مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ شفاف پانی کا بہتا ہوا چشمہ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی۔ بالکل وہی مقام تھا جو میں عالم بے داری یا خواب یا مدہوشی میں دیکھ چکا تھا۔ اپنی اس کیفیت کو کن الفاظ کا لبادہ اوڑھاتا اور اسے کس نام سے یاد کرتا۔ میں مسجد میں بھی تھا اس چشمے کے کنارے بھی‘ خدا جانے میں کہاں تھا اور یہ

سب کیا تھا؟

<میرے ساتھیوں نے خیال ظاہر کیا قیام و طعام وغیرہ اور نماز کے لئے وہ جگہ مناسب ترین تھی' لہٰذا وہ سب عارضی پڑاؤ کے لئے تیار ہو گئے۔ میں متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دراصل مجھے اس درخت کی تلاش تھی جس کی شاخ کے ساتھ میں نے اپنا رومال ٹانگا تھا۔ آخر وہ درخت مجھے نظر آ ہی گیا۔ میں لپک کر آگے بڑھا تو میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا ۔ میری آنکھوں کے سامنے میرا گمشدہ رومال لٹک رہا تھا اور وہ چابی جس کی نقل میں نے لوہار سے بنوائی تھی اس رومال کے ساتھ منسلک تھی۔ تو گویا میں اپنے وجود' اپنی پوری شخصیت کے ساتھ بغداد سے تین یوم کی مسافت پر اس جگہ آیا تھا اور اس جگہ میں نے دو رکعت نماز بھی ادا کی تھی اور پھر میں پل بھر میں بغداد کی مسجد میں بھی موجود تھا۔”

<کیا سفر اور کیسا کاروبار حیات' میں سارے مکروہات زمانہ پر لات مار کر واپس بغداد آیا اور سیدھا اپنے محبوب شیخ پردہ پوش کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد والے واقعات سے آپ سب لوگ بخوبی واقف ہیں اور میری عقیدت کے گواہ' بغداد کے گلی کوچے ہیں۔ چونکہ میں اپنے محبوب کو اچھی طرح آزمانے کے بعد حلقہ بگوش عقیدت ہوا لہٰذا میرا مقام کوئی اتنا بلند نہیں اس لئے میں ہمیشہ مہر بہ لب رہا۔ عشق میں آزمانا گناہ کبیرہ شمار ہوتا ہے۔ میں اب بھی خاموش رہتا مگر میرے عزیز دوست ہم پیالہ ہم نوالہ ابوالیسر نے مجبور کیا کہ اس کی تفصیل سے ساری دنیا کو آگاہ کر کے گواہ بنا لوں اور اپنے تعلق کو دوام بخش دوں کیونکہ اپنے محبوب شیخ سے میرا یہی تعلق توشہ آخرت ہے ۔>

یہ روداد بیان کرنے کے بعد بغداد کا عبدالصمد' سامعین کے چہروں کو پڑھنے لگا۔ پھر مطمئن ہو کر خاموش ہو گیا۔ کیونکہ سامعین کو اس پر اعتبار آ گیا تھا ورنہ وہ دیوانہ مرنے مارنے پر تل جاتا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ عشق میں “لو کلام الفضہ السکوت الذہب” اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا۔”

اس عاشق غوث پاک کی ایک عادت بڑی عجیب تھی زکوٰۃ بڑی باقاعدگی سے ادا کرتا مگر مستحق و غیر مستحق لوگوں میں امتیاز کئے بغیر۔ بس جو سامنے آیا اسے سب کچھ تھما دیا۔ کسی بے تکلف دوست نے ایک بار اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے بڑا لاجواب' جواب دیا۔ “کیا میں اس نظر کرم کا مستحق تھا جس سے شیخ نے مجھے نوازا' جب اللہ تعالیٰ کرم نوازی کرتے وقت

مستحق اور غیر مستحق میں تمیز نہیں فرماتا تو بندے کو بھی راہ خدا میں خرچ کرتے وقت اس امتیاز سے گریز کرنا چاہئے۔" ویسے یہ نکتہ مجھے میرے شیخ نے تعلیم کیا تھا" آخری فقرہ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا کیونکہ اس کا دوست اسے ہضم نہیں کر سکتا تھا۔

یوں بیان کیا "اگرچہ میری لغزش ناقابل معافی و تلافی تھی مگر شیخ عبدالقادرؒ کی دعاؤں کے طفیل میرا ناپسندیدہ قول حضرت یونسؑ نے معاف فرما دیا اور اس طرح خالق کائنات نے بھی مجھے تجسّس سے نوازا۔" "جو شخص اللہ کی محبت کا دم بھرتا ہے وہ اس کے بندوں سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔" غوث پاک مجلس خاص میں ارشادات عالیہ سے نواز رہے تھے۔ "گناہ بندے کی ذات نہیں اس کی صفت ہے۔ گناہ قابل نفرت سہی مگر بندہ قابل نفرت نہیں ہونا چاہئے۔ قلب انسانی کی مثال آئینے کی سی ہوتی ہے جو گناہوں سے دھندلا جائے تو دست ہنرمند اسے صیقل کر سکتا ہے۔ دھندلائے ہوئے آئینے کو توڑ دینا دانش مندی نہیں۔" یہ کہہ کر اچانک آپ خاموش ہو گئے اور سلسلہ کلام موقوف کر کے معذرت کرتے ہوئے مجلس سے باہر نکل گئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ جاتی دفعہ اپنا مصلیٰ بھی اٹھا کر لے گئے۔ اکثر حضرات مزاج آشنا تھے لہٰذا وہ مہر بہ لب رہے۔ وہ جانتے تھے کہ غوث پاک کا کوئی عمل مقصد سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات کہ ظاہر کی آنکھ اس مقصد سے آشنا نہ ہو سکے۔

گھر سے نکل کر آپ اپنے پڑوسی عبداللہ بن نقطہ کے ہاں پہنچے وہاں عجیب دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ قمار بازوں کا گروہ، اپنے کام میں مشغول تھا۔ شطرنج کی بساط بچھی تھی اور عبداللہ شرط لگا کر کھیل رہا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ غوث پاک کا پڑوسی اس روز مسلسل ہارتا چلا گیا _ نقدی، زیورات حتیٰ کہ اپنا مکان بھی اس نے داؤ پر لگا دیا اور وہ بھی ہار گیا۔ "جوا کسی کا نہ ہوا۔" کے مصداق وہ مفلس و قلاش ہو گیا تو ہارے ہوئے جواری کی طرح دل شکستہ ہو کر بیٹھ گیا۔ جیتنے والوں نے آخری بازی لگانے پر اکسایا "اب تو میرے پاس ہارنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔" عبداللہ نے رحم طلب نظروں سے دشمن دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہارے پاس بہت کچھ ہے" جیتنے والے شخص نے کہا "اپنا ہاتھ داؤ پر لگا دو۔ شرط یہ ہوئی کہ جیتنے والا شکست خوردہ کا ہاتھ قلم کر دے۔"

"مجھے منظور ہے اگر میں جیت گیا تو ہاتھ قلم کرنے کے بجائے اپنا ہارا ہوا مکان واپس لے لوں گا۔" عبداللہ نے شرط میں ترمیم پیش کی جو حریف نے قبول کر لی۔ بازی کا آغاز ہوا تو قسمت پھر دغا دے گئی۔ جب غوث پاک پڑوسی کے دولت خانے میں داخل ہوئے تو وہاں عبداللہ کا ہاتھ قلم کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اور خنجر آب دار کو دیکھ عبداللہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ غوث پاک تو کشف سے سب کچھ سمجھ چکے تھے قمار باز البتہ ان کی آمد پر حیران و ششدر

رہ گئے۔ آئینہ دل جب تک بالکل سیاہ نہ ہو جائے گنہگار حضرات ' اللہ والوں کا احترام ' عام انسانوں سے زیادہ کرتے ہیں کہ ان کو اپنی بے سرو سامانی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ احساس زیاں کا مٹ جانا تو خیر پستی کا آخری درجہ ہوتا ہے جو بہت دیر میں آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ واپسی کے کئی راستے ہوتے ہیں۔ مختصر سے لے کر مختصر ترین بھی۔ بعض اوقات تو منزل واقعی ایک پل کی مسافت پر موجود ہوتی ہے۔ بشرطیکہ قدم صدق دل سے اٹھایا جائے۔

”جناب آپ؟“ قمار بازوں نے بیک زبان پوچھا۔

”محترم حضرات! میں اپنے پڑوسی نیک دل عبداللہ کی مدد کو آیا ہوں“ غوث پاک نے سرسری لہجے میں فرمایا۔ <معلوم ہوتا ہے آج ہمارا دوست بدنصیب ثابت ہو رہا ہے؟“ پھر آپ نے اپنا مصلی عبداللہ کی طرف بڑھایا۔ ”لو عزیزم' ہمارا مصلی داؤ پر لگا دو' مگر احتیاط سے کھیلنا شکست کا الزام ہمیں نہ دینا۔ پہلے تو وہ جواری لوگ ذرا حیران ہوئے پھر انہوں نے غوث پاک کے مصلے کو داؤ پر لگانا قبول کر لیا۔ غوث پاک واپس ہوئے تو شدت کرب سے ان کی آنکھوں میں آنسو آچکے تھے۔ وہ دل جو صبر و استقلال کا پہاڑ تھا' جسے جنگلوں ویرانوں میں شیاطین عاجز نہ کر سکے وہ رو رہا تھا۔ بھوک پیاس کی یلغار۔ جاں لیوا تکالیف جن مبارک آنکھوں میں نمی پیدا نہ کر سکیں اور جو پلکیں آنسوؤں سے ناآشنا تھیں وہ ایک گناہوں کی دلدل میں ڈوبے انسان کی رائیگانی پر اشکوں سے تر تھیں۔ جب آپ محفل میں واپس آئے تو مزاج آشنا بھی پلکوں پر لرزتے آنسو دیکھ کر بیتاب ہو گئے۔

”حضور! کیا کسی سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی' ان آنکھوں میں آشکوں کا سبب؟“ تمام دلوں کا مدعا زبانوں پر آ گیا۔

”کوئی خاص بات نہیں عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔“ غوث پاک نے سب کو تسلی و تشفی سے نواز اور سلسلہ کلام کا از سر نو آغاز کیا۔ یہ محفل کافی طویل ثابت ہوئی۔ ادھر غوث پاک کے پڑوسی نے وہ مصلے داؤ پر لگا کر کھیل کا آغاز کیا جو غوث الثقلین' محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی کی روشن جبیں کا محرم راز تھا۔ کھیل کا پانسہ پلٹ گیا۔ جیتنے والے شکست پہ شکست کھاتے چلے گئے۔ عبداللہ بن نقطہ نے اپنا سب کچھ جیت لیا اور مصلی لے کر خدمت غوث میں حاضر ہوا جہاں افق طریقت کے درخشندے ستارے اور وہ بھی ایک سے ایک بڑھ کر تشریف فرما تھے۔ غوث الاعظم ان درخشاں ستاروں میں ماہ کامل کی صورت نور رشد و

ہدایت بکھیر رہے تھے۔

"آؤ عبداللہ اس محفل میں خوش آمدید' کہو کیسی رہی؟" غوث پاک نے گنہگار کا بھرم رکھتے ہوئے اشارے کنائے میں بات کی۔

"جناب اللہ تعالیٰ کا اتنا کرم ہوا کہ بس تنگی داماں کا احساس ہونے لگا" عبداللہ اس پردہ پوشی پر دل ہی دل میں قربان ہو رہا تھا۔

"پیاسے ہو' اسی لئے سادہ پانی بھی لذیز لگتا ہے "غوث الاعظم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عبداللہ ایسا بیٹھا کہ بس اسی آستانے کا غلام ہو گیا۔ دوسرے دن وہ اپنے گھر گیا اور سارا مال و متاع راہ خدا میں خیرات کر کے پھر اسی محفل میں آبیٹھا۔ آستانے کے خادم نے دبے الفاظ میں پوچھا "بھائی اپنے لئے بھی کچھ بچایا ہے یا سب کچھ خیرات کر دیا؟"

"جو کچھ میرے پاس بچ رہا ہے وہ ہفت اقلیم کے خزانوں سے بھی زیادہ ہے۔" عبداللہ نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

کہتے ہیں غوث الاعظم کی نظر کرم سے عبداللہ بغداد کا دیانت دار و امین تاجر مشہور ہو گیا۔ دو سو دینار تک یومیہ آمدن ہو گئی مگر راہ خدا میں خرچ کرنے کا ایسا چسکا پڑا کہ ساری آمدنی غربا و مساکین کو کھانا کھلانے میں خرچ کر دیتا اور نماز عشاء سے پہلے دستر خوان جھاڑ کر کہتا "لو جناب آج کا حساب بے باق کل سے نیا حساب شروع" غوث پاک اپنے "نو گرفتار" سے مہر محبت کا سلوک فرماتے اور عبداللہ تو خیر کشتگان غوث میں داخل ہو ہی چکا تھا۔

ایک بار آپ نے عجیب و غریب خطاب فرمایا "مرد کامل وہ ہے جو تقدیر سے جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ کیسا مرد ہے جو تقدیر کے سامنے سرنگوں ہو جائے؟" گویا صدیوں بعد جو نعرہ مستانہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے بلند کیا تھا۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تو وہ کوئی غلط نہیں تھا شرط صرف یہ ہے کہ وہ نگاہ' ایک مرد مومن کی ہونی چاہئے۔

آیئے دیکھتے ہیں علامہ موصوف کیسی نگاہ کی طرف ہماری راہ نمائی فرماتے ہیں۔ ابوالمظفر حسن بن نعیم ایک تاجر شیخ حماد بن مسلم کا عقیدت مند تھا سفر سے پہلے وہ شیخ حماد کی خدمت حاضری دیا کرتا تھا حسب دستور وہ شیخ حماد کی خدمت میں حاضر ہوا اور دعائے خیر کی درخواست

پیش کی۔ حضور! اس بار ملک شام جا رہا ہوں سات سو دینار کی سرمایہ کاری کی ہے۔ دعاؤں سے فیض یاب ہونے حاضر ہوا ہوں۔“

شیخ حماد مراقبے میں گئے اور پھر گھبرا کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ”بہتر ہے یہ سفر ملتوی کر دو۔“ انہوں نے وضاحت فرمائی ”اس سال اگر تم سفر کرو گے تو وہ سفر آخرت ہو گا۔ کیونکہ تم قتل کر دیئے جاؤ گے یہی لوح محفوظ پر مرقوم ہے۔“

حسن بن نعیم مغموم صورت بنائے درس گاہ حمادؒ نکلا راستے میں غوث الاعظم سے ملاقات ہو گئی۔ (یہ واقعہ ان کے عہد شباب کا ہے) غرض مند تو ویسے بھی دیوانہ ہوتا ہے اگرچہ ہر ایک سے مصیبت کا احوال کہنا بذات خود ایک مصیبت سے کم نہیں لیکن مصیبت اگر موت کی صورت' دندان ہلاکت کے ساتھ منتظر ہو تو حال دل سنانا دشوار نہیں ہوتا۔ تاجر نے من و عن شیخ حماد سے ملاقات کا حال بیان کیا اور اس لب و لہجے میں ”گویا دست وفا پر دل سجا کر پیش کر دیا۔ غوث پاک نے داستان غم سماعت فرمائی اور مراقبے میں تشریف لے گئے۔ تاجر بیم و رجا کی حالت میں رخ انور کا نظارہ کرنے لگا۔ ہر پل اس پر قیامت گزر رہی تھی قربت غوث کا فیض تھا کہ خود تاجر کا احساس بے دار ہو چکا تھا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ گلاب کے پودے تلے کی مٹی بھی مہکنے لگتی ہے لہٰذا چشم تصور سے تاجر حسن کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آخر جب وہ اپنے اضطراب پر قابو نہ رکھ سکا تو لپک کر غوث پاک کے قدموں سے لپٹ گیا اور کیفیت مراقبہ مجروح ہو گئی۔ یہ اگرچہ غایت درجے کی بے ادبی تھی مگر الاعمال بالنیات کے مصداق اس کی نیت خراب نہ تھی۔ حالت عشق و مستی میں سرزد ہونے والی کوئی حرکت بے ادبی کے زمرے میں نہیں آتی۔ غوث پاک نے اس دیوانے کو بغور دیکھا اور زیر لب تبسم سے فرمایا۔ ”سودائی! میرے پاؤں تو چھوڑ“ ”حضور! میں ٹھہرا تاجر۔ اب مفت میں یہ پاؤں چھوڑنے سے تو رہا“ غوث پاک کے تبسم نے تاجر کو تقویت بخشی۔

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم شوق فزا ہوتا ہے

”خدا تیری عمر دراز کرے پاؤں چھوڑ اور آرام سے میری بات سن“ غوث پاک نے دست کرم اس تاجر کے سر پر رکھ کر فرمایا ”تو سفر پر جا انشاءاللہ فائدے میں رہے گا۔“

تاجر اپنی سلامتی کی ضمانت لے کر واپس آیا تو زیر لب مسکرا کر کہہ رہا تھا ”اب دیکھتا

ہوں موت میرا کیا بگاڑ لیتی ہے۔" مناقب غوث پاک کی ساری کتب گواہ ہیں کہ حسن بن نعیم ملک شام میں اپنا تجارتی مال فروخت کر کے واپس آیا اس سفر میں اس کو تین سو دینار کا فائدہ ہوا۔ یعنی سات سو دینار کا مال اس نے ایک ہزار دینار میں فروخت کیا۔ اس کے بعد ظہور پذیر ہونے والے واقعات البتہ صورت حال کی مکمل وضاحت کرتے ہیں کس طرح اور کیسے ہوا اس سے بحث نہیں۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ کیا ہوا؟ بغداد میں یہ ہوا کہ حسن بن نعیم جب صحیح سلامت سفر سے واپس آرہا تھا تو حلب کے ایک حمام میں گیا۔ ہزار دینار والی تھیلی حمام کے طاق میں بھول کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا اس رات اس نے بڑا بھیانک خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ شام سے واپس آنے والے اس کے قافلے پر راہزنوں نے حملہ کر دیا ہے اور سارا مال و متاع لوٹ کر اہل قافلہ کے ہر فرد کو قتل کر دیا ہے۔ ایک راہزن نے حسن بن نعیم کی گردن پر بھی مہلک وار کیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ حسن ہڑبڑا کر خواب سے بے دار ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو وہ خواب کی دہشت سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا گویا سینے کے حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے گا اور سب سے حیران کن بات یہ کہ گردن پر نہ صرف ضرب کی شدت کا احساس تھا بلکہ خون کا نشان بھی موجود تھا۔ اور آخری بات یہ کہ اسے اپنے ہزار دینار والی تھیلی بھی یاد آ گئی۔ وہ بھاگم بھاگ حمام میں پہنچا تو اس کا سارا سرمایہ محفوظ تھا۔ اس نے تھیلی قبضے میں کی اور سوئے بغداد چل پڑا۔ بخیر و عافیت شہر میں داخل ہوا تو معمر بزرگ ہونے کے ناطے اس نے سب سے پہلے شیخ حماد سے ملاقات کی۔ ولی اللہ کی توہین و تضحیک مطلوب تھی نہ ان کو غلط ثابت کرنا۔ ان کی عمر کا تقاضہ تھا کہ پہلی ملاقات ان ہی سے کی جائے۔ شیخ حماد تاجر کو دیکھتے ہی کھل اٹھے۔ "آؤ برخوردار، تمہیں زندہ سلامت دیکھ کر عبدالقادر کے مقام و مرتبے کا صحیح ادراک ہوا۔" شیخ حماد نے واقعات کی وضاحت کر دی "لوح محفوظ پر تمہارا قتل مرقوم تھا، ایک دو بار نہیں ستر بار شیخ عبدالقادرؒ نے تمہارے حق میں دعائے خیر کی اس طرح عالم بے داری والا قتل، عالم خواب میں تبدیل کر دیا گیا اور تمہاری تقدیر میں لٹ جانے والے مال کو نسیان میں بدل ڈالا گیا اس بنا پر تم اپنی تھیلی حمام کے طاق میں بھول گئے تھے۔ بہرحال مال سے محروم تو ہوئے اور تلخی قتل کا احساس بھی تمہیں دلا دیا گیا۔"

تاجر نے شیخ حماد کے ہاتھوں کو عقیدت بھرا بوسہ دیا اور غوث الاعظم کی خدمت میں

حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا "میرے محترم استاد شیخ حماد نے درست فرمایا ہے' تیری تقدیر بدلنے کے لئے مجھے واقعی ستر بار رب العزت کے حضور دست بہ دعا ہونا پڑا۔"

واقعی نگاہ مرد مومن سے تقدیر بدل جاتی ہے مگر اس شہادت گہ الفت میں قدم کون رکھے' کون راحت و آرام سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔ پہلے ان اولیائے کرام کی سنت پر کوئی عمل تو کر کے دکھائے آج بھی دہکتے شعلے انداز گلستان پیدا کرسکتے ہیں شرط فنائی الذات ہونا ہے لقمہ حرام سے شکم سیری کے بعد دست دعا بلند کرنا ہی حماقت ہے اور حماقت کی بلند پروازی کیا اور پایۂ عرش کو ہلانا کیسا۔

غوث پاک کے عقیدت مندوں میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ رنگین مزاج بھی یقیناً تھے مگر جب وہ "سایہ عافیت" میں آجاتے تو ان کے مزاج بھی بدل جاتے۔ انداز فکر میں تبدیلی پیدا کرنا معمولی کارنامہ نہیں ہوا کرتا۔ آپ کا ایک خادم خاص ایک رات' بار بار محتلم ہوا۔ ہر مرتبہ خواب میں ایک نئی "صورت" نظر آتی۔ بعض خواتین سے تو وہ آشنا تھا مگر بعض صورتیں اس کے لئے اجنبی تھیں۔ صبح وہ عالم پریشانی میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے لب کشائی کا موقع دیئے بغیر ہی خجالت سے بچالیا۔ <رات والے سارے واقعات کو بھول جاؤ لوح محفوظ پر مرقوم تھا کہ تم فلاں فلاں عورت سے زنا کا ارتکاب کرو گے۔" پھر آپ نے ان خواتین کے نام اور حلیئے بیان فرمائے <مجھے تمہاری تباہی پسند نہ تھی لہٰذا میں نے رب العزت کے حضور دعا کی اور عالم بیداری میں وقوع پذیر ہونے والا ہر اختلاط' حالت خواب میں تبدیل کردیا گیا۔" غوث پاک نے صورت حال کی وضاحت فرمائی تو خادم سجدۂ شکر بجالایا۔

بغداد کا ایک صاحب ثروت تاجر عبدالصمد بن ہمام علم کلام اور فلسفے کا ماہر بھی تھا۔ کرامات غوثیہ کو خلاف عقل قرار دینے میں مشہور تھا۔ اچانک ہی اس کی کایا پلٹ گئی۔ ہر روز کاروبار زندگی کا آغاز زیارت غوث پاک کے بعد کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی دیوانگی کے قصے بغداد کی گلیوں میں عام ہونے لگے۔ پڑھا لکھا صاحب حیثیت انسان تھا لوگ اس کی مالی حالت اور اثر و رسوخ کے پیش نظر ہر زیادتی نظر انداز کرجاتے لیکن نوبت بہ ایں جارسید کہ وہ غوث پاک کے متعلق معمولی مخالفانہ گفتگو سن کر ہی آتش زیرپا ہوجاتا اور مرنے مارنے پر تل جاتا۔ "میں شیخ کائنات کی شان میں گستاخی کرنے والی زبان کو گدی سے نکال پھینکنے کی طاقت رکھتا ہوں جو چاہے اور جب چاہے آزما دیکھے۔" مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ اپنی کایا پلٹ

کیفیت کے راز میں کسی کو شریک نہیں کرتا تھا۔ غوث پاک کے علم میں فانی سے روپوش ہو جانے کے بعد اس نے اس راز سے پردہ ہٹایا جس کا متن پیش خدمت ہے۔ "یہ میری بد نصیبی کی انتہا تھی کہ میں آب حیات کے چشمے کو دیکھ کر بھی تشنہ لب رہا" عبدالصمدن بن ہمام نے کہا "سارا بغداد گواہ ہے کہ میں غوث پاک کی ہر کرامت کا نہ صرف منکر تھا بلکہ خلاف عقل ثابت کرنے میں بھی مشہور تھا ایک روز میں آپ کے مدرسے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اذان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے بیت الخلا جانے کی ہلکی سی حاجت محسوس ہوئی جو کوئی پریشانی والی بات نہ تھی کہ مجھے اپنے "نظام" پر بھروسہ تھا بہرحال میں نے یہی سوچا کہ نماز کے بعد حاجت سے فراغت حاصل کرلوں گا۔ لہٰذا میں مسجد میں داخل ہوا اور وضوع وغیرہ سے فارغ ہو کر میز کے قریب اگلی صف میں جا بیٹھا۔ اس وقت قضاء حاجت کا احساس بھی مٹ چکا تھا اصل بدقسمتی یہ ہوئی کہ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ اس روز جمعہ کا دن تھا۔ مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تو مجھے احساس ہوا کہ آج تو جمعتہ المبارک ہے۔ غوث الثقلین منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ تقریر کا آغاز ہوا تو میری آزمائش کی گھڑی بھی سر پر آ پہنچی۔ خلق خدا کا ہجوم تھا اور مسجد سے باہر نکلنے کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ میں منبر کے بالکل قریب بیٹھا تھا مگر میری حالت متغیر ہونے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے مزید "ضبط" کیا تو میری جان ہی نکل جائے گی۔ بصورت دیگر میں خلق خدا کے سامنے ایسا تماشہ بن جاتا جس کے بعد شاید میں خودکشی پر مجبور ہو جاتا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کرب سے گزرے بغیر کوئی میری ابتلا کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ میرے منطقی دماغ نے اس ساری مصیبت کا ذمہ دار، منبر پر تقریر کرنے والی ہستی کو ٹھہرایا اور میرے بغض و عناد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس خیال سے میرا دم گھٹنے لگا کہ چند لمحوں بعد بھری دنیا میں میرا کیا حشر ہو گا۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

"میری گنہگار آنکھوں نے دیکھا کہ غوث الاعظم منبر سے نیچے اترے اور انہوں نے اپنی عبا میرے اوپر ڈال دی اس کے ساتھ ایک محیرالعقول بات بھی ہو چکی تھی اگر آپ لوگ یقین کریں تو اس کا اظہار بھی کئے دیتا ہوں" عبدالصمد بن ہمام نے جواب طلب نظروں سے سامعین کی طرف دیکھا۔

"اور وہ محیرالعقول واقعہ کیا تھا" یک از سامعین نے پوچھا۔

جس لمحے غوث الاعظم کا نورانی پیکر مجھے اپنی عبا اوڑھا رہا تھا' اس وقت ان کا ایک پیکر سرمنبر تقریر بھی کر رہا تھا گویا مسجد میں کسی شخص کو احساس تک نہ ہونے پایا کہ مجھے عبا سے ڈھانپ دیا گیا ہے کیونکہ خطاب کا سلسلہ منقطع ہی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو ایک سرسبز و شاداب جنگل میں پایا قریب ہی ایک چشمہ بھی جاری تھا۔ میری مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ میں نے بول و براز سے فارغ ہو کر اس چشمے کے شفاف پانی سے وضو کیا پھر دو رکعت " تحیتہ الوضو" ادا کیں تب مجھ گناہ گار کے سر سے عبا ہٹا دی گئی۔ وہی جگہ تھی وہی مسجد' وہی میرا محبوب شیخ سرمنبر خطاب فرما رہا تھا۔ میری حالت درست ہو چکی تھی اور وضو کے اثر سے میرے اعضا بھی بھیگے ہوئے تھے۔ اس وقت میری عقل زائل ہو گئی یہ سب کچھ مجھ پر بیتی تھی کوئی سنی سنائی بات نہ تھی میرا منطقی دماغ ساری صورت حال کی توجیہہ تلاش کرتے کرتے عاجز آ گیا۔"

نماز اختتام پذیر ہوئی مسجد خالی ہو گئی شیخ مجھ پر اک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے رخصت ہو گئے میں اسی جگہ بیٹھا رہا۔ میرے رومال کے ساتھ ایک چابی بندھی تھی جو مجھے نہیں مل رہا تھا میں نے اپنی نشست کے قریب ادھر ادھر دیکھا مگر اپنی تلاش میں ناکام رہا۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ اس چشمے کے کنارے جہاں میں نے وضو کیا تھا' ایک درخت کی شاخ پر میں نے اپنا رومال رکھا تھا' مگر وہ جگہ وہ مقام' جانے روئے زمین کے کس گوشے پر تھا۔ وہ چابی میرے لئے بڑی اہم تھی مگر اس جگہ کے متعلق میں کس سے دریافت کرتا اور کن الفاظ میں اپنے منطقی احباب کو یقین دلاتا۔ لہٰذا میں نے چپ سادھ لی۔ میری راتوں کی نیند اڑ چکی تھی اور دن کا چین حرام ہو چکا تھا۔" اس سارے واقعہ کی کوئی نہ کوئی عقل دلیل ضرور ہو گی" سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے بس یہی خیال مجھے ستاتا رہتا۔"

چند روز بعد مجھے ایک طویل سفر درپیش ہوا۔ میں نے لوہار سے اپنے صندوق کی دوسری چابی بنوا کر ضروری سامان نکالا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ بغداد سے تین یوم کی مسافت طے کرنے کے بعد میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جو مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ شفاف پانی کا بہتا ہوا چشمہ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بالکل وہی مقام تھا جو میں عالم بے داری یا خواب یا مدہوشی میں دیکھ چکا تھا۔ اپنی اس کیفیت کو کن الفاظ کا لبادہ اوڑھاتا اور اسے کس نام سے یاد کرتا۔ میں مسجد میں بھی تھا اس چشمے کے کنارے بھی' خدا جانے میں کہاں تھا اور یہ

سب کیا تھا؟

<میرے ساتھیوں نے خیال ظاہر کیا قیام و طعام وغیرہ اور نماز کے لئے وہ جگہ مناسب ترین تھی‘ لہٰذا وہ سب عارضی پڑاؤ کے لئے تیار ہو گئے۔ میں متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دراصل مجھے اس درخت کی تلاش تھی جس کی شاخ کے ساتھ میں نے اپنا رومال ٹانگا تھا۔ آخر وہ درخت مجھے نظر آ ہی گیا۔ میں لپک کر آگے بڑھا تو میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا _ میری آنکھوں کے سامنے میرا گمشدہ رومال لٹک رہا تھا اور وہ چابی جس کی نقل میں نے لوہار سے بنوائی تھی اس رومال کے ساتھ منسلک تھی۔ تو گویا میں اپنے وجود‘ اپنی پوری شخصیت کے ساتھ بغداد سے تین یوم کی مسافت پر اس جگہ آیا تھا اور اس جگہ میں نے دو رکعت نماز بھی ادا کی تھی اور پھر میں پل بھر میں بغداد کی مسجد میں بھی موجود تھا۔“

<کیا سفر اور کیسا کاروبار حیات‘ میں سارے مکروہات زمانہ پر لات مار کر واپس بغداد آیا اور سیدھا اپنے محبوب شیخ پردہ پوش کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد والے واقعات سے آپ سب لوگ بخوبی واقف ہیں اور میری عقیدت کے گواہ‘ بغداد کے گلی کوچے ہیں۔ چونکہ میں اپنے محبوب کو اچھی طرح آزمانے کے بعد حلقہ بگوش عقیدت ہوا لہٰذا میرا مقام کوئی اتنا بلند نہیں اس لئے میں ہمیشہ مہر بہ لب رہا۔ عشق میں آزمانا گناہ کبیرہ شمار ہوتا ہے۔ میں اب بھی خاموش رہتا مگر میرے عزیز دوست ہم پیالہ ہم نوالہ ابوالیسر نے مجبور کیا کہ اس کی تفصیل سے ساری دنیا کو آگاہ کر کے گواہ بنا لوں اور اپنے تعلق کو دوام بخش دوں کیونکہ اپنے محبوب شیخ سے میرا یہی تعلق توشتہ آخرت ہے _>

یہ روداد بیان کرنے کے بعد بغداد کا عبدالصمد‘ سامعین کے چہروں کو پڑھنے لگا۔ پھر مطمئن ہو کر خاموش ہو گیا۔ کیونکہ سامعین کو اس پر اعتبار آگیا تھا ورنہ وہ دیوانہ مرنے مارنے پر تل جاتا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ عشق میں ”لوکلام الفضہ السکوت الذہب“ اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا۔“

اس عاشق غوث پاک کی ایک عادت بڑی عجیب تھی زکوٰۃ بڑی باقاعدگی سے ادا کرتا مگر مستحق و غیر مستحق لوگوں میں امتیاز کئے بغیر۔ بس جو سامنے آیا اسے سب کچھ تھما دیا۔ کسی بے تکلف دوست نے ایک بار اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے بڑا لاجواب‘ جواب دیا۔ ”کیا میں اس نظر کرم کا مستحق تھا جس سے شیخ نے مجھے نوازا‘ جب اللہ تعالیٰ کرم نوازی کرتے وقت

مستحق اور غیر مستحق میں تمیز نہیں فرماتا تو بندے کو بھی راہ خدا میں خرچ کرتے وقت اس امتیاز سے گریز کرنا چاہئے۔" ویسے یہ نکتہ مجھے میرے شیخ نے تعلیم کیا تھا" آخری فقرہ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا کیونکہ اس کا دوست اسے ہضم نہیں کر سکتا تھا۔

سمجھا جاتا ہے۔

سقانی الحب کاسات الوصالی
فقلت لخمرتی نحوی تعالی

اسی کا اردو منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جو شمس بریلوی کی قلمی کاوش ہے۔

ساغر پلائے عشق نے مجھ کو وصال کے
لا جس قدر بھی خم ہیں شراب جمال کے

اسی سال ماہ رمضان سے پہلے آپ کا وصال ہوا۔ 18 ربیع الاخر کا دن تھا۔ ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات تھی 561ھ سن رحلت ہے۔ جس رات آپ کا وصال ہوا خبر سنتے ہی سارا شہر بے دار ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں طلوع آفتاب کے بعد بلکہ سارا دن تدفین ممکن نہ ہو سکی۔ ابن جوزی رات کو تدفین کی وجہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ خلق خدا کے اژدہام کی بنا پر بغداد کے کوچہ و بازار اور سڑکیں شاہراہیں تمام راستے مدود ہو چکے تھے جس کی وجہ سے جنازے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ممکن نہ تھا۔ ابن اثیر اور ابن کثیر نے بھی اپنی اپنی تاریخ کی کتابوں میں یہی وجہ بیان کی ہے اور دوسرے مورخین نے انھی کتب تاریخ سے استفادہ کیا ہے۔ بہرحال' رات کو باب الازج کے مدرسے میں غوث الثقلین کا جسد خاکی سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ عبدالوہاب نے پڑھائی۔ نماز میں مریدین' تلامذہ حضرت شیخ کی اپنی اولاد تو شامل تھی ہی مگر رجال الغیب کی موجودگی ہر شخص محسوس کر رہا تھا۔ تدفین کے بعد الصباح جب درس گاہ کا دروازہ کھولا گیا تو خلق خدا کا ہجوم مزار پر ٹوٹ پڑا۔ وہ دن اور آج کا دن یہ سلسلہ جاری ہے کرہ ارض کے کونے کونے سے زائرین مزار پر حاضری دینے بغداد آتے ہیں اور زیارت مزار کو توشہ آخرت تصور کرتے ہیں۔ یہ مستنجد باللہ کا عہد خلافت تھا۔

غوث الثقلین کی ہمہ جہت شخصیت' ان کے فیوض و برکات کو احاطہ تحریر میں لانے کے لیے عمریں درکار ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کے روحانی تصرفات دائمی ہیں یعنی ان کا سلسلہ بعد از وصال بھی جاری رہا اور رہے گا۔ شریعت محمدی کے تن ناتواں میں جس انداز میں انہوں نے نئی روح پھونکی وہ بذات خود ایک محیرا لعقول کارنامہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی مساعی جمیلہ کو تائید ایزدی حاصل تھی علم لدنی اور مقام قطبیت اور وہ بھی کامل و اکمل' یہ تمام

صفات ان کی کامیابی و کامرانی میں کار فرما ضرور ہیں ان تصرفات کی تشریح پیش کرنے سے پیشتر ان کی شخصیت کو جدید علوم کی روشنی میں دیکھیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اس کائنات کی وسعت کا اندازہ لگانے کی جدید علوم نے سعی لا حاصل کی ہے۔ اور پھر شکست کا اعتراف بھی کیا ہے۔ مثلاً ”ہمارے نظام شمسی میں، سورج کے گرد نو سیارے گردش کر رہے ہیں یعنی عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون اور پلوٹو۔ سب سے آخری معلوم سیارہ، سورج سے تین ارب ستاسٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ (سورج سے ہماری زمین کا فاصلہ 9 کروڑ تیس لاکھ میل بنتا ہے) ایسے دس کروڑ نظام مل جائیں تو ایک کہکشاں معرض وجود میں آتی ہے اور ایسی دس کروڑ کہکشاؤں کا علم آج ہمارے پاس موجود ہے۔ ان فاصلوں کی پیمائش نوری سالوں میں کی جاتی ہے یعنی روشنی کی رفتار سے اگر سفر طے کیا جائے تو وہ جتنا فاصلہ ایک سال میں طے کرے گی ایک نوری سال کہلائے گا۔ (واضح ہو روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے) آخری کہکشاں جس کا علم آج ہمیں ریڈیائی لہروں سے لیس دوربین سے ہوا وہ ہماری زمین سے دو کروڑ نوری سالوں کے فاصلے پر ہے۔ اب اس کے بعد یہ سلسلہ کہاں تک دراز ہے؟ اس سے کوئی آشنا نہیں گویا چشم بصیرت و بصارت چندھیا جاتی ہیں۔ الغرض سیاروں ستاروں کی تعداد اور ان کے مابین فاصلے دونوں شمار نہیں کئے جا سکتے اور نہ ان کی پیمائش ممکن ہے۔ ان سے کما حقہ، آگاہی تو ایک الگ مسئلہ ہے۔ تادم تحریر بڑے سے بڑا ریاضی دان، سائنس دان یا ماہر اجرام فلکی، اس وسیع و عریض کائنات کا مرکز معلوم کرنے یا حدود تعین کرنے کا دعوے نہیں کر سکا۔ اس کے برعکس چشم قطبیت نے آج سے دس صدیاں پیشتر نعرہ مستانہ بلند کیا۔

نظرت الی بلا دا للہ جمیعا”
کخردلتہ علی حکم اتصال

(بلاد رب العزت، ”کائنات“ میری نظر میں، ہتھیلی پر رائی کے دانے کی مانند ہے۔ ”خردل“ عربی زبان میں رائی کے دانے کو کہتے ہیں) یہی روحانی آنکھ کا کمال ہے کہ جہاں مادی وسائل سے لیس آنکھ، عاجز آجائے، اس کی کارکردگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

تصرف بعد از وصال کے لئے ایسی ہی کسی آنکھ کی اشد ضرورت تھی جو پوری کائنات کا احاطہ کر سکے۔ اور یہ چشم بصیرت و بصارت حضور پاک صلعہ کے طفیل غوث الثقلین کو نصیب

ہوئی۔ اس تصرف کے وسائل البتہ الگ الگ نوعیت کے رہے ہیں۔ پہلا وسیلہ تو آپ کی تعلیم تھی جس نے امت مسلمہ کے افق پر چھائی ہوئی ادبار کی پہلی گھٹا ختم کی یعنی حکومت باطنیہ کا جنازہ نکالا اور نورالدین زنگی افق اسلام پر طلوع ہوا۔ پھر صلاح الدین ایوبی نے یورپ کی متحدہ طاقتوں کو شکست دے کر بیت المقدس آزاد کرا لیا۔ عروج ایوبی سے ملت اسلامیہ کا مرکز مضبوط ہو گیا۔ ان ہی ایام میں غزنویوں کے انتشار میں سے خاندان غوری نمودار ہوا جس نے برصغیر میں مسلم حکومت کے قیام کی داغ بیل ڈالی۔ اس میں غوث پاک کے قریبی عزیز اور فیض یافتہ خواجہ غریب نواز معین الدین چشتیؒ کا دست مبارک بھی کار فرما تھا۔ پھر آپ ہی کے خلفاء شاگردان رشید مشائخ چشت اور سہروردیہ بزرگان، بہالدین زکریا، شاہ صدرالدین عارف، شاہ رکن عالم ملتانی، مخدوم جہانیاں جہاں گشت اوچی، لعل شہباز قلندر سندھی اور غوث الثقلین کے روشن کئے ہوئے دوسرے چراغوں نے پورے برصغیر کو بقعہ نور بنا دیا۔

کرہ ارض کا گوشہ گوشہ کیوں منور نہ ہو جاتا امت مسلمہ میں اس منفرد شان و شوکت والا ولی اللہ پہلے پیدا ہی کب ہوا تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت کے متعلق پیش گوئیوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ حد یہ ہے کہ حضرت شیخ سے دو سو برس پیشتر جنید بغدادیؒ نے تو اس قدر وضاحت سے بتا دیا کہ چشم بصیرت حیران رہ جاتی ہے۔

درس گاہ علوم ظاہری کے عین سامنے جنید بغدادی اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے۔ مراقبے کی غواصی میں سے اچانک ابھرے اور فرمانے لگے۔ "مجھے عالم غیب سے اطلاع ملی ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں جیلان کے اندر سید المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اولاد اطہر میں سے غوث الاعظم پیدا ہوں گے، ان کا نام "عبدالقادر" ہو گا اور لقب "محی الدین" رسول اکرمؐ کی اولاد میں سے ائمہ کرام اور اصحاب کرام کے علاوہ انہیں اولین و آخرین زمانہ کے "ہر ولی کی گردن پر میرا قدم ہے" کہنے کا حق ہو گا۔

بحث و تمحیص یا مناظروں کا انعقاد غوث الاعظم کے مقام و مرتبے کے منافی باتیں تھیں مگر جب آپ نے معروضی حالات کو سنوارنے کا بیڑہ اٹھایا تو ہر وعظ، فراست کی منہ بولتی تصویر ہوا کرتا تھا۔ جس میں ہر معترض کی تسلی و تشفی ہو جاتی۔ کسی کو سوال کرنے کی جرات ہوتی نہ احتیاج۔

ایک عرصے سے شریعت اور طریقت میں اختلاف چلا آ رہا تھا اور مرور زمانہ کے ساتھ،

اختلاف کی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ امام وقت کا دعوے بھی کر سکتے تھے کہ مسائل فقہ پر جتنی گہری نگاہ آپ کی تھی اس دور میں کسی کو نصیب نہ تھی۔ آپ کی رائے حرف آخر سمجھی جانے لگی تھی مگر اس کے باوجود آپ نے حنبلی مسلک کی مطابق فتوے دیئے اور اسی مسلک کی ترویج و ترقی میں کوشاں رہے۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ مسلک احکام شرعی کے اتباع میں سخت ترین رویوں کا حامل ہے۔ اس کی اساس ہی روایت پر استوار ہوتی ہے گویا عقل کے مقید علمائے سو کی یہ صند تھا۔ اس طرح جب آپ نے حنبلی مسلک کا اتباع کرتے ہوئے طریقت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور سر عام قال سے "حال" کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامعین و حاضرین کو تڑپا تڑپا دیا تو شریعت و طریقت کے مابین اختلاف خود بخود ختم ہو گیا۔ غوث الاعظم نے ثابت کر دیا کہ مذہبی شعور نابالغ رہ جائے تو شریعت و طریقت میں اختلاف جنم لیتا ہے۔ یہ شعور بلوغت کے بلند مقام پر ہو تو دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

شریعت و طریقت کے حسین امتزاج کے علاوہ آپ نے عقل پرست معتزلہ فرقے کا ناطقہ بند کر دیا۔ خلق قرآن کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ وعظ شریف کا متن تھا۔ "قرآن کلام الٰہی ہے جو صفت خداوندی کے زمرے میں آتا ہے۔ فانی ذات کی ہر صفت فانی ہو سکتی ہے غیر فانی اور قیوم (ذات جو اپنے سہارے پر قائم ہو) کی ہر صفت بھی غیر فانی ہو گی لہٰذا قرآن کبھی نہیں مٹ سکتا۔"

شیعیت و رافضیت کے دلائل کو رد کرنے کے لئے آپ کا نجیب الطرفین سید ہونا ہی کافی تھا۔ کیوں کہ ان کے ہاں سیاسی و روحانی پیشوائی کا حق صرف اسی خاندان کو ہے جس کے آپ چشم و چراغ تھے۔ کسی کو جرات نہ تھی کہ آپ کی موجودگی میں امامت کا دعوے کر سکے۔ کوئی مد مقابل تھا ہی نہیں۔ علم و فضل، زہد و تقویٰ اصل و نسل ہر لحاظ سے آپ بلند و بالا تھے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ سلسلہ قادریہ کا اجرا گردانا جا سکتا ہے۔ جو تصرف بعد از وصال کا ذریعہ بنا۔

فتنہ تاتار جس نے 615ھ سے 656ھ تک اسلامی سلطنت، تہذیب و ثقافت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی سلسلہ قادریہ ہی کی مساعی جمیلہ سے نیست و نابود ہوا۔ یہ داستان حیرت انگیز افسانے سے کم دلچسپ نہیں۔ دنیا اس حقیقت سے آشنا ہے کہ دست تاتار، امت مسلمہ کی شہ رگ تک پہنچ چکا تھا (اس کی تفصیل میں جانا موضوع سے ناانصافی والی بات ہو گی) کہ ایک

خراسانی بزرگ صرف فیض غوث الاعظم سے مسلح ہو کر بھیڑیوں کے بھٹ میں جا گھسے۔ سلسلہ قادریہ کے اس بزرگ کو اشارہ غیبی ہوا تھا یا نہیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ کتنی عجیب اور حیرت انگیز بات ہے کہ تموجن (چنگیز خاں) کی اولاد جس نے کرہ ارض کے مسلم جغرافیے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ ملکوں کی سرحدوں کو روند کر انسانی کھوپڑیوں کے بلند و بالا مینار تعمیر کئے اور تاریخ انسانی کو انوکھی "تخریب" سے روشناس کرایا ایسی تخریب جو کسی چشم فلک نے دیکھی نہ سنی' وہی اولاد ایک نہتے درویش کے سامنے بے بس ہو گی۔ یہ درویش جب ہلاکو خاں کے بیٹے تگودار خاں سے "مذاکرات" کرنے پہنچا تو وہ شکار کھیل کر واپس آ رہا تھا۔ خون بہانے کی جانے کیسی ہوس تھی جو اس نسل کی گھٹی میں پڑ چکی تھی اور اب وہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

بہرحال تگودار خان اپنے محل کے سامنے ایک مرنجامرنج درویش کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔

"درویش ایک بات تو بتا" اس نے تمسخرانہ لہجے میں پوچھا "یہ تمہاری داڑھی کے بال بہتر ہیں یا میرے کتے کی دم؟"

بڑا عجیب سوال تھا مگر طاقت کا ہر اوٹ پٹانگ سوال بھی درست اور مناسب ہوا کرتا ہے۔

"میں بھی اپنے مالک کے در کا کتا ہوں" درویش نے جواب دیا "اگر میں اپنی جاں نثاری اور وفاداری سے مالک کو خوش کر دوں تو یقیناً" میری داڑھی کے بال آپ کے کتے کی دم سے اچھے ہیں ورنہ 'ان سے' کتے کی دم بہتر ہے۔"

"وہ کیسے؟" تگودار خان اپنے واہیات سوال کا اتنا معقول جواب سن کر قدرے حیران ہوا۔

"آپ کا کتا آپ کے لئے شکار کی خدمت سرانجام دیتا ہے جو وفاداری و جاں نثاری کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ دو وفاؤں کا مقابلہ ہے اور ظاہر ہے جیت اسی کی ہو گی جو معیار میں اعلیٰ اور مقدار میں زیادہ ہو گی۔" درویش کا یہ جواب تگودار خان کی سوچ کے عین مطابق تھا۔ یہ منفرد قسم کی گفتگو اسے بڑی اچھی لگی لہٰذا درویش اس کا مہمان بن گیا۔ اس کے بعد ہر چیز خود بخود ہوتی چلی گئی۔ اولاد چنگیز کے پاس وحشت و بربریت تو بے شک وافر مقدار میں تھی مگر نہ طریقے سلیقے کی سوچ تھی نہ ڈھنگ کا ضابطہ حیات۔ کھوکھلی رسمیں اور بے بنیاد توہمات کے سہارے کوئی قوم آخر کتنا عرصہ بام عروج پر رہ سکتی ہے۔ دیوار وحشت و بربریت نے مسمار ہونا تھا اور وہ ہو کر رہی۔ تگودار بزرگ کی باتیں سنتا تو اسے منفرد قسم کا سکون محسوس ہوتا۔ جیسے پاگلوں کے شور میں کوئی سریلا نغمہ سماعت میں رس گھولنے لگے۔ اور آخر کار اس کے دل نے درپردہ

حقیقت کا اعتراف کرلیا اور خراسانی قادریہ سلسلے کے دست حق پرست پر اس نے اسلام قبول کرلیا۔

”میری قوم کے سر سے ابھی وحشت و بربریت کا بھوت نہیں اترا“ تگودار نے اپنی فراست سے کام لیتے ہوئے کہا ”میں نے اپنی مسلمانی کا اعلان کیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا لہٰذا بہتر ہے آپ وقتی طور پر منظر سے غائب ہو جائیں اور مجھے ان وحشیوں کو رام کرنے کا موقع دیں۔ میں رفتہ رفتہ اپنی قوم کو نیا مذہب اختیار کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کرلوں گا۔“

تگودار خان کی یہ بات مبنی بر حقیقت تھی لہٰذا درویش واپس خراسان آگیا اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔ مشیت ایزدی کے تحت وہ خراسانی بزرگ سفر آخرت اختیار کر گئے اور اپنے بیٹے کو اس ادھورے کام کی ذمہ داری سونپ گئے۔ باپ کی وصیت کے مطابق درویش کا صاحبزادہ تگودار خان کے دربار میں حاضر ہوا۔

”قوم کی اکثریت میری ہم خیال ہو چکی ہے مگر ایک طاقتور سردار آمادہ نہیں ہو رہا“ تگودار خان نے اپنی تفکر کا اظہار کیا۔ ”اس کے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں لہٰذا زبردستی کی گئی تو خانہ جنگی چھڑ سکتی ہے۔“

”آپ اس سردار سے میری ملاقات کا بندوبست کریں“ درویش نے کہا ”اللہ کارساز ہے“

تگودار خان نے ضدی سردار کو طلب کیا۔ درویش نے بطریق احسن گفتگو کا آغاز کیا مگر وہ سردار ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ”دیکھئے جناب میں جنگجو قسم کا انسان ہوں اور صرف طاقت پر ایمان رکھتا ہوں کیوں کہ طاقت ہی سب سے بڑی سچائی ہے“ سردار نے دو ٹوک فیصلہ سنا دیا۔ ”آپ میرے ایک سپاہی سے جنگ کریں اگر آپ غالب آگئے تو میں آپ کا دین قبول کرلوں گا۔“

”میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا“ تگودار خان نے اس کی سخت مخالفت کی مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ درویش نے ضدی سردار کا چیلنج قبول کرلیا۔ اور ایک طاقتور سپاہی سے مقابلے کا اعلان ہو گیا۔ تگودار خان کا کہنا تھا کہ نا تجربہ کار درویش کا ایک جنگجو سے مقابلہ قتل عمد کے برابر ہے مگر ضدی سردار کا استدلال بھی کچھ کم نہ تھا۔ ”یہ مقابلہ ہو کر رہے گا درویش کی موت دوسرے دخل در معقولات کرنے والوں کے لئے درس عبرت ہو گی اور اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ آئندہ ہمار ”خان“ ایرے غیرے لوگوں کی باتوں میں آنے سے گریز کرے گا“

مقابلے والے دن ہزار ہا تماشائی یہ ”طرفہ تماشا“ دیکھنے اکٹھے ہو گئے۔ ایک طرف وحشی

قوی ہیکل جنگ جو انسان تھا تو دوسری طرف میدان میں اترنے والا ایک مرنجا مرنج قسم کا درویش۔ کوئی تمسخر اڑا رہا تھا کوئی قہقہے لگا رہا تھا۔ دونوں آمنے سامنے ہوئے (اسے سوا یا ڈیڑھ حریف کہنا زیادہ مناسب ہو گا) پھر ایک عجیب بات ہوئی چشم فلک حیران ہوئی تو تماشائی حیران و ششدر رہ گئے۔ درویش نے پوری قوت سے آگے بڑھ کر صرف ایک طمانچہ حریف کے منہ پر مارا، حریف کا نہ صرف جبڑا ٹیڑھا ہو گیا بلکہ وہ اپنی تمام تر وحشت و بربریت کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ مقابلے کے منصف نے دیکھا تو تاتاری جنگ جو کی کھوپڑی چیخ چکی تھی۔ جانے اس طمانچے کے پیچھے کون سی قوت کار فرما تھی۔ یہ سزا تھی یا عذاب الٰہی۔ تاتاری بے شک وحشی قوم تھی مگر طاقت کے قانون کا احترام کرنا جانتی تھی۔ درویش کی فتح کا اعلان ہوا تو تاتاری پہلوانوں نے درویش کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر جلوس نکالنے کی ضد کی۔ ادھر ضدی سردار نے حسب وعدہ دست فقیر کو بوسہ دے کر اپنی شکست کا اعتراف کیا اور اس کے ساتھ ہی قبول اسلام کا اعلان بھی کر دیا۔ اب تگودار خان کو بھی اخفائے راز کی چنداں ضرورت نہ تھی لہٰذا اس نے بھی سرعام اپنی قلبی کیفیت کا اظہار کیا اور اپنا نام "احمد خان" رکھا۔ کتب تاریخ میں 1281ھ سے 1284ھ تک تگودار خان کی بجائے احمد خان مرقوم ہے۔

سلاطین مصر سے احمد خان کے تعلقات خوشگوار ہوتے ہوتے رہ گئے۔ تاتاری جرنیل اتنی بڑی تبدیلی کو اتنی جلد ہضم نہ کر سکے۔ انہوں نے چنگیزی دستور کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے ہی سردار کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ احمد خان نامساعد حالات کے باوجود میدان میں ڈٹ گیا۔ اب اس کی جنگ صرف کشت و خون بہانے یا تسکین ہوس کے لئے نہ تھی، اس کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا یا شاید وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔ ہلاکو خاں نے جس امت مسلمہ کی شہ رگ پر وار کیا۔ اس کا اپنا بیٹا اسی امت کے ناموس پر کٹ مرا۔ احمد خان نے جام شہادت نوش فرمایا۔ یہ غوث الثقلین کا روحانی فیض تھا کہ وقت کی تیز ترین تلوار سچائی کے تحفظ کے لئے بے نیام ہوئی۔ احمد خاں کی شہادت سے تاتاریوں میں تبلیغ اسلام کی رفتات قدرے سست ضرور ہوئی مگر بنیاد ہل چکی تھی، ظلم کی دیوار کو زمین بوس ہونا تھا اور وہ ہو کر رہی۔

ہلاکو خاں کا چچا زاد بھائی "برکہ خان" ایک اور درویش بے ریا شیخ شمش الدین باخوری ـ ست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ رہی سہی کسر احمد خان کی نسل سے "غزن محمود" نے

حلقہ بگوش اسلام ہو کر پوری کر دی۔

غزن محمود میں چیتے کی برق رفتاری اور شیر ببر کا حوصلہ تھا۔ مومنانہ فراست شامل حال ہوئی تو وہ دو دھاری تلوار بن گیا۔ حسب توقع سرداروں نے علم بغاوت بلند کیا مگر اس نے تمام سرکشوں کو سختی سے کچل کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً" تمام تاتاری قبائل اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ نئے ضابطہ حیات سے متعارف ہوئے تو پھر اسی کے ہو کر رہ گئے اور ان کے سینے نور ایمان سے منور ہو گئے۔ غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تصرف بعد از وصال کی اس سے زیادہ روشن مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ

"پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"

مادھولال حسینؒ

آبائی پیشہ بافندگی جس سے منسلک افراد کو بے خبر معاشرہ کمی کمین جولاہے کہتا ہے۔ ذات باری تعالیٰ کی جلالی و جمالی صفات کا مظہر مجاز کے پردے میں ''حقیقت'' کا مینارنور مظاہر قدرت کی تاثیر بدل دینے والی صاحب تصوف شخصیت درد لا دوا کی اکسیر دوا، سونے کے انبار کو ناپاک مشت خاک ثابت کر دینے والی ذات جس کے سامنے زمین کی طنابیں کھنچ گئیں اور فاصلے مٹ گئے۔

حسین ڈاھڈا، شاہ حسین، یا مادھولال حسینؒ کی داستان حیات بابرکات

مادھولال حسین

تحریر و تحقیق: اختر حسین شیخ

بچے کی عمر یہی کوئی دس برس تھی مگر جس انہماک سے وہ دریائے راوی کی لہروں کا مشاہدہ کر رہا تھا وہ اس کی عمر سے ”لگا“ نہیں کھا رہا تھا شاید وہ مقام حیرت میں گم تھا۔ راہ سلوک میں ”مقام حیرت“ وہ مقام ہے جہاں سالک اشیاء کی ظاہری شکل و صورت سے تحریک حاصل کر کے' خالق کائنات کی جلالی و جمالی شان تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اپنی حقیر ذات پر نگاہ ڈالتا ہے تو ذرے اور آفتاب کی اس نسبت کا احساس اسے ہوش و خرد سے بے گانہ کر دیتا ہے۔ حیرانگی کی یہ انتہا جب الفاظ کا لبادہ اوڑھ لے تو سالک بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیاں کت جا لڑیاں

لیکن ایسا' مقام حیرت سے ابھرنے کے بعد ہوتا ہے۔ دریائے راوی کے کنارے لڑکے کا انہماک بھی بڑے عجیب انداز میں ٹوٹا۔ ایک نورانی چہرے والی سبز پوش شخصیت نے اچانک ظاہر ہو کر اس کے کاندھے پر بڑی رسان سے ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکے نے چونک کر نورانی صورت پر نگاہ ڈالی تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور زبان گنگ ہو گئی۔ حیرت کی شدت ہمیشہ قوت گویائی سلب کر لیتی ہے۔ شدت میں کمی واقع ہونے کے بعد گفتگو کا سلیقہ واپس آتا ہے تو لہجے میں لکنت رہ جاتی ہے۔ بزرگ کا چہرہ نورانی ہالے میں یوں جگمگا رہا تھا جیسے قندیل میں شمع روشن ہو' جیسے پس کہسار سے آفتاب طلوع ہو رہا ہو۔

”بیٹا! کہا تک اظہار حیرت کرتے رہو گے' تمہاری مسافت بڑی لمبی ہے اور قدم قدم پر مقامات حیرت گھات لگائے بیٹھے ہیں“ بزرگ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”مسئلہ کیا ہے؟“

”حضور! مجھے یہاں میرے استاد' میرے پیر و مرشد نے بھیجا ہے“ بزرگ کی تسلی

آمیز لہجے سے بچے کے اوسان بجا ہونے لگے تو اس نے اپنی الجھن بیان کی "میرے شیخ کا حکم تھا کہ مین اس رمضان المبارک میں نماز تراویح پڑھاؤں، سات سیپارے میں نے حفظ کر رکھے تھے جو گزشتہ رات تراویح میں سنا چکا ہوں، آج آٹھواں پارہ سنانا ہے، سمجھ میں نہیں آ رہا کیا ہو گا؟؟"

"بیٹا! میں تمہارے شیخ کے مقام سے واقف ہوں اور تمہاری مشکل سے بھی۔ میں تو تمہارے اعتدال پر آنے کا انتظار کر رہا ہوں" بزرگ نے بڑے نرم لہجے میں کہا "مقام حیرت، صرف جلوگی کا تماشا ہے جس میں تادیر محو رہنا شیوہ مردانگی نہیں، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم زندگی کا بیشتر حصہ اسی کھیل تماشے میں مصروف رہو گے مگر خیر!"

"جناب! آپ کون ہیں؟اور میری آئندہ زندگی سے کس طرح واقف ہیں؟" لڑکے نے ہمت کر کے پوچھا۔

"میں خالق کائنات کی برہان ہوں، صراط مستقیم کی نشان دہی کرنے والا "خضر"۔ ہر نیک روح مجھ سے بخوبی واقف ہے۔"

خضر علیہ السلام نے اپنا تعارف پیش کیا تو لڑکا وفور شوق سے ان کے قدموں میں گر گیا۔ خضرؑ نے ایک ہاتھ سے بچے کا سر اٹھایا اور چلو بھر پانی اس کے حلق میں ڈال دیا۔ منہ میں ٹپکائے ہوئے پانی کے چند قطرے بچے کے حلق سے نیچے اترے تو وہ کسی اور ہی عالم میں جا پہنچا۔ کیف و سرور کی ناقابل بیان کیفیت تھی جس میں وہ ہلکورے لے رہا تھا۔ خاک زمین کی دبیز تہ، شیشے کی طرح شفاف ہو گئی۔ مروجہ و غیر مروجہ علوم کا سمندر اس کے سینے میں موجزن ہو گیا۔

"حضور! یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے؟" لڑکا اپنی کیفیت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ راز ربانی ہے، اسے علم لدنی کہتے ہیں، یہی وہ عطا ہے جس کے بعد ہر علم کا انکشاف اور ہر عالم سے تعارف ہو جاتا ہے۔ تم عنقریب اپنی کیفیت پر قابو پا کر خاموش ہو جاؤ گے، اپنے شیخ سے میرا سلام کہنا۔ مالک کائنات تمہاری مشکلات آسان فرمائے" یہ کہہ کر خضرؑ غائب ہو گئے اور لڑکے نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا۔

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

سچ ہے عطا اگر ظرف کے عین مطابق ہو تو بندہ اسے ہضم کر کے خاموش ہو جاتا ہے ورنہ خالی ڈھول کی طرح بجنے لگتا ہے جس کی آواز صرف دور ہی سے سہانی معلوم ہوتی ہے قریب جاؤ تو سمع خراشی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا یہ لڑکا جسے دس برس کی عمر میں خضرؑ کی زیارت نصیب ہوئی لاہور محلہ تلہ بگھریا "تل بھاگا" کے رہنے والے عثمان بافندے کا لخت جگر حسین تھا جس نے اپنے آپ کو بصد فخر حسین جولاہا کہا۔ لوگ اسے حسین ڈاہڈا یا شاہ حسین کہتے تھے۔ اپنی شاعری میں اس نے اپنے آپ کو حسین فقیر بھی کہا۔ برصغیر میں وہ مادھولال حسین کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۶ویں صدی کے پہلے نصف میں دریا کی گزرگاہ' موجودہ رواں راستے سے قطعاً" مختلف تھی۔ یہ دریائی لمبائی کے لحاظ سے مختصر سہی مگر اپنی گزرگاہ تبدیل کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ بھارت صوبہ ہماچل پردیش کے ضلع کانگڑہ میں "کلو" کے مقام سے نکلنے والا دریائے راوی ریاست چمبہ میں سے گزرتا ہوا مقبوضہ کشمیر (علاقہ جموں) میں داخل ہوتا ہے۔ پاک و ہند کی سرحد کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے پنجاب میں داخل ہوتا ہے اور اپنے منبع سے صرف ۴۵۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اپنے آپ کو دریائے عشاق یعنی چناب کے حوالے کر دیتا ہے۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس دور میں دریائے راوی موجودہ شاہی قلعے سے تھوڑی دور بہتا تھا۔ لاہور کا شاہی قلعہ جو جلال الدین اکبر مغل اعظم کے عہد حکومت میں ۱۵۶۶ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا اس زمانے میں کچا قلعہ تھا جو مٹی کے عظیم ٹیلے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ موجودہ بادشاہی مسجد کا تو نام و نشان تک نہ تھا۔ بادشاہی مسجد عہد اورنگ زیب عالم گیر میں تعمیر ہوئی۔ یعنی ۱۰۸۴ھ بمطابق ۱۶۷۳ء (اس مسجد کی تعمیر پر چھ لاکھ روپے لاگت آئی تھی)

محلہ تل بھاگا اسی بادشاہی مسجد سے شروع ہو کر ٹکسالی دروازہ موہنی روڈ اور دربار داتا گنج بخشؒ کے درمیان والی بستی کا نام تھا جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ عثمان بافندے کا مکان بادشاہی مسجد کی مغربی دیوار کے قریب تھا اور اسی مکان میں جس کا اب نام و نشان مٹ کا ہے ۹۴۵ھ بمطابق ۱۵۳۸ء بروز جمعۃ المبارک شاہ حسین اس عالم کون و فساد میں تشریف لائے۔ شعور کی آنکھ کھلتے ہی بچے کو محلے کی مسجد کا راستہ دکھا دیا گیا جو گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر تھی۔ اس مسجد کے امام'

عالم وقت، حافظ ابوبکر بگھوی تھے جو محلے کے بچوں کو قرآنی تعلیم سے بھی مستفید فرمایا کرتے تھے۔ یہ مسجد آج بھی لاہور ٹکسالی دروازے کے آغاز میں موجود ہے۔ یعنی رسوائے زمانہ ہیرامنڈی کے آغاز میں یہ مسجد شاید اتمام حجت کے لئے بدستور قائم اور موجود ہے۔ اسی مسجد کے حجرے میں پنجابی ادب کی مشہور و معروف شخصیت استاد چراغ دین المعروف استاد دامن نے اپنی عمر عزیز کے ۳۵ برس گزار دیئے اور بعد از مرگ شاہ حسین کے پڑوس میں دفن ہونے کی وصیت کر گیا چنانچہ استاد دامن کو مزار مادھولال حسین کے قریب دفن کیا گیا۔

یہ بات مستند ہے کہ شاہ حسین کے استاد اول امام مسجد، ابوبکر بگھوی تھے جنہوں نے شاہ حسین کو سات سیپارے حفظ کرائے اس وقت شاگرد کی عمر دس برس تھی۔ ۱۶ویں صدی میں لب دریا واقع اس محلے کو تلہ بگھہ کیوں کہتے تھے اس کا سمجھنا بھی کچھ مشکل مرحلہ نہیں۔ اس زمانے میں علمائے کرام کو واقعی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ حضرات "خیر" کی چلتی پھرتی درس گاہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ آج کے اخلاقی انحطاط سے بہت پہلے کی داستان ہے۔ استاد ابوبکر کا تعلق ضلع جہلم تحصیل پنڈداون خان کے گاؤں "بگھہ" سے تھا جہاں کے حفاظ بڑے مشہور تھے۔ (یہ گاؤں آج بھی اسی نام سے موجود ہے) حفاظ کی علاوہ یہ گاؤں ایک زمانے تک عظیم الشان علمی مرکز رہا ہے۔ حافظ ابوبکر جب لاہور تشریف لائے تو اہل محلہ نے اپنی بستی کا نام، امام مسجد کی عزت افزائی کی خاطر تلہ بگھہ رکھ دیا۔ لفظ تلہ، ٹیلے کا بگاڑ ہی۔ اسی گاؤں کا ایک خدان تو اپنی علمی استعداد کی بنا پر بلند مقام و مرتبے پر فائز ہوا۔ نسل در نسل اس میں کلام اللہ کے حافظ اور علم حدیث کے ماہر چلے آتے تھے۔ مولانا غلام محی الدین بگھوی عالم بے بدل کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا پھران کے والد حافظ نور حیات، دادا حافظ محمد شفا، پردادا حافظ نور محمد بگھوی گویا پشت ہا پشت سے یہ حضرات اس خدائی اعلان کے امین تھے جس میں خالق کائنات نے اپنے کلام اور کائنات کی سب سے بڑی کتاب قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ مولانا غلام محی الدین کا سن پیدائش ۱۷۸۸ء ہے اور صاحب "حدائق الحنفیہ" نے مولانا موصوف کے حفظ قرآن والا عجیب و غریب واقعہ ان الفاظ میں رقم کیا ہے۔ "آپ نے تھوڑے عرصے میں قرآن ختم کر لیا تھا مگر حفظ نہیں کیا تھا لیکن چونکہ آپ بڑے خوش آواز تھے

اس لئے جب رمضان شریف آیا تو لوگوں نے آپ کے والد ماجد سے درخواست کی کہ وہ اس رمضان میں غلام محی الدین سے قرآن سننا چاہتے ہیں۔ حافظ نور محمد صاحب نے اپنے لخت جگر سے پوچھا تو اس نے جواب دیا "اگر آپ میرے ساتھ ہر روز ایک پارہ "دور" کر لیا کریں تو میں قرآن سنا دوں گا" اس طرح آپ نے اسی رمضان شریف میں نہ صرف قرآن حافظ کر لیا بلکہ سنا بھی دیا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ تمام دن میں پارہ یاد کیا کرتے تھے تو حافظ غلام محی الدین نے فرمایا "نہیں' صرف چاشت کے وقت تک ایک پارہ حفظ ہو جایا کرتا تھا۔"

مولانا غلام محی الدین پنجاب سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے برادر خورد احمد دین کے ہمراہ عازم دہلی ہوئے اور بارہ برس تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ علم حدیث کی تعلیم دونوں بھائیوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے مولوی محمد اسحاق سے حاصل کی۔ مولانا موصوف دونوں نابغہ روزگار بھائیوں کی ذہانت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بصد شوق ان کو اپنے نانا حضور کی خدمت میں لے گئے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے دونوں بھائیوں سے چند سوالات کئے اور دونوں بھائیوں کی علمی فضیلت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سند حدیث عطا فرمانے کے ساتھ بطور خاص دعائے خیر سے بھی نوازا۔ مولانا غلام محی الدین بگھی نے تیس برس تک لاہور لال مسجد میں درس دیا۔ شاہی مسجد لاہور کی خطیب مولانا غلام محمد آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے۔ مولانا غلام محمد خطیب بادشاہی مسجد کا فتوی بھی چلتا تھا جو آج "فتاوی صابریہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۰۰ء میں مولانا غلام محمد کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کے فرزند مولانا محمد شفیق بادشاہی مسجد لاہور کے خطیب مقرر ہوئے۔ شاہ حسین کے والدین نے حافظ ابوبکر بگھوی کا انتخاب ان خاندانوں کی علمی فضیلت کے پیش نظر کیا تھا۔

بنظر غور دیکھا جائے تو جو کارنامہ شاہ حسین نے ۱۶ویں صدی میں دریائے راوی کے کنارے خضرؑ کی وسطات سے سرانجام دیا اور مسجد ابوبکر میں قرآن سنایا اسی کی بازگشت بگھ دیہات کے علمی خاندانوں میں سنائی دی اور اسی روایت پر عمل پیرا ہو کر مولانا غلام محی الدین نے وہی عمل دہرایا اور علمی وراثت کا حق ادا کر دیا۔

شاہ حسین کے آباواجداد ہندو تھے جو فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں مشرف بہ اسلام

ہوئے۔ یہ نو مسلم خاندان بطور احترام شیخ کہلوایا۔ ویسے شاہ حسین کے والد ماجد شیخ عثمان کا تعلق راجپوت گوت ”کلرائے“ سے تھا اور والدہ راجپوتوں کی شاخ ڈھڈی یا ڈاہڈا سے تھی۔ خلاف دستور، شاہ حسین اپنے باپ کی عرفیت کے بجائے والدہ کی نسبت سے ”حسین ڈاہڈا“ مشہور ہوئے۔ داراشکوہ نے بھی ان کو حسین ڈاہڈا ہی لکھا ہے مگر طرز تحریر سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ داراشکوہ نے شاہ حسین کی جلالی کیفیت سے متاثر ہو کر حسین کے ساتھ ”ڈاہڈا“ کا لاحقہ استعمال کیا ہے کیوں کہ پنجابی زبان میں ڈاہڈا بمعنی سخت مزاج اور تند خو مستعمل ہے۔ شیخ عثمان کا پیشہ بافندگی تھا اس طرح شاہ حسین اپنے آپ کو حسین جولاہا کہا کرتے تھے۔

نام حسین تے ذات جولاہا
گالی دیندیاں تانی والیاں

(میرا نام حسین ہے مگر ذات کا جولاہا ہوں جسے تانی والی بطور تحقیر استعمال کرتی ہیں)

شاہ حسین لاہور ٹکسالی دروازے والی مسجد ابوبکر میں حصول تعلیم میں مشغول تھے کہ ایک روز ایک قلندر صفت درویش بے ریا قسم کا انسان اس مسجد میں وارد ہوا۔ چہرے سے تھکن کے آثار ہویدا تھے، ظاہرہ حالت اس کی لمبی مسافت کا اعلان کر رہی تھی۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے بچوں کو دیکھا اور اس کی نگاہیں شاہ حسین پر آ کر ٹک گئیں۔ بے اختیار اس کے منہ سے ”آہ“ نکل گئی، یہ ”آہ“ اندرونی شدت کرب کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس ”واہ“ کے مترادف تھی جس کا اظہار ایک تشنہ لب مسافر، وسیع و عریض اور بے آب و گیاہ صحرا عبور کر کے، منزل پا لینے کی بعد کرتا ہے۔ یہ درویش بے ریا شیخ بہلول دریائی تھے جن کو شاہ حسین کا استاد ثانی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ رشتہ چھبیس برس پر محیط ہے۔ شیخ بہلول وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے شاہ حسین کی رندی و قلندری کو بنظر تحسین دیکھا اور جو کچھ دیکھا اسے دل کی آنکھ نے قبول کر لیا۔

شیخ بہلول دریائی اپنے روحانی فرزند شاہ حسین سے ۲۴ برس پیشتر ۹۲۱ھ بمطابق ۱۵۱۴ء ضلع جھنگ قصبہ لالیاں کے قریب دریائے چناب کے کنارے آباد ایک چھوٹے سے گاؤں ”بہلول“ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام تینی جاٹ تھا جن کا تعلق جاٹوں کی معروف ذات ”سپرا“ سے تھا۔ اس خاندان کا پیشہ اگرچہ کاشتکاری تھا مگر جوشیلے نوجوان

فوجی ملازمت کو دلی رغبت سے اختیار کرتے تھے۔ شیخ بہلول کے والد ماجد کا یہی خیال تھا کہ ان کا لخت جگر بڑا ہو کر اعلیٰ افسر بنے گا مگر اہل خاندان کو یہ خبر نہ تھی کہ بچے کی قسمت میں درویشی کی سپہ سالاری لکھ دی گئی ہے۔ پانچ برس کی عمر میں حرف شناسی کے لئے بچے کو حسب دستور، قریبی مدرسے میں داخل کرا دیا گیا جہاں پہلے روز ہی بچے نے اپنے پہلے سوال سے استاد کو ورطۂ حیرت میں ڈبو دیا۔

"بیٹا! پڑھو بسم اللہ۔" استاد نے شاگرد کو حکم دیا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟" بچے نے معصوم لہجے میں سوال کیا۔

"خیروبرکت کے لئے ہر کام کا آغاز "بسم اللہ" سے ہونا چاہئے" استاد نے مسکرا کر بچے کو تسلی بخش جواب دیا۔

"آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ بسم اللہ زبان کا وضو ہے؟" بچے نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو استاد نے چونک کر شاگرد کو دیکھا۔

"بالکل، میرا یہی مقصد ہے" استاد بچے کی تشریح سے ششدر رہ گیا۔

"استاد مکرم، کیا غسل کے بعد وضو کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟"

"ہرگز نہیں" استاد کے لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔

"انسان کا دل سمندر نہیں تو دریا ہونا چاہئے" بچے نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی "دل دریا میں غوطہ لگانے سے جسد خاکی خودبخود پاک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پانی طاہر بھی ہے اور "مطہر" بھی۔ (پاک کرنے والا اور پاک) سارے جسم کے غسل کے بعد زبان کا وضو چہ معنی دارد؟" استاد کے ساتھ سامعین بھی دنگ رہ گئے۔

"بیٹا! پھر بھی بس اللہ ہر کام کے آغاز کے لئے بے حد ضروری ہے" استاد نے زچ ہو کر کہا۔

"کمال ہے، اپنا نام ادا کرنے کے لئے اللہ اپنے نام سے زبان کو وضو کراتا ہے کیوں کہ اس کے بعد آپ کہیں گے بیٹا پڑھو، الف اللہ۔"

"بات یہ ہے بیٹا جی کہ آپ نہ صرف بسم اللہ بلکہ "تعوذ" (اعوذباللہ...) بھی پڑھیں تاکہ شیطان رجیم کے شر سے اللہ کی پناہ میں آ جائیں" استاد نے شاگرد کی زبان میں گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ابلیس کی کیا جرأت کہ وہ میرے اور اللہ کے درمیانی تعلق میں مداخلت کر سکے" بچے کا لہجہ اس کی عمر کے مطابق ہرگز نہیں تھا "ابلیس تو بذات خود ہماری قید میں ہے اور ایک قیدی' آزاد ہستیوں کے معاملات میں کیسے دخل انداز ہو سکتا ہے؟"

استاد سے جواب نہ بن پڑا تو اس نے روایتی گھن گرج سے کام لیا اور شاگرد کو بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا۔ بچے نے بسم اللہ سے آغاز کیا اور سارا سبق فرفر سنا دیا۔ چند روز تک یہی تماشا ہوتا رہا۔ استاد سبق پڑھانے کی کوشش کرتا تو شاگرد اگلا سبق سنا دیتا۔ عجیب صورت حال تھی۔ آخر تنگ آ کر استاد مکرم نے شیخ بہلول کے والد کو مشورہ دیا "یہ بچہ کسی اور منزل کا مسافر ہے' بہتر ہے اسے کسی درویش کے سپرد کر دیا جائے۔"

تینی جاٹ کے اتنے وسائل نہ تھے اور جہاں وسائل نہ ہوں مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مگر اچھی بات یہ تھی کہ بچہ غیراخلاقی حرکات کا مرتکب نہیں ہو رہا تھا بلکہ بعض اوقات اس سے خرق عادت واقعات سرزد ہونے لگے۔ بستی اور اس کے گرد و نواح میں بچے کی شہرت پھیل گئی۔ ادھر بچہ رفتہ رفتہ' بچہ نہ رہا' عنفوان شباب میں قدم رکھا تو اندر کی بے چینی نے برا حال کر دیا۔ والدین نے اس بے چینی کا روایتی حل ڈھونڈ نکالا یعنی جوان بیٹے کو شادی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ بیوی بچوں کی زنجیریں سارے کس بل نکال دیں گی..... والدین کی حکم عدولی کی شیخ بہلول میں تاب تھی نہ مجال۔ لہٰذا قبیلے کی ایک دوشیزہ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ دو بیٹے محمد علی اور ولی محمد تولد ہوئے۔ عمر عزیز کے ۲۸ ویں برس میں اندر کا اضطراب ناقابل برداشت ہو گیا اور شیخ بہلول زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کرنے عزیز و اقربا سے رخصت ہو کر گھر سے چل نکلے۔ زادراہ کی فکر نہ تھی کہ درویشوں اور پنچھیوں کو ذات حق پر کامل بھروسہ ہوتا ہے لہٰذا وہ فکر رزق سے آزاد ہوتے ہیں۔

"شہر علم" کی زیارت سے پہلے "باب علم" پر حاضری ضروری تھی لہٰذا شیخ موصوف نجف اشرف' روضۂ حیدر کرار پر حاضر ہوئے۔ دو برس تک مزار مقدس پر جاروب کشی کی۔ علی المرتضیٰؓ سے روحانی فیض حاصل ہوا۔ جب "باب علم" مہربان ہو تو علم کی کون سی شاخ ہے جو حجاب میں رہے۔ ادھر شدت طلب ادھر وفور عطا نہ کوئی حد نہ حساب۔ پھر دربار حیدری سے ارشاد ہوا کہ کربلا معلیٰ امام حسینؓ کے روضے پر حاضری دی جائے۔

شیخ بہلول حسب ارشاد کربلا پہنچے اور روضہ حسینؓ پر جاروب کشی کا آغاز کیا۔ تین ماہ بعد عازم حرمین شریفین ہوئے۔ یہ حج کا موسم تھا لہٰذا شیخ بہلول مناسک حج ادا کرنے کے بعد روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے۔ کیف و سرور میں فصیل جاں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی، عالم شوق کی یہ کیفیت کہ پر لگا کر گنبد خضرا تک رسائی کو جی چاہ رہا تھا، پیکر خاک پیاسی زمین بن چکا تھا جو ابر رحمت کے قطرے قطرے کی منتظر ہوتی ہے۔ خدا خدا کر کے مکہ سے مدینے کا سفر اختتام پذیر ہوا۔ وفور شوق کا تقاضا تھا کہ فوراً "مسجد نبویؐ کی زیارت نصیب ہو۔ پھر روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلہ پر چھ ماہ بارش انوار میں بسر ہوئے۔ وہ منازل جن کو طے کرنے میں عمریں درکار ہوتی ہیں قربت حبیب اللہ کی برکت سے پلوں میں طے ہونے لگیں اور یہیں سے شیخ موصوف کو سفر بغداد کا حکم ہوا۔ گھر سے نکلے پانچ برس گزر چکے تھے مگر بہلول شیخ وقت اور زمانے کے شمار سے آزاد ہو چکے تھے یہی لمحات حاصل زندگی تھے۔ مدینے کی گلیاں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر حکم رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے سرتابی کی مجال نہ تھی اس لئے بغداد پہنچے اور غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پرانوار پر حاضری دی۔ ایک سال بعد مشہد میں امام موسیٰ کاظم کے دربار پر خاکروبی کا اشارہ ہوا چنانچہ کوچہ مشہد کی گدائی کو پہنچے۔ یہاں مختلف مکاتب فکر کے لوگ آیا کرتے تھے۔ بقول شیخ بہلو سرزمین حجاز میں ایسی ایسی شخصیات مدفون ہیں کہ باقی کرۂ ارض پر ان کے عشر عشیر کیا خاک پا کے برابر بھی نہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ہر ملک کے ہر شہر میں بزرگان دین کے مزار موجود ہیں۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی شوخ سے شوخ ستارہ حتیٰ کہ چاند تک اپنی روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس عالم کون و فساد میں غوث، قطب، ابدال کس کی مجال ہے کہ گنبد خضرا کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے یا اس کے ہوتے ہوئے اپنے "وجود" کے اظہار کی جسارت کر سکے؟ یہی وجہ ہے کہ سرزمین عرب پر ایک ہی دربار سجا ہے اور باقی تمام بارگاہوں کی اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔

مشہد سے شیخ بہلول کو افغانستان میں کوہ پنج شیر کی چوٹی پر پہنچنے کا حکم ہوا۔ لہٰذا اگلی منزل افغانستان قرار پائی۔ کوہ پنج شیر کی اس چوٹی پر ایک ایسا غار موجود ہے جو اصحاب کہف کے غار کی ہو بہو تصویر بیان کی جاتی ہے۔ یہی غار، شیخ بہلول کی منزل مقصود تھی۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو چند لوگوں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے شیخ کو غار تک جانے سے منع

کر دیا۔ شیخ بہلول کے اشتیاق کو مزید ہوا ملی۔ "غار میں کیا اسرار پوشیدہ ہیں؟ اور یہ لوگ مجھے وہاں جانے سے کیوں روک رہے ہیں؟" یہی سوچ تھی جو شیخ کو غار کی جانب کھینچ رہی تھی۔ دامن کوہ میں آباد درویشوں نے تفصیل بیان کی کہ غار میں ایک مردخدا مصروف عبادت ہے جو مہینوں مراقبے میں بسر کر دیتا ہے۔ اس نے خلق خدا کو دور رکھنے کی بہت کوشش کی مگر لوگ اپنی حاجت روائی کی خاطر کشاں کشاں چلے آتے' اس طرح مرد قلندر کی عبادت میں مخل ہوتے' پہلے تو غار نشین درویش ذات باری تعالیٰ کی جمالی شان کا مظہر تھا پھر رفتہ رفتہ شان جلال غالب آتی گئی' اب صورت حال یہ ہے کہ وہ جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہے اس سمت فضا میں آگ لگ جاتی ہے لہٰذا جو شے درویش کے روبرو ہو' وہ جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ "کیا اس جلالی شان کا اظہار مسلسل ہوتا ہے؟" شیخ بہلول نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں' ایسا تو نہیں" پہاڑ کے دامن میں مقیم لوگوں نے جواب دیا "کچھ عرصہ بعد درویش کی نگاہیں مجسم جمال بن جاتی ہیں اور پھر جب وہ راکھ شدہ اشیا پر نگاہ ڈالتا ہے تو ان کی شادابی لوٹ آتی ہے' ہم چوں کہ ایک عرصے سے یہاں مقیم ہیں لہٰذا بتا سکتے ہیں کہ آج کل درویش پر جلالی کیفیت ہے لہٰذا اگر آپ اس کے سامنے گئے تو جل کر راکھ ہو جائیں گے۔"

شیخ بہلول دریائی سرنگوں کچھ دیر سوچتے رہے پھر متبسم لہجے میں کہا "ہم تو خلق خدا کو ضرر رسانی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے۔ مالک کائنات نے ہزارہا عالم تخلیق فرمائے ہیں اور ہر ذی روح کو تحفظ بھی فراہم کیا ہے۔ اسے اپنی مخلوق سے بے حد پیار ہے اور رضائے الٰہی کے حصول کا بہترین ذریعہ اس کی مخلوق سے پیار کرنا ہے۔ وہ درویش جو بندوں کو گزند پہنچاتا ہے مقام رضا بالقضا سے بہت دور ہے۔ وہ کیسا عاشق ہے جو محبوب کے اشارہ ابرو سے غافل ہے اور ہمارے مقصود و مطلوب کی رضا یہ ہے کہ اس کی مخلوق سے پیار کیا جائے" یہ کہہ کر شیخ بہلول دریائی' وادی میں مقیم بوریا نشینوں کے پندو نصائح کی پروا نہ کرتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی کی جانب چل دیئے۔ ان کو مشہد سے یہی اشارہ ملا تھا کہ ان کی منزل یہی کوہ پنج شیر کے غار میں مقیم بزرگ ہیں۔ یہاں حالات عجیب رخ اختیار کر چکے تھے' فقیروں نے شیخ بہلول کو دانستہ وادی مرگ میں قدم رکھتے دیکھا تو کف

افسوس ملنے لگے مگر جسے شہادت کا شوق ہو اس کا کیا علاج۔ ادھر بہلول دریائی زیر لب مسکرا رہے تھے "واہ مولیٰ" گوہر مقصود کے گرد کیسا آتشیں حصار قائم کر رکھا ہے۔ ٹھیک ہے بندہ تو ہر پل' ہر سانس تیری رضا کا خواہش مند ہے اس راہ میں اگر جل جانا مقدر ہے تو بندے کو کیا عذر ہو سکتا ہے" دل میں یہی سوچ تھی جب شیخ بہلول مطلوبہ غار میں پہنچے۔ انہوں نے اسی دشت پیمائی میں عمر گزاری تھی ہر پل رضائے الٰہی کو چاہا تھا۔ حب اختیاری کا تقاضا تھا کہ گل بوسی کے شوق میں کانٹوں پر لب رکھ دیئے جائیں۔ سورج عین نصف النہار پہ تھا جب وہ غار کے دہانے پر پہنچے۔ یہ وقت شان جلال کے عروج کا ہوتا ہے مگر شیخ موصوف سودوزیاں اور عروج و زوال کے بکھیڑوں سے آزاد ہو چکے تھے۔ بے دھڑک اندر داخل ہوئے تو سامنے بزرگ کو حالت مراقبہ میں پایا۔ ایک کونے میں گم صم کھڑے ہو گئے۔ غار نشین آنکھیں بند کئے عالم بالا کی سیر میں محو تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال بے تحاشا بڑھ چکے تھے۔ شیخ بہلول ٹکٹکی باندھے مست الست درویش کو دیکھتے رہے۔

"درویش حالت جذب میں ڈوبا ہوا ہے" شیخ موصوف نے سوچا "مراقبے میں مداخلت ظلم کے مترادف ہے لہٰذا انتظار کرنا مناسب ہو گا" پھر ایک اور خیال ان کے دل میں پیدا ہوا "درویش کے بال بے تحاشا بڑھ چکے ہیں کیوں نہ ان کو مناسب حد تک تراشنے کا بندوبست کیا جائے؟" یہ سوچ کر وہ اطمینان سے باہر نکلے اور واپس پہاڑ کے دامن میں تشریف لے آئے۔ وادی میں مقیم لوگوں نے شیخ کو زندہ سلامت دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور بخیر و عافیت مراجعت پر مبارک باد پیش کی مگر شیخ بہلول قریبی بستی کی طرف چل دیئے اور بالوں کی تراش خراش کا جملہ سامان لے کر لوٹے۔ لوگوں نے شیخ کو اس جرات رندانہ سے باز رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی مگر شیخ بہلول نے ان کو مناسب الفاظ میں مطمئن کر دیا۔

"شیخ بہلول' آپ خود غرضی سے کام لے رہے ہیں۔" ایک روشن ضمیر وادی نشین نے یاد دلایا۔

"جناب' وہ کیسے؟"

آپ حصول مقصد کے لئے مرد قلندر کے مراقبے میں مخل ہو رہے ہیں۔ اسے مطلب براری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ دنیادار لوگ اسے اپنا الو سیدھا کرنا کہتے ہیں۔ لازم ہے

کہ آپ کچھ دیر انتظار فرمائیں اور غار نشین کو مراقبے سے واپس آلینے دیں' ہونے نہ ہونے کا بھی ایک وقت مقرر ہے۔" بات شیخ بہلول کی سمجھ میں آگئی لہٰذا وہ رات انہوں نے پہاڑ کے دامن میں بسر کی دوسرے روز وہ پھر سوئے غار چل دیئے۔ دہانے کے قریب پہنچے تو مرد قلندر کو اپنا منتظر پایا۔ شیخ بہلول سجدۂ شکر بجالائے۔ غار نشین سے اجازت لے کر اس کے بال تراشنے لگے' ڈاڑھی حد شریعت میں لائی گئی پھر تفصیل سے اپنے آنے کی غرض و غایت بیان کی۔ غار نشین نے سفر کا حال خاموشی سے سنا۔

"شیخ بہلول' اس بندۂ ناچیز کو آپ ہی کا انتظار تھا" غار نشین نے پرسکون لہجے میں کہا "لاہور میں دنیاوی رنگین ابرپاروں سے بلندی پر پرواز کرنے والا شاہین پیدا ہو چکا ہے' آپ فوراً تشریف لے جائیں اور اس کی تربیت فرمائیں یہی لوح محفوظ پر مرقوم ہے۔ بلند پرواز شاہین کی تربیت آپ کے نام لکھ دی گئی ہے۔" پھر غار نشین نے شاہ حسین کا مکمل تعارف' شیخ بہلول دریائی کے گوش گزار کیا اور کامل احتیاط کی تلقین کی۔ شیخ موصوف افغانستان کوہ پنج شیر کی چوٹی سے روانہ ہو کر لاہور محلہ تلہ بھاگا' مسجد ابوبکر تشریف لے آئے اور شاہ حسین کو پہچان کر اسی مسجد میں فروکش ہوئے۔ اس داستان میں مزید پیش رفت سے پیشتر یہ بتا دینا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ ضلع جھنگ کے شیخ بہلول دریائی جنہوں نے شاہ حسین کی چھبیس برس تک تربیت کی برصغیر کی تحریک آزاد کے شہید اعظم سلطان فتح علی ٹیپو حاکم میسور کے جد اعلیٰ ہیں۔ یہ اعزاز بھی بڑا غیر معمولی ہے۔ محمد بہلول کے فرزند اکبر محمد علی کی شادی حضرت شیخ محمد حسین گیسودراز کے خلیفہ مجاز حضرت حسن بخت کی صاحب زادی زینت بیگم سے ہوئی جن کے بطن سے چار لڑکے تولد ہوئے۔ محمد الیاس' علی محمد' محمد امام اور فتح محمد۔ شادی کے بعد محمد علی گلبرگہ تشریف لے گئے اور دربار حیدر آباد سے منسلک ہوئے چنانچہ فتح محمد اور الیاس حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے اور اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ اراکاٹ چلے گئے۔ نواب اراکاٹ کی ملازمت کے دوران فتح محمد یعنی بہلول دریائی کے پوتے کے ہاں شہباز خاں اور حیدر علی پیدا ہوئے۔ شہباز خاں فرزند اکبر تھے اور حیدر علی ان سے چھوٹے۔ حیدر علی نے ریاست میسور کی فوج میں شمولیت اختیار کی اور فاتح میسور ہوئے۔ حیدر علی کی دوسری شادی والی اراکاٹ نواب سعادت علی خاں کی صاحب زادی' فاطمہ عرف فخر النساء سے ہوئی جن کے بطن سے مجاہد اعظم سلطان فتح

علی ٹیپو شہید تولد ہوئے۔ گویا ٹیپو شہید کے دادا' بہلول دریائی کے پوتے تھے۔ یہ چار پشتوں کا سلسلہ کوئی اتنا دراز نہ تھا کہ سلطان فتح علی ٹیپو کے شوق شہادت کو متاثر کر سکتا۔ دریائے چناب کے پانی کا اثر کم از کم سات پشتوں تک جاتا ہے۔ اسی لئے اسے "چن' آب'" یعنی آب مہتاب کہا جاتا ہے اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ چاند ہی' سمندروں میں طوفانوں کا اصل سبب ہے۔ مدوجزر چاند ہی کی بدولت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

شیخ بہلول نے شاہ حسین کو اپنی شاگردی میں لیا تو اس کی عمر دس برس تھی اس لحاظ سے استاد کی عمر پینتیس برس کی ہو چکی تھی۔ یہ ۹۵۵ھ بمطابق ۱۵۴۸ء کا ذکر ہے۔ شاہ حسین کی پیدائش جس پر تقریباً" سب کا اتفاق ہے وہ ۱۵۳۸ء ہی ہے اور متحدہ ہندوستان میں یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے زیر و زبر کر دینے والا تھا۔

مغل شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں کا تخت لرز رہا تھا۔ بنگال و بہار سے افغانی سردار فرید خاں عرف شیر شاہ ایک تند طوفان بن کر اٹھ چکا تھا۔ اسی برس اس نے صوبہ بہار کی سرحد رپ قلعہ رہتاس گڑھ ایک انوکھی سیاسی چال سے حاصل کیا۔ مغل افواج سے ٹکرانے کے لئے فرید خاں کو ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعے کی ضرورت تھی اور قلعہ رہتاس گڑھ جو دریائے گنگا کے کنارے پہاڑ کی بلند چوٹی پر واقع تھا فرید خاں (شیر شاہ سوری) کے خوابوں کی تعبیر تھا مگر والی قلعہ ہر کشن مہاراج آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی شے نہیں تھا۔ فرید خاں نے بنیا مزاج ہندو راجا کی حسب منشا جال پھیلایا اور وہ اس ہم رنگ زمین جال میں پھنس گیا۔ فرید خاں نے پیغام بھیجا۔ "مہاراج ہر کشن! مغل شہنشاہ ہمایوں میری سرکوبی کو بنگال آ رہا ہے' میں اپنا خزانہ اور خاندانی مستورات کسی آپ جیسے غیرت مند اور ایماندار شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ زندہ رہا تو اپنا خزانہ واپس لے لوں گا مر گیا تو اس کے مالک و مختار آپ ہوں گے اور میری خاندانی مستورات کی حفاظت کریں گے۔"

خزانے والی ترغیب اپنا کام کر گئی اور فرید خاں نے پانچ صد ڈولیوں میں سپاہی بٹھا دیئے۔ چند سپاہی مزدوروں کے بھیس میں ساتھ ہو لیے اور دیکھتے ہی دیکھتے افغان سپاہی رہتاس گڑھ کے ناقابل تسخیر قلعے میں داخل ہو گئے۔ اس طرح فرید خاں ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری بنا اور ہمایوں ایران ہجرت کرنے پر مجبور ہوا۔ لاہور کی سیاسی فضا بھی اس سے

متاثر ہوئی۔ یہ شہر تو ویسے بھی سو بار اجڑا اور ایکسو ایک بار آباد ہوا۔ بقول شاہ حسین ”میرے لاہور کے میر ملک شہزادے اور ان کے جلو میں جنگی سازوسامان، مسرت کے شادیانے پل بھر میں فنا ہو جاتے ہیں۔“

حضرت بلھے شاہ نے لاہور کے دوسرے رنگ کو اجاگر کیا۔

عرش منور بانگا ملیاں
سنیاں تخت لاہورے

(تخت لاہور اتنا بلند اور صاحب وقار ہے کہ عرش معلیٰ پر دی گئی اذان لاہور تخت پر سنی گئی)

دس برس کی عمر میں شاہ حسین کی تربیت مولانا ابوبکر سے ہوتی ہوئی شیخ بہلول دریائی تک پہنچی۔ شیخ موصوف وارد لاہور ہوئے تو اپنی منزل تک پہنچے تو ماہ رمضان کی آمد تھی، تربیت کا آغاز ہوا تو شیخ نے مولانا سے دریافت فرمایا ”اس مسجد میں نماز تراویح کون پڑھاتا ہے؟“

یہ فریضہ اس ناچیز کے ہاتھوں سرانجام پاتا ہے“ مولانا نے حقیقت حال کا اظہار کیا۔

”اس بار نماز تراویح یہ بچہ پڑھائے گا“ شیخ بہلول نے دھماکا کیا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ بچہ تو صرف سات سیپارے حفظ کر چکا ہے اور تراویح میں پورا قرآن سنایا جاتا ہے“ مولانا نے حیرت سے شیخ بہلول کی طرف دیکھا۔

”اس کا انتظام بھی ہو جائے گا“ شیخ کے لہجے میں اتنا اعتماد تھا کہ مولانا ابوبکر بگھوی خاموش ہو گئے اور یکم رمضان المبارک کی نماز تراویح کے لئے شاہ حسین کو مقام امامت پر فائز کر دیا گیا۔ دونوں اساتذہ مقتدی بنے۔ مولانا ابوبکر نے بچے کی تلاوت میں الوہی رنگ ملاحظہ فرمایا تو ورطہ حیرت میں ڈوب گئے ”یہ انداز تلاوت تو میں نے کبھی دیکھا نہ سنا۔“ مولانا نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ لاہور میں علم و ادب، تفسیر، ناظرہ، علم حدیث کے بیسیوں مراکز تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر علم کا سمندر موجزن تھا۔ بڑے بڑے علماء تلہ بگھہ کی مسجد میں اس طرفہ تماشا کی دید کو حاضر ہوئے۔ بچے نے سات پارے ختم کئے تو ہر عالم کے ذہن میں بہت بڑا سوالیہ نشان معروض وجود میں آیا۔ خود شاہ حسین کی کیفیت بھی دیدنی تھی۔ چنانچہ علی الصباح سحری کے بعد وہ شیخ

بہلول کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سوال سے پہلے ہی شیخ بہلول نے انہیں دریائے راوی پر بھیج دیا۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ دریائے راوی کی گزرگاہ ٹکسالی دروازے سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ وہاں جو کچھ پیش آیا اس کی تفصیل بھی بیان کی جا چکی ہے۔ شاہ حسین، خضرؑ کی زیارت کر کے لوٹے تو ان کی شخصیت میں زمین و آسمان کا فرق نمایاں تھا۔ مرشد نے مسکرا کر دریافت فرمایا۔ "عزیزم! کس حال ہو ہو؟"

"حضور! سارے حجاب دور ہو چکے ہیں" پھر شاہ حسین نے ملاقات کی تفصیل، اپنے پیر و مرشد کے گوش گزار کی۔ شیخ بہلول نے سکون سے ساری روداد سنی اور کہا "الحمد للہ..." آغاز خیل خوب است، انجام بھی انشاء اللہ بخیر ہو گا مگر فرزند، ایک بات یاد رکھنا، یہ راز ربانی ہے اور جس نے اس راز کی حفاظت کی وہ منزل مراد سے ہمکنار ہوا، دوسری بات ظرف کی وسعت ہے تنگ ظرف والے انسان فورا" چھلک جاتے ہیں اور یہ شیوۂ مردانگی نہیں" شاہ حسین نے مرشد کے ہر لفظ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنا اور دونوں باتوں کو پلے باندھ لیا۔

شہر لاہور زمانہ قدیم ہی سے علوم کا مرکز چلا آیا ہے۔ ۱۸۴۹ء میں فرنگیوں نے گجرات پنجاب کے مقام پر سکھوں کو شکست فاش سے ہم کنار کر کے سکھ قوم کی سیاسی قوت کا شیرازہ بکھیر دیا اور لاہور انگریزوں کے زیر تسلط آ گیا۔ ۱۸۵۰ء میں بحکم سرکار لاہور کے تحصیلدار لالا اجودھیا برشاد نے مردم شماری کے بعد جو تفصیل پیش کی وہ حیرت انگیز طور پر دلچسپ ہے۔ یہ ماضی بعید و قریب کے لاہور کی مکمل تصویر ہے۔ انیسویں صدی کے نصف میں لاہور شہر کی آبادی پچاس ہزار تین سو پانچ (۵۰۳۰۵) نفوس پر مشتمل تھی۔ دکانیں اور مکانات اٹھائیس ہزار چھ سو چورانوے (۲۸۶۹۴) باغات تیس عدد، فارسی عربی اور شاستری مدارس کی تعداد دو سو چونتیس (۲۳۴) بیان کی گئی ہے۔ کیا دنیا کے کسی خطے پر کوی ایسا شہر موجود ہے جس کی آبادی پچاس ہزار ہو اور مدارس دو سو چونتیس۔ اس تفصیلی جائزے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان میں سیاسی انتشار کے باوجود ہر زمانے میں جس چیز کی حفاظت کی وہ علم و عرفان کے مراکز ہیں۔ ان دو سو چونتیس مدارس میں غیر مسلموں کے شاستری اسکول صرف اڑتیس عدد تھے۔ باقی "۱۹۶" مدرس عربی فارسی کے تھے۔ اس شہر پر ماضی قریب کی تباہیوں میں سکھوں کی تباہی

سرفہرست ہے۔ احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ درانی نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس سے پہلے مغل بادشاہ شاہ عالم کی تخت نشینی کے سلسلے میں چار میں سے تین شہزادوں نے اس شہر کو میدان جنگ قرار دیا اور مقتول ہوئے۔ عہد شاہ حسین میں ایک طویل بد نظمی کے بعد مغل شہنشاہ اکبر نے شہر لاہور کی رونق کو بحال کیا۔ شاہ حسین نے جب تحصیل علم کا آغاز کیا تو لاہوری مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب پر نظر ڈالیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ خلیق احمد نظامی "حیات عبدالحق محدث دہلوی" میں رقمطراز ہیں "سرزمین ہند کی فضا اس قابل ہو گئی تھی کہ فخرالدین رازی اور امام غزالی کے ہم پلہ عالم پیدا کر سکے اور لاہور علمی مراکز کا دل تھا۔"

کتب تفاسیر جو شاہ حسین کے زیر مطالعہ آئیں ان میں مدارک، بیضاوی، کشاف جیسی بلند پایہ کتب تھیں۔ تصوف میں عوارف، خصوص الحکم، احادیث میں مشارق الانوار، اور مصابیح السنہ منطق کی شرح شمسیہ، فن کلام میں شرح صحائف، تمہید از ابو شکور سالمی اس کے علاوہ ادب میں مقالات حریری، علم نحو میں کافیہ، لب الالباب (از قاضی ناصرالدین بیضاوی) فقہ میں ہدایہ، یہ چند ایک کتب ہیں جو شاہ حسین کے زمانہ طالب علمی میں شامل نصاب تھیں۔ ان کتاب پر حاوی علما کو اگر شاہ حسین نے بحث و تمحیص میں لاجواب کر دیا تو اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ شاہ حسین کے سینے میں علم لدنی موجزن تھا ورنہ اس نے بھی ان کتب کا مطالعہ اسی انداز میں کیا تھا جس انداز میں اس دور کے دوسرے طالب علم کر چکے تھے۔

بچپن میں شاہ حسین کا طرز استدلال کس انداز کا ہوا کرتا تھا مشتے از خروارے کے طور پر صرف ایک مثال پیش خدمت کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ خضرؑ کی زیارت سے مستفید ہونے کے بعد کا ہے...... حفظ قرآن کے بعد شیخ بہلول اپنے شاگرد کی تربیت عموماً درگاہ حضرت علی ہجویری المعروف داتا دربار پر کیا کرتے تھے۔ مسجد ابوبکر سے بھی تعلق استوار تھا۔ ایک روز مولانا ابوبکر بگھوی درس دے رہے تھے کہ مسئلہ "توفیق" الجھ کے رہ گیا۔ مولانا کا ارشاد تھا کہ توفیق خداوندی سے بندہ نیک اعمال کا ارتکاب کرتا ہے۔ بات تو بظاہر کوئی الجھن والی نہ تھی مگر ابلیس ایسے معاملات ہی میں وسوسے ڈالتا ہے۔ ایک اچھے بزرگ صورت سامع نے اعتراض جڑ دیا......"جب صاحب بندہ ہی بندے کو توفیق عطا

نہ فرمائے تو نیک اعمال کی کوتاہی میں بندے کا کیا قصور؟" یہ اعتراض بھی بظاہر سو فیصد درست معلوم ہوتا تھا لیکن اس طرح تو گناہ و ثواب کا امتیاز ہی اٹھ جاتا ہے۔ خدا جسے توفیق عطا فرمائے اس سے نیک اعمال سرزد ہو جاتے ہیں اور اس سے برعکس صورت حال میں انسان گناہوں کی دلدل میں دھنس جاتا ہے۔ لیکن جس انداز میں شاہ حسین نے سائل کی تسلی کی وہ تاقیامت کج ذہنوں کا ناطقہ بند کر دینے والی بات ہے۔

"استاد مکرم' میں آپ کی اجازت سے اس شیطانی وسوسے کا جواب دینے کی جسارت کرتا ہوں" شاہ حسین نے مداخلت کی "توفیق کی تعریف یہ ہے کہ بندے کی نیک خواہشات کے عین مطابق صاحب بندہ کی جانب سے مناسب اسباب کی فراہمی۔ اس طرح توفیق میں شدت طلب پہلے آتی ہے اور "عطا" قادر مطلق کی جانب سے اس کا جواب ہوتا ہے۔ طلب کے فقدان کی صورت میں عطا پہ اصرار جہالت ہے۔ ذات خداوندی کی جانب صدق دل سے اٹھایا ہوا ایک قدم کافی ہوتا ہے کیوں کہ اس کے جواب میں حق تعالیٰ ستر قدم اپنی پیاری مخلوق کی طرف بڑھا دیتا ہے لہٰذا نیک اعمال کی کوتاہی کے سلسلے میں خالق کو موردالزام ٹھہرانا کلمۂ کفر ہے" اس تعریف سے خود مولانا ابوبکر دنگ رہ گئے۔ بات بالکل سامنے کی تھی مگر اکتسابی اور علم لدنی میں یہی فرق ہے کہ علم لدنی والا جب بات کرتا ہے تو مفہوم دل میں اتر جاتا ہے کیوں کہ بات کرنے والے کی دلی رغبت اور روح کا میلان' اس گفتگو میں شامل ہوتے ہیں۔

دربار حضرت علی ہجویری پر شاہ حسین علمی منازل طے کرنے کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے اس طرح ان کے تیسرے استاد خود علی ہجویریؒ ہیں۔ ایک روز شیخ بہلول اپنے روحانی فرزند کو مفصل ہدایات دینے کے بعد دربار سے رخصت ہو گئے۔ ان کے آخری الفاظ تھے۔ "فرزند' باقی کام خود علی ہجوریریؒ سرانجام دیں گے' اسی آستانے پر مجاہدے اور مراقبے میں مصروف رہنا۔"

شیخ بہلول اپنی ذمے داری بطریق احسن سرانجام دینے کے بعد لاہور سے رخصت ہوئے مگر اپنے آبائی قصبے میں جانے کے بجائے حکومت وقت (مغل شہنشاہ اکبر) کے باغی اور پنجاب کے نامور سپوت عبداللہ بھٹی کے علاقے پنڈی بھٹیاں میں قلعہ کنگراں کے قریب جھونپڑی ڈال کر یادالٰہی میں مصروف ہو گئے۔ عبداللہ بھٹی جو تاریخ برصغیر میں دلا

بھٹی کے نام سے مشہور ہوا' شاہ حسین کا ہم عصر تھا اور دونوں میں قدر مشترک حکومت وقت سے ٹکراؤ ہے۔ اس کا مفصل ذکر بعد میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ زمین جس پر شیخ بہلول دریائی نے ڈیرا ڈالا ابدال احمد نامی زمیندار کی ملکیت تھی۔ شیخ موصوف اس زمیندار کا بے حد احترام کرتے۔ لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ بہلول دریائی اس بنا پر زمیندار کا احترام کرتے ہیں تاکہ وہ مروت میں درویش کی اقامت پر معترض نہ ہو۔ حالانکہ درویش کا قیام ابدال احمد کے لئے باعث صد فخر تھا۔ آخر ایک روز بہلول دریائی نے اس احترام کی وجہ بیان کر دی "ابدال احمد کی پشت سے" برخوردار" نامی ایک ولی کامل پیدا ہو گا' یہ احترام اس ہونے والے ولی اللہ کی وجہ سے ہے نہ کہ زمیندار کی زمین پر قیام کی وجہ سے۔"

شیخ بہلول کی یہ پیش گوئی حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ ابدال احمد کا پوتا حافظ برخوردار ولی وقت ہوا جن کا مزار ضلع جھنگ علاقہ بھوانہ میں آج بھی "مزار میاں بکھا" کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ بہلول جب شاہ حسین کو آستانہ علی ہجویری پر چھوڑ کر لاہور سے رخصت ہوئے تو شاگرد رشید کی عمر بیس بائیس برس کے قریب تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ استادی شاگردی کا رشتہ منقطع ہو گیا بلک اب شاہ حسین کے بیک وقت دو اساتذہ تھے۔ ایک شیخ بہلول اور دوسرے خود حضرت علی ہجویری' لاہور میں شاگرد کی تربیت کے لئے شیخ موصوف نے ایک عظیم الشان مدرسے کی بنیاد بھی رکھی تھی جہاں دیگر طلباء تحصیل علم میں مصروف تھے۔ مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے زمانے مین اس مدرسے کی شہرت بام عروج پر پہنچی۔

تحصیل علم کے لئے عموماً طلبا کو دور دراز کی مسافتیں طے کرنا پڑتی تھیں مگر شاہ حسین کی خوش نصیبی ملاحظہ ہو کہ علم کے دریا سمندر خود اس کے قریب آئے۔ نئی درس گاہ بھی رہائش گاہ کے قریب ہی تھی' ٹکسالی دروازے سے پیر کلی ہوتے ہوئے داتا دربار چند فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ شیخ بہلول کالے کوسوں کا سفر طے کر کے خود لاہور تشریف لائے۔ حافظ ابوبکر بکھوی محلے کی مسجد کے خطیب تھے۔ اس کے علاوہ عہد اکبری میں ایسی ایسی ہستیاں لاہور میں جمع ہوئیں جو اپنی مثال آپ تھیں۔ علم الاخلاق' حساب' فلاحت (کاشتکاری) مساحت ہندسہ نجوم' رمل' تدبیر منزل (پلاننگ) سیاست' منطق طبیعات تاریخ

غرض ہر موضوع کے ماہرین موجود تھے۔ شاہ حسین اور اس کے ہم عصر طلبا کے زیر مطالعہ درج ذیل کتابیں بھی تھیں۔ یہ باقاعدہ نصاب میں تو شامل نہ تھیں مگر اس عہد کے دینی و علمی رجحان کی عکاسی کے لئے ان کا تذکرہ ضروری ہے۔

۱۔ احیاء العلوم ۲۔ نہج البلاغہ۔ ۳۔ مکتوبات مولانا فخر الدین۔ ۴۔ تذکرۃ الاولیا۔ ۵۔ خمسہ نظامی۔ ۶۔ قوت القلوب۔ ۷۔ رسالہ قشیری۔ ۸۔ مرصاد العباد۔ ۹۔ مکتوبات عین القضاۃ۔ ۱۰۔ لوائح از قاضی حمید الدین ناگوری۔ ۱۱۔ تفسیر امام ناصری۔ ۱۲۔ نوادر الاصول (از مولانا علاؤالدین ترمذی)۔ ۱۳۔ روح الارواح۔ ۱۴۔ مقصد الاقصیٰ۔ ۱۵۔ کیمیائے سعادت۔ ۱۶۔ تحفتہ الشباب۔ ۱۷۔ کنزالادب۔ ۱۸۔ تفسیر حقائق۔ ۱۹۔ سیر الملوک۔ ۲۰۔ مکتوبات مولانا فخر الدین۔ ۲۱۔ قدوری۔ ۲۲۔ مجمع البحرین۔ ۲۳۔ اخبار الاثمار اور فقہ معقول۔

ان کتب پر طائرانہ نگاہ دوڑائیں تو احساس ہوتا ہے کہ شاہ حسین علم لدنی ہونے کے باوجود اکتسابی علم کا بھی سمندر تھے۔ عبادت و ریاضت کا یہ حال کہ اکثر بعد از نماز عشاء دریائے راوی پر جا کر ختم قرآن کی سعادت بھی حاصل کرتے۔ یہ گویا خضرؑ سے ملاقات کو خراج تحسین پیش کرنے والی بات تھی۔ اس دور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ایران و توران سے حکمت اور فلسفے کا ایک طوفان اُمڈ کر داخل ہند ہوا۔ توران پر اس زمانے میں عبداللہ خان ازبک کی حکمرانی تھی۔ تورانی مشائخ و علما نے اپنے اثر و رسوخ اور چرب زبانی سے حکمران کو قائل کر لیا کہ علوم فلاسفہ اور منطق، اسلامی علوم کے لئے نقصان دہ ہیں لہٰذا ان کا پڑھنا "حرام" قرار دیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان علوم کے ماہرین اور چاہنے والوں کو ملک بدر کر دیا جائے۔ جانے کیسی بدنصیبی والی گھڑی تھی کہ حاکم وقت بھی ان کی باتوں میں آ گیا اور قاضی ابوالمعالی، ملا مرزا جان اور ملا عصام الدین جیسے فلسفی ملک بدر کر دیئے گئے۔ جنہوں نے ہندوستان میں پناہ لی۔ یہ بات مستند ہے کہ ان نابغہ روزگار قسم کی ہستیوں میں علمی گہرائی کے لحاظ سے شاہ حسین اس زمانے میں بھی سرفہرست تھے۔ دلائل دینے پہ آتے تو مخالف کو لاجواب کر دیتے۔ مشہور تھا کہ شاہ حسین اگر دلائل دینے پر آئیں تو جمادات، نباتات اور حیوانات کی ماہیت بدل دیں۔ یعنی پتھر کو انسان اور ذی روح کو سنگ و خشت ثابت کر دیں۔

لیکن پہلے شاہ حسین کے تیسرے روحانی راہنما سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش

کا مختصر تعارف اور انداز تعلیم سمجھ لیں۔

ابو الحسن علی بن عثمان الجلابی المعروف داتا گنج بخش غزنی کے محلے ہجویر کے رہنے والے تھے اور ۴۳۱ھ میں لاہور تشریف لائے۔ محلّہ ہجویر کی مناسبت سے برصغیر میں علی ہجویری کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ زمانہ سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی کا ہے۔ اہل لاہور اس حقیقت سے ناآشنا تھے کہ نووارد رشد وہدایت کا مینار نور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید موصوف کو لاہوری علماء کی کج بحثیوں سے پالا پڑا۔ آگہی کے دکھ اگر منفرد ہوتے ہیں تو بے خبری اور جہالت کے نقصان بھی ناقابل تلافی ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات تو بے خبری، عذر گناہ کے طور پر قابل قبول نہیں ہوا کرتی۔ ٹھیک ہے خسارے کی شدت کے احساس میں کمی ضرور واقع ہو جاتی ہے مگر خسارہ تو خسارہ ہے۔ سید علی ہجویری سے علمائے لاہور کا پہلا ٹکراؤ اس وقت ہوا جب داتا گنج بخشؒ نے پہلی سجدہ گاہ تعمیر فرمائی۔ دنیا کو مسافر خانہ تصور کرنے والے، پہلی فرصت میں سجدہ گاہ کا اہتمام کرتے ہیں اور بے ریا سجدوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ تاریخی مسجد مزار کے قریب آج بھی موجود ہے بلکہ آج کل تو اس کی شان قابل دید ہے۔ اس مسجد کا محراب، عام مساجد کے مقابلے میں قدرے جنوب کی طرف رخ کئے ہوئے تھا۔ علمائے قیل و قال نے طوفان بپا کر دیا۔ سید علی ہجویری کی شخصیت میں کوئی ایسی انوکھی بات ضرور تھی کہ علما نے کفر کا فتوی صادر فرمانے سے گریز کیا ورنہ "آئے نہ جائے غلیل سے رغبت" قسم کے جاہل مطلق ملا بھی کفر کا فتوی صادر فرمانے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ مسائل استنجا کے ماہرین سید موصوف کے مقام و مرتبے سے قطعاً ناآشنا تھے لہٰذا پہلے وہی معترض ہوئے۔ علی ہجویریؒ جواب جاہلاں باشد خاموشی" کے مصداق خاموش رہے۔ تعمیر مسجد کی تکمیل ہوئی تو سید موصوف کے حقیقی تعارف کی گھڑی سر پر آئی۔ آپ نے اعتراض کرنے والوں کو دعوت نماز دی اور امامت خود کروائی۔ مسائل فقہ کی رو سے عالم کی نماز، بے علم کی اقتدا میں ناقص ہوتی ہے۔ مقام امامت پر فائز ہونے کے لئے چودہ مشہور شرائط میں سے عالم دین سرفہرست ہے۔ بنابریں اس دور کے نمازیوں میں سید علی ہجویری امامت کے لئے موزوں ترین ہستی تھے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے مقتدیوں سے بڑے سنجیدہ لہجے میں خطاب فرمایا "آپ حضرات کو اعتراض تھا کہ اس ناچیز کی تعمیر کردہ مسجد کا قبلہ درست نہیں۔"

"یہ اعتراض تو جوں کا توں موجود ہے" ایک عالم دین نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کو غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔" سید صاحب نی فرمایا۔

"جناب' لاہور میں یہ پہلی مسجد نہیں' کیا آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس شہر میں تعمیر شدہ تمام مساجد کا رخ غلط ہے؟" کسی دوسرے عالم دین نے پہلے کی تائید کی۔

"کیا صحیح ہے اور کیا غلط آپ سب لوگ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمالیں" سید علی ہجویری نے اپنا دست مبارک بلند فرمایا۔ چشم تماشا کے سامنے سارے حجاب اٹھ گئے۔ تمام مقتدی حیران وششدر رہ گئے۔ خانہ کعبہ ان کی سامنے تھا' مسجد کا محراب اور کعبہ ایک ہی سیدھ میں تھے۔ مسجد کا رخ سو فیصد درست تھا۔ اس بات کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تمام مساجد جن کو معیار تصور کر کے علمائے دین نے سید موصوف کی تعمیر مسجد کا رخ غلط ثابت کیا تھا ان کا کیا بنا۔ ظاہر ہے تمام مساجد کا شہید کیا جانا ناممکن تھا۔ اس ساری تفصیل سے قارئین کرام جو نتیجہ چاہیں اخذ کر لیں۔ کعبہ کے مشاہدے والی بات مستند ہے۔ اس تعارف نے اہل لاہور کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ ذکر علی ہجویریؒ مکمل قسط کا متقاضی ہے یہاں صرف اجمالا" تذکرہ ہو گا۔

عام خیال یہی ہے کہ لفظ گنج بخش کی وجہ' خواجہ معین الدین چشتیؒ کی چلہ کشی ہے۔ حضرت خواجہ نے مزار اقدس پر معتکف ہونے کے بعد فیض حاصل کیا تو مشہور زمانہ شعر پڑھا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

اسی وقت سے سید صاحب کا نام گنج بخش مشہور ہو گیا۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ تصوف کے موضوع پر آپ کی دو کتابیں "کشف المحجوب اور کشف الاسرار" نصاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کشف الاسرار میں علی ہجویریؒ رقم طراز ہیں "اے علی! خلقت تجھے گنج بخش کہتی ہے حالانکہ تیرے پاس ایک حبہ بھی نہیں۔ گنج بخشی تو اسی کو سزاوار ہے جو مالک الملک ہے" ظاہر ہے کشف الاسرار حضرت خواجہ کی چلہ کشی سے بہت پہلے معرض وجود میں آئی۔ یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ زندگی ہی میں آپ کا لقب "گنج بخش" زبان زد خاص و عام ہو چکا تھا۔

کشف المحجوب داتا گنج بخش کی وہ کتاب ہے جو تاقیامت علوم باطنی کے لئے مینار نور کا درجہ رکھتی ہے۔ موضوع کی وسعت اور گہرائی کے سبب مصنف کو زندہ جاوید بنا گئی۔ صوفیائے متقدمین و متاخرین اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ صرف ان دو کتب کے مطالعے سے حضرت علی ہجویریؒ کی علمی استعداد روزروشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ ہر دور کے مصنف نے آپ کے متعلق یہ فقرہ ضرور کہا۔ "سید علی ہجویریؒ علوم ظاہری وباطنی کے بحر بے کنار تھے" ملا جامی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب نفحات میں داراشکوہ نے سفینتہ الاولیا میں اور مفتی غلام سرور نے خزینتہ الاصفیا میں کشف المحجوب کو علم کا سمندر قرار دیا ہے مگر خواجہ نظام الدین اولیا دہلوی نے اس کتاب کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اس کتاب کے مقام و مرتبے کی بہترین دلیل ہے۔ خواجہ موصوف فرماتے ہیں۔ "کتب تصوف میں کشف المحجوب کو وہ مرتبہ حاص ہے کہ اگر کسی طالب صادق کو مرشد کامل نہ مل سکے تو اس کتاب کا مطالعہ کرے' اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔ میں نے خود اس کو اول سے آخر تک پڑھا ہے۔"

سید علی ہجویریؒ نے اس کتاب کی غرض و غایت کتاب کے آغاز ہی میں بیان کر دی ہے۔ متن پیش خدمت ہے۔ "علم ظاہر سے مراد معاملات کا علم اور باطن سے مراد نیت کی درستی ہے۔ دونوں میں سے صرف ایک کا حصول نامرادی کی دلیل ہے۔ باطن کے بغیر ظاہر کا علم منافقت ہے اور ظاہر کے بغیر علم باطن' الحاد و زندیقت باطن کے بغیر شریعت ظاہری ناقص رہ جاتی ہے اور ظاہری شریعت کو سمجھے اور اس پر عمل کئے بغیر صرف باطن پر قناعت ہوا و ہوس ہے۔ انبیاء اور اولیا کو بھی علم ہی کے ذریعے معرفت الٰہی کا حصول ہوا۔ کوئی شخص علم کے بغیر وادی عرفان و سلوک میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

اصل میں علم کی تین اقسام ہیں۔ علم من اللہ، علم مع اللہ اور علم باللہ۔ موخر الذکر علم معرفت ہے جس کے ذریعے عرفان حاصل ہوتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام علوم بشمولیت علوم ظاہری و باطنی کی غرض و غایت سادہ الفاظ میں بیان کر دی جائے۔ حرف اول تو عقیدہ ہے۔ اس کا درست ہونا بے حد ضروری ہے۔ اعمال کا فیصلہ نیتوں سے ہوتا ہے۔ عقیدہ درست نہ ہو تو نیت کی درستی ہو ہی نہیں سکتی۔ عقیدے سے مراد یہ ہے کہ بندہ اس کائنات میں ہر شے کا مقام و مرتبہ متعین کرے۔ خالق اور اس کا اپنا

مقام۔ پھر اس کائنات کا مالک و مختار کون ہے اور کاروبار کائنات کس انداز میں رواں دواں ہے۔ عقیدے کا منطقی نتیجہ "عبادت" ہے۔ جب بندہ' صاحب بندہ کے مقام کا تعین کر لیتا ہے تو اپنی حقیر ذات کا ادراک اسے سرنگوں ہو جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہی عبادت ہے اور عبادت کا منطقی نتیجہ ہے۔ "اخلاق" اس سے مراد (سادہ الفاظ میں) بندے کا خالق کی مخلوق سے برتاؤ ہے۔ مخلوق سے انسان کے تعلقات کی نوعیت ہی اخلاق ہے۔ دنیا کے تمام الہامی مذاہب کی تعلیم کا یہی نچوڑ ہے کہ یہ تعلق خوش گوار ہو اور اسی کی تبلیغ سید علی ہجویریؒ نے زبانی' تحریری اور عملی انداز میں کی۔

کشف المحجوب اور کشف الاسرار تو وہ کتب ہیں جن سے عوام الناس بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کے علاوہ سید علی ہجویریؒ کی بلند پایہ کتب میں درج ذیل تخلیقات بھی لاجواب ہیں۔

۱۔ منہاج الدین (اس میں اہل صفہ کی مناقب مرقوم ہیں) ۲۔ کتاب الفنا و البقا۔ ۳۔ اسرار الخرق و المونات۔ ۴۔ کتاب البیان لاہل العیان۔ ۵۔ بحرالقلوب۔ ۶۔ الرعایۃ الحقوق اللہ۔

یہ کتب تقریباً" نایاب ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت داتا گنج بخش شہرت و ناموری سے دور بھاگتے تھے لہٰذا اکثر کتب جب منصہ شہود پر آئیں تو مصنف کا نام ان پر نہیں ہوتا تھا' اہل ہوس اور مطلب پرست نااہلوں کی بن آئی۔ ان میں "مناسب ترمیم" وغیرہ کر کے اپنے نام سے چھپوا لیا اس طرح اکثر کتب گوشہ گمنامی کی نذر ہو گئیں۔ آپ کے اساتذہ میں بلند پایہ برگزیدہ ہستیوں کے نام آتے ہیں۔ مثلاً" حضرت ابوالعباس بن محمود اشقانی جن کے متعلق داتا صاحب "امام یکتا اور طریقت میں یگانہ" کے الفاظ رقم فرماتے ہیں۔ دوسرے شیخ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوزان القشیری جن کا ایک جملہ بقول سید موصوف سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے "صوفی کی مثال برسام کے مریض کی سی ہوتی ہے۔ ابتداء میں اس کی کیفیت ہذیانی مگر آخر میں مکمل خاموشی۔ جب صوفی کو تمکن و رسوخ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ گونگا ہو جاتا ہے۔" شیخ ابو جعفر محمد بن المصباح کو روسائے صوفیہ کا لقب دیتے ہیں۔ شیخ ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ الگرگانی کے متعلق داتا صاحب رقم طراز ہیں "شیخ میری باطنی کیفیت کو ایک نظر میں جان جاتے تھے" لیکن ابوالفضل حسن ختلی سے اپنے تعلق پر سید علی ہجویری نے ہمیشہ ناز کیا۔ حسن ختلیؒ نے طویل عمر پائی۔ آپ صوفیانہ

لباس اور رسوم و قیود سے آزاد تھے۔ موصوف اکثر فرمایا کرتے تھے "الدنیا یوم و لنافیہ صوم" یعنی دنیا ایک روز کی ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں لہٰذا اس کے دام تزویر میں ہرگز نہیں آ سکتے اس کی ایک تشریح یہ بھی ہے کہ ہمارا اس دنیا میں قطعاً کوئی حصہ نہیں۔

داتا گنج بخشؒ نے اپنے اساتذہ کے حوالے سے جو فرمایا اس سے ان کی اپنی ذات بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور خواجہ معین الدین چشتی، بابا فرید الدین گنج شکر سے لے کر شاہ حسین کی مزار پرانوار پر چلہ کشی کا عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ ان صفات کی بنا پر شیخ بہلول دریائی نے شاہ حسین کو سید موصوف کے سپرد کیا۔ اس درس گاہ میں مادھولال حسین نے ریاضت و عبادت کی انتہا کر دی۔ مزار اقدس پر تلاوت و نوافل سے فارغ ہو کر وہ جنگلوں ویرانوں کی راہ لیتے۔ مجاہدے اور مراقبے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جسے شاہ حسین نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اتنی کڑی مشقت کے علاوہ شاہ حسین کا شہر کے علمی مراکز اور علماء سے بھی تعلق قائم رہا جن میں داؤد کرمانی، شیر گڑھی، ابو اسحاق قادری اور شیخ سعد اللہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانے میں شاہ حسین نے اپنا مکتب بھی آراستہ کیا اور گزر اوقات کے لئے اپنا آبائی پیشہ بافندگی بھی اپنایا۔ الغرض دربار علی ہجویری پر علوم ظاہری و باطنی کا عرصہ بارہ برس کے قریب ہے۔ وہ اقوال زریں جنھوں نے شاہ حسین کی تربیت میں اساتذہ کا کام سرانجام دیا، اس بارہ برس کی درس و تدریس کا نچوڑ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے باعث وبال ہے۔

۲۔ علم کو دنیاوی وجاہت کا وسیلہ اور ذریعہ نہ بناؤ، یہ تو معرفت الٰہی کا وسیلہ ہے۔

۳۔ علم کلام اور علم العقائد پر اکتفا کر کے زہد و تقویٰ سے منہ پھیرنے والا زندیق بن جائے گا۔

۴۔ فقیر وہ ہے جو اسباب کے بجائے مسبب الاسباب پر نگاہ رکھے۔

۵۔ بدترین انسان وہ ہے جسے لوگ اللہ والا تصور کریں اور حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ اچھا انسان وہ ہے جسے لوگ اللہ والا خیال کریں اور وہ حقیقت میں بھی ایسا ہی ہو۔ مگر افضل ترین انسان اسے کہتے ہیں جسے لوگ مرد کامل نہ سمجھتے ہوئے طوق رسوائی پہنا دیں لیکن وہ

ولی کامل ہو۔ یہی اخفا ہے جو عشق حقیقی کا سرمایہ ہے۔ (اسی قول کو شاہ حسین نے عملاً" اپنایا)

۶۔ تقاضائے بشریت کی بنا پر انسان تکدر کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ صوفی وہ ہے جو اس دلدل سے بخیر و خوبی گزر کر صفات بشریت پر غالب آجائے اور ان صفات کی نفی کر دے۔

۷۔ صوفی وہ ہے جو اپنے وجود سے نکل کر بقاباالحق ہو جائے یعنی مزاج کی قیود سے آزاد ہو کر حقیقت الحقاق سے مل جائے۔

۸۔ تصوف، مسلسل مجاہدے کا نام ہے اور شان مردانگی یہی ہے کہ صوفی کے پائے استقلال میں لغزش و لرزش نہ آئے۔

۹۔ متاع دنیا میں صوفی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ نہ وہ کسی شے کا مالک ہوتا ہے نہ مملوک۔ ان صفات کی بنا پر اسے خلق سے کامل انقطاع مل جاتا ہے۔

۱۰۔ بارگاہ الٰہی میں مقبولیت کے بعد انسان طریق ملامت اختیار کرتا ہے۔

۱۱۔ ترک شریعت پر ملامت سے بھڑک اٹھنے والے لوگ جھوٹے ہوتے ہیں اور اگر وہ سچے ہوتے تو اظہار مسرت کرتے کہ ان کی دلی مراد پوری ہوئی۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ کی عطا پر خوش ہونے والا صوفی درجہ معرفت پر فائز ہے۔ دنیادار عطا پر خوش اور ابتلا پر ناخوش ہوتا ہے۔ مصیبت میں خوش ہونے والا مجاہد مگر اصطفا پر راضی ہونے والے کا مقام "محبت" ہے۔ (اصطفا بمعنی چناؤ، منتخب کرلینا)

۱۳۔ کرامت صداقت ولایت کی دلیل ہے کاذب سے اس کی کا صدر ہونا محال ہے۔ (ناممکن نہیں)

۱۴۔ معجزے میں اظہار شرط اول ہے جبکہ کرامت میں کتمان۔ (پوشیدہ رکھنا، چھپانا، جیسے من کتم سرہ بلغ مرادہ، جس نے اپنا راز چھپایا بامراد ہوا)

۱۵۔ کرامت کا اظہار ولی کے اختیار میں نہیں ہوتا اس میں رضائے الٰہی کی شمولیت شرط ہے۔

۱۶۔ کافر، فاسق و فاجر سے خرق عادت امور کا اظہار عین ممکن ہے اسے استدراج کہتے ہیں۔

۱۷۔ ازخود، غائب نہ ہو سکنے والا حاضر بحق نہیں ہو سکتا۔

۱۸۔ صرف اور صرف اللہ سے حاجت روائی میں فقر کا وقار اور درویشی کی آبرو ہے۔ اسی سے "توکل" جنم لیتا ہے۔

۱۹۔ مجاہدہ فی الحقیقت علت مشاہدہ ہے۔ (علت بمعنی سبب جیسے تشنگی میں پانی پینا' بھوک لگے تو کھانا کھانا وغیرہ۔ اسی طرح مشاہدے کی حاجت ہو تو مجاہدہ کرو یہی علت ہے)

۲۰۔ افعال میں اسباب دیکھنا عین توحید ہے۔ (جیسے عمر فاروقؓ نے چوری کا ارتکاب کرنے والے بھوکے غلام کو معاف کر دیا کہ سبب معقول تھا)

ان اقوال کی روشنی میں شاہ حسین بارہ برس تک دربار علی ہجویری ر مصرف آہ و فغاں رہے۔ کیسے کیسے مقام آئے اور گزر گئے۔ نالہ نیم شبی' آہ سحرگاہی بظاہر بے اثر ثابت ہو رہے تھے۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ شاہ حسین کندن بن رہے تھے۔

سرخ رو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

اسی دور میں شاہ حسین نے کہا۔

عاشق ہوویں تاں عشق کماویں
راہ عشق دا سوئی دانکا' دھاگا ہوویں تاں ای جاویں
باہر پاک اندر آلودہ' کانہوں ایویں شیخ کہاویں
کہے حسین جے فارغ تھیویں' تاں تدخاص مراتبہ پاویں

(عشق حقیقی کا تقاضا ہے کہ اسے خون جگر سے کمایا جائے' عشق تو سوئی کا ناکہ ہے جس میں سے دھاگا بن کر گزرنا پڑتا ہے۔ تم باہر سے پاک مگر اندر سے ناپاک ہو اس پر شیخ کہلانا' مناسب نہیں۔ اندر کی کدورتوں سے فراغت حاصل کر لو تو مقام مل سکتا ہے)

سچے عاشق تو دل آوارہ تک کو سینے سے منفی کر دیتے ہیں اگر اس میں کدورتیں جنم لینے لگیں۔

بقول اقبال ساجد مرحوم۔

کل شب دل آوارہ کو سینے سے نکالا
یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا

شاہ حسین کی آہ و زاریاں رنگ لائیں اک عمر کی محنت کا ثمر ملنے کی گھڑی نے در پر آ

دستک دی۔ رمضان المبارک کا مہینہ اور جمعتہ المبارک کا دن تھا۔ شاہ حسین کے اضطراب نے زیرزمین سونے والے کو بھی بے چین کر دیا۔ جذبہ صادق نے الفاظ کا پیرہن زیب تن کیا تو پائے عرش ہل گیا۔ "حقیقت الفقرا" میں مرقوم ہے کہ علی ہجویری کی آخری آرام گاہ سے ایک پیکر نور ہویدا ہوا جیسے چاند چہرہ ابرپاروں کی نقاب سے جھانکنے لگے، جیسے قندیل میں شمع جھلملانے لگے۔ شاہ حسین نے عالم مدہوشی میں سرنیاز خم کر دیا اور اتنا خم کہ پیکر نور کے قدموں پر لب رکھ دیئے۔ یہ بوسہ وارفتگی تھا۔ حواس اعتدال پر آئے تو لرزتے لبوں نے حرف مدعا بیان کرنے کی جسارت کی۔ حضور! آپ؟ ہاں فرزند، میں فنا و بقا کی مجسم تفسیر ہوں، مجھے ہی علی ہجویری کہتے ہیں۔ پیکر نور لب کشا ہوا۔ تیری بارہ برس کی ریاضت رنگ لائی، آج تو مقام ولایت پر فائز ہوا، سارے خوف سارے حزن دور ہوئے۔ یہ کہہ کر پیکر نور نے شاہ حسین کی پیٹھ پر تھپکی دی اور پیکر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ جس چراغ کا اہتمام ابوبکر بگھوی لیکیا اس میں تیل اور باقی شیخ بہلول دریائی کی جانب سے مہیا کئے گئے اور روشن کرنے والی ہستی علی ہجویری" کی تھی۔ یہ سعادت بزور بازو نہیں جذبہ صادق کی فراوانی سے حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ مشیت ایزدی کھل کر ساتھ دے۔

شاہ حسین نے گوہر مقصود کے حصول کے بعد بھی اپنے معمولات ترک نہیں کئے اور نہ اپنی ولایت کا ڈھنڈورا پیٹا بلکہ وسعت ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے چپ سادھ لی۔

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش رہا

وہی تلاوت کا شوق تھا وہی نوافل کی فراوانی، درود و وظائف کے مراحل سے بھی شاہ حسین حسب سابق گزرتے رہے۔ حد یہ ہے کہ اس عہد کے علما سے بھی حسب عادت فیض حاصل کرتے رہے۔ ایک سال مزید بیت گیا، شاہ حسین نے عمر عزیز کے ۳۶ ویں برس میں قدم رکھا تو حشر بپا ہو گیا مگر اس اجمال کی تفصیل سے پیشتر شاہ حسین کے ایک اور استاد کا ذکر بے حد ضروری ہی جس کے درس کے دوران یہ حشر بپا ہوا۔ دنیا اس ہستی کو شیخ سعد اللہ استاد ملامت کے نام سے یاد کرتی ہے۔

شیخ سعد اللہ کا اس دور میں طوطی بول رہا تھا اس لئے کہ وہ علم کا سمندر، عظیم الشان

مکتب کے سربراہ ہونے کے علاوہ راہ سلوک کے مستند شناور تھے۔ ان کو مسلک ملامتیہ کا استاد کہا جاتا تھا تو کچھ یونہی نہیں کہا جاتا تھا۔ مسلک ملامت کا خلاصہ یہی ہے کہ سالک اپنے زہد و تقویٰ اور مقام و مرتبے کی پردہ پوشی کرے اور اسی کوشش میں ایسی حرکات کا ارتکاب کرے کہ گرفتار معصیت دکھائی دے۔ مثلاً" جام و مینا میں پاکیزہ مشروب پینا جو دور سے شراب دکھائی دے۔ خوش گوار چہروں کی چاہت کا دم بھرنا جسے دنیا "آوارگی" تصور کرے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہو۔ سالک کا ہر پل‘ ہر لمحہ یاد اللہ میں گزر رہا ہو جیسے "ہتھ کار ول‘ دل یار ول" ہاتھ کام کاج میں مصروف ہوں دل یار کی طرف متوجہ ہو۔ لوگ اس مسلک کو آج تک ہضم نہیں کر پائے کیونکہ چشم تماشا کو جھٹلانا کوئی معمولی بات نہیں۔ جو کچھ آنکھ دیکھتی ہے اسی کے مطابق عدالت دماغ فیصلے صادر فرماتی ہے۔ آنکھ کی شہادت کتنی معتبر ہے؟ یہ الگ موضوع ہے اس کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔ اس سے بہرحال انکار کی گنجائش نہیں کہ یہ شہادت یہ گواہی بڑی غیر معمولی ہے لیکن اسے حرف آخر سمجھ لینا بھی نادانی ہے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

اور یہی فریب نظر بندے کو اکثر لے ڈوبتا ہے۔ شیخ سعد اللہ ۹۲۱ ھ میں ملتان کے "قلندر خیز" خطے میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اپنے والد ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی کی حلقہ بگوشی اختیار کی۔ یہ وابستگی مختصر ثابت ہوئی۔ ۹۳۲ ھ میں ابراہیم فقیر بے ریا نے سفر آخرت اختیار کیا تو تشنہ لب سعد اللہ نے لاہور آکر شیخ عبدالرحمٰن بن عزیز اللہ کے حلقہ تدریس میں شمولیت اختیار کی۔ جو کچھ لوح محفوظ پر مرقوم تھا حاصل کیا پھر بایزید دیپالپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور سند فضیلت حاصل کرنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ سلوک کی منازل طے کرنے کے لئے اسی زمانے میں شیخ حسین کاکوؒ کے حلقہ ارادت میں آئے۔ یہ عالم اور ہی رنگ ڈھنگ کا تھا یوں بھی ہوتا کہ شیخ سعد اللہ درس دے رہے ہوتے تو حالت جذب و سرور طاری ہو جاتی اسی مدہوشی میں کھانا پینا ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا‘ نمازیں فوت ہو جاتیں۔ حالت سحو میں واپسی ہوتی تو خادم سے قضا شدہ نمازوں کا حساب ہوتا‘ سارا حساب بے باق کر کے پھر از

سر نو درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے۔ جب زندان دنیا سے جی زیادہ اچاٹ ہوتا تو قبرستان کا رخ کرتے اور کسی ٹوٹی پھوٹی ویران قبر میں چادر تان کر جا لیٹتے۔

ایک زمانے میں دین الٰہی کی "پخ" سے پہلے مغل شہنشاہ اکبر نے اجتہاد کا دعویٰ کیا تھا۔ سامان دنیا سے زہد و تقویٰ کو آراستہ کرنا غنیمت ہے مگر زہد و تقویٰ سے دنیا سنوارنا پرلے درجے کی جہالت ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ زہد و تقویٰ ہی وہ مقام ہے جو خلق خدا کے دلوں پر حکمرانی کراتا ہے اور لوگ دنیاوی بادشاہت یعنی اجسام پر حکمرانی کے ساتھ دلوں پر بھی حکمرانی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ بنابریں اکبر جیسے حماقت ماب شہنشاہ' عجیب و غیب حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کبھی مجتہد بنے کبھی خلیفہ اور کبھی خدا لیکن یہ دام تزویر دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔ اکبر کے دین الٰہی کی مثال ہمارے سامنے ہے جو مشت خاک کے زیر زمیں جاتے ہی اپنی موت آپ مرگیا خیر! مغل شہنشاہ نے اجتہاد کا دعویٰ کیا۔ علمائے سو نے اس دعوے کی تائید کی اور اپنی دنیا سنوار کر عاقبت خراب کرلی۔ حاکم وقت نے شیخ سعد اللہ کو بھی "گفت و شنید" کے لئے طلب فرمایا۔ مرد قلندر عجیب سج دھج سے دربار میں حاضر ہوا۔ گدڑی پوش پالکی میں سوار ہوا جو شہنشاہ سے طلب کی گئی تھی۔ مقصود یہ جتلانا تھا کہ تم جسموں پر حکمرانی کرتے ہو تو ہم دلوں پر' شوق ملاقات ہے تو جیسا ہم کہتے ہیں ویسا ہے کرو ورنہ تم تخت پر خوش ہم تختے پر۔

مغل شہنشاہ شیخ کو دیکھتے ہی احترام پر مجبور ہو گیا۔ گفتگو کا آغاز ہوا تو حاکم وقت نے پوچھا "یا شیخ! بندہ "واصل بالحق" کیسے ہوتا ہے؟"

"جیسے یہ حقیر پر تقصیر بندہ دربار اکبری تک پہنچا" شیخ سعد اللہ نے معقول جواب دیا جو نامعقول بادشاہ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"یا شیخ! جواب الجھا ہوا ہے۔ کچھ وضاحت فرمائیں" اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے نے اپنی جہالت کا اعتراف کیا۔

"دربار شاہی اور ایک عام بندے کے درمیان طبقہ امرا حائل ہے" شیخ نے وضاحت پیش کی۔ "یہ دربار تک حاضری کا وسیلہ ہے۔ میں نے خود ماضی بعید میں دربار تک رسائی کی کوشش کی تھی مگر کوئی وسیلہ کام نہ آیا۔ آج خود حاکم نے مجھے طلب کیا تو سارے وسیلے درمیان سے ہٹ گئے اسی طرح انسان لاکھ کوشش کرے حیلے وسیلے اپنائے جب تک قادر

مطلق کی رضا نہ ہو اس تک رسائی ممکن نہیں "واصل بالحق" ہونے کے لئے رضائے حق سرفہرست ہے۔ وسیلوں کی مثال ان پالکی بردار لوگوں کی سی ہے۔ ظاہر ہے یہ لوگ حاکم وقت کی رضا کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے تھے حالانکہ امرا کا درجہ ان سے بلند ہے مگر حاکم کی رضا شامل ہوئی تو یہ چھوٹے لوگ بڑے بن گئے" بات کی وضاحت ہوئی تو مدعی اجتہاد حیران رہ گیا۔

"یا شیخ! کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیں" اکبر نے ایک اور جال پھینکا۔

"آئندہ مجھ فقیر کو ملاقات کی زحمت نہ دی جائے" درویش نے ملاقات شاہ کی حقیقت واضح کر دی۔ اکبر نے اجتہاد کے دعوے کی تائید کے لئے بلایا تھا' وہ بات ان کہی ہی رہ گئی اور شیخ سعد اللہ کو عزت و احترام سے رخصت کر دیا گیا۔ فقیر رخصت ہوا تو مزاج شاہی کی آشنائی کا دعویٰ کرنے والے سگ دنیا نے شاہ کو اکسانے کی کوشش کی یہی کہ وہ ظل سبحانی ہے اور سارے ولی' غوث' قطب اسی سائے تلے ہونے چاہئیں وغیرہ وغیرہ مگر شہنشاہ اکبر کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔ وہ شیخ کی ملاقات کے ایک ایک پل پر غور کر رہا تھا۔ آخر وہ لب کشا ہوا "اس مرد کامل سے سلف صالحین کی مہک آتی ہے۔"

یوں تو شیخ موصوف کی عمر عزیز درس و تدریس میں بسر ہوئی مگر آخری عمر میں ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آیا۔ شیخ ایک مطربہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے۔ درس و تدریس' قصہ پارینہ ہوئے۔ شیخ نے رندی اختیار کی تو سارے لاہور میں گویا زلزلہ آ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مشاہدہ حق کی گفتگو کے لئے بھی ساغر و مینا' شراب و کباب کی اصطلاحیں استعمال کرنا پڑتی ہیں مگر مسلک ملامت اور معصیت کے درمیان ایک مہین سا پردہ حائل ہوتا ہے اور اسے حائل رہنا چاہیے۔ اسی پردے کی آڑ میں دکاندار قسم کے پیر فقیر سادہ لوح انسانوں کو لوٹ لے جاتے ہیں مگر کیا کیا جائے اس مہین سے پردے کی پہچان کے لئے بھی تو دیکھنے والی بلکہ دیکھ سکنے والی آنکھ درکار ہے۔ شیخ موصوف کے سلسلے میں واقعی سچ ثابت ہوا کہ؎

روک سکتی نہیں تقوی سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

شیخ سعد اللہ کے شاگردان رشید' بے چین تھے' پل بھر میں کیا سے کیا ہو گیا۔ آخر

طلباء نے مل کر فیصلہ کیا کہ کوتوال شہر کی مدد سے اپنے استاد کو مطربہ کے چنگل سے نجات دلائی جائے چناں چہ ایک روز جب شیخ اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک مکان میں محو ناؤنوش تھے تو طلباء کی کثیر تعداد محتسب کے ہمراہ دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئی۔ آلات غنا اور سامان مے نوشی توڑ پھوڑ دیئے گئے۔ مطربہ کی درگت بنی۔ محتسب شیخ کو گرفتار کرنے لگا تو اس نے مسکرا کر کہا "میں نے ایک غیر شرعی فعل کا ارتکاب کیا ہے تو تم لوگ دہرے گناہ کے مرتکب ہوئے ہو۔ اول تم لوگوں نے تجسّس سے کام لیا جس کی شریعت میں ممانعت ہے دوم تم لوگ بغیر اجازت لئے مکان میں گھس آئے ہو لہٰذا میری نسبت سزا کے زیادہ مستحق ہو۔"

معلوم ہوتا ہے اس دور میں واقعی شریعت کی بالادستی قائم تھی۔ محتسب اور طلباء کی بپھری ہوئی جماعت شرمسار ہو کر لوٹ گئی مگر اتنا ضرور ہوا کہ شیخ کو دعوت فکر دے گئی۔ فقیر کی اصل نیک تھی لہٰذا توبہ کی توفیق شامل حال ہوئی اور وہ طوائف زادی کی زنجیریں توڑ کر اپنے "پیئے" کی طرف لوٹ آئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ بحال ہوا، شاگردوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

شیخ سعد اللہ سخی دل انسان تھے۔ معاش کے ظاہری اسباب نہ ہونے کے باوجود سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے۔ حلقہ تدریس م شاہ حسین کے علاوہ شیخ منور لاہوری تھے جنہوں نے اکبر کے حکم سے مجمع البلدان کا فارسی ترجمہ کی اور دین الٰہی سے اختلاف کے باعث پابند سلاسل ہوئے اور قلعہ گوالیار میں پس زندان ۱۰۱۱ھ میں راہی ملک عدم بقا ہوئے یعنی شاہ حسین کی وفات کے تین برس بعد۔ ان کے علاوہ شیخ سعد اللہ کے شاگردان رشید میں ملا عبدالسلام لاہوری، شیخ منصور لاہوری اور حضرت میاں میرؒ آسمان تصوف کے آفتاب و مہتاب بھی شامل تھے۔ یہی وہ دور ہے جب شاہ حسین نے آیات قرآنی کی انوکھے انداز میں تشریح کی اور وہ انداز چونکہ عام ڈگر سے ہٹ کر تھا لہٰذا لوگ اسے ہضم نہ کر سکے۔ ایک بار حلقہ درس میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ نمازیں عبراللہ کا تصور جائز ہے یا نہیں۔ سب کا یہی خیال تھا کہ تصور غیر اللہ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے مگر شاہ حسین نے کہا "یہ بات گنوار عورتوں کو مبارک ہو" سب لوگ حیران رہ گئے اور علماء میں بحث و تمحیص جاری ہو گئی۔ بظاہر یہی درست نظر آتا ہے کہ نماز میں ماسوا یعنی اللہ کے سوا کسی

دوسرے کا خیال آتے ہی نماز ناقص ہو جانی چاہئے۔ مگر خشوع و خصوع کا جو مفہوم شاہ حسین نے بیان کیا اس سے سارے علماء لاجواب ہو گئے۔ "نماز حق تعالیٰ سے مکالمت ہے" شاہ حسین نے کہا "اور گفتگو سوچ سمجھ کر نہ کی جائے تو وہ یا وہ گوئی کے زمرے میں آتی ہے۔ جو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں اس کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ یہی افضل ترین نماز ہے۔ تلاوت میں جس چیز کا ذکر ہو گا، وہ احاطہ ادراک میں ضرور آئے گی۔ الایہ کہ قاری بصیرت سے بالکل کورا ہو، اگر تلاوت میں مردہ، خون اور خنزیر کے گوشت کی حرمت کا ذکر آئے گا تو صاحب بصیرت کے ذہن میں ان کا تصور بھی اجاگر ہو گا۔ دیہات کی گنوار خواتین البتہ اپنی بے بصیرتی کے باعث اس سے مستثنیٰ قرار دی جاسکتی ہیں۔ لیکن علماء سے اس چیز کی توقع کرنا کہ وہ زبان سے ادا کئے جانے والے الفاظ کا مفہوم قوت مدرکہ میں ابھرنے نہ دیں، ناممکنات میں سی ہے لہٰذا نماز میں غیر اللہ کا تصور جائز ہے بلکہ نماز کی صحت کا ضامن، نماز صرف خیالات کی آوارگی سے فاسد ہوتی ہے وہ بھی اس حد تک کہ خشوع و خضوع مجروح ہو جاتا ہے۔ بندے کا کام حتی المقدور کوشش کرنا ہے، کامیابی کے اسباب حق تعالیٰ فراہم کرتا ہے۔"

بات چونکہ معقول تھی لہٰذا علما کو ماننا پڑی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شاہ حسین کی علمی فضیلت کا ہر شخص معترف تھا بلکہ اساتذہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ افق درس و تدریس پر آفتاب عالمتاب طلوع ہو گا جو اپنی علمی موشگافیوں اور ضیا پاشیوں سے جہالت کے اندھیروں کو مٹا دے گا۔

جہالت کی شب بکھر جائے گی اور علم و آگہی کی سحر طلوع ہو گی۔

ہے افق سے ایک سنگ آفتاب آنے کی دیر
ٹوٹ کر مانند آئینہ بکھر جائے گی رات

مگر سب کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ سارے خواب بکھر گئے انہونی ہو کر رہی۔ سارا زمانہ شاہ حسین کی علمی فضیلت کا معترف تھا۔ وہ مقام ولایت پر بھی فائز ہو چکے تھے۔ یہ الگ بات کہ اس کا اعلان نہیں کیا گیا تھا مگر جاننے والے ان کے مقام و مرتبے سے آگاہ تھے۔ شیخ سعد اللہ استاد ملامت کا درس جاری تھا۔ شاگردان رشید علمی موشگافیوں پہ عش عش کر رہے تھے۔ یہ درس "تفسیر مدارک" میں سے دیا جا رہا تھا۔ زیر تشریح قرآنی آیات

مبارک تھی وما ھذہ الحیواۃ الدنیا اِلالھو ولعب" (نہیں ہے یہ حیات دنیا مگر کھیل تماشا) جو تشریح استاد مکرم نے پیش کی س کا متن تھا کہ دنیاوی زندگی کی حیثیت کھیل تماشے سے زیادہ نہیں اور اسے سنجیدگی سے نہیں لینا چاہئے یعنی اس میں دل لگا کر اسی کا نیں ہو جانا چاہئے مگر شاہ حسین کی زندگی اندر سے زیروزبر ہو گئی۔ اس نے وہ مطلب اخذ کیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ سینے میں ایسا تند طوفان اٹھ کھڑا ہوا کہ گردوپیش کا ہوش نہ رہا "استاد مکرم' آپ کو خبر ہے ذات حق کا اشارہ کس طرف ہے؟" شاہ حسین نے عجیب و غریب لہجے میں کہا۔ "حیات دنیا کھیل تماشا ہے یہی اس کا فرمان ہے اور ہمیں اس کھیل تماشے سے جی بھر کے لطف اندوز ہونا چاہئے۔ بحث کا آغاز ہو گیا۔ شاہ حسین نے سارا احترام لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں دلائل کا انبار لگا دیا۔ سب سے بڑی دلیل یہی تھی "فرمان الٰہی پر بغیر چون و چرا عمل پیرا ہونا چاہئے۔ ادراک و احساسات کی زنجیروں سے آزاد ہو کر بندے کے لئے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں' اس کا فیصلہ صاحب بندہ کو کرنا ہے یا وہ بہتر سمجھ سکتا ہے مزید یہ کہ اس کھیل تماشے اور رامش ورنگ کی تشریح بندے کو اپنے عمل سے پیش کرنی چاہئے۔"

شاہ حسین کا مفہوم جب حاضرین پر آشکار ہوا تو سب حیران و ششدر رہ گئے۔ اس مفہوم کو ہضم کرنے کے لئے جس جرأت رندانہ کی ضرورت تھی وہ کسی میں نہ تھی۔ اس وقت شاہ حیسن عمر عزیز کے ۳۷ویں برس میں قدم رکھ چکے تھے۔ یہ واقعہ ۹۸۱ھ میں پیش آیا۔ اس وقت چراغ ولایت کو روشن ہوئے ایک یا ڈیڑھ برس کا عرصہ بیت چکا تھا۔ سینہ انوار الٰہی سے روشن ہو چکا تھا مگر دنیاوی چشم تماشا اس سے بے خبر تھی۔ حشر اس وقت بپا ہوا جب شاہ حسین دوران درس ہی اٹھ کر رقص فرمانے لگے اور اس سج دھج سے ناچتے گاتے درس گاہ سے باہر نکل گئے' اسی پر ہی بس نہ کی بلکہ تفسیر مدارک جو سر پر اٹھا رکھی تھی وہ اس درس گاہ کے کنوئیں میں پھینک دی۔ شیخ سعد اللہ اور دیگر شاگردان رشید یہ دیکھ کر کف افسوس ملنے لگے۔ جوشیلے ہم مکتب حضرات نے اسے بے ادبی گردانتے ہوئے "رقاص" کو نرغے میں لے لیا۔ شاہ حسین نے مخمور آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا "کیا چاہتے ہو؟ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے' مجھے "یار" کا کہا ماننے دو۔"

"تفسیر مدارک کو کنوئیں میں پھینک کر آپ نے بے ادبی کا ارتکاب کیا ہے" سب نے بیک زبان کہا "آپ پر خدا کا قہر نازل ہو گا۔"

"تم لوگ ناسمجھ ہو، ہم تو ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں، میرا محبوب مجھے کیسے گزند پہنچا سکتا ہے" یہ عشق میں ڈوبے ہوئے کلمات، سامعین کے سر پر سے گزر گئے۔ کوئی ایک بھی الفاظ کی گہرائی تک نہ پہنچ پایا۔ سب بضد تھے کہ "تفسیر مدارک" کو کنوئیں میں پھینک کر شاہ حسین بی ادبی کا مرتکب ہوا ہے۔ آخر شاہ حسین کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا "ہم اپنے ساجن کے نام کی بے ادبی کیسے کر سکتے ہیں وہ تو ہمارے روئیں روئیں اور رگ رگ میں رقص کر رہا ہے" یہ کہا اور کنوئیں کی منڈیر پر کھڑے ہو گئے پھر چشم تماشا نے عجیب و غریب منظر دیکھا۔ شاہ حسین نے ہاتھ بڑھایا اور کتاب یعنی تفسیر مدارک تہ آب سے اچھل کر باہر آ گئی۔ دست شاہ میں کتاب تھی مگر اس کا ورق ورق خشک تھا، پانی کی ایک بوند تک اسے چھونے نہ پائی تھی۔ شاہ حسین نے بڑے احترام سے کتاب ہم مکتبوں کے حوالے کی "اب ہم کتابوں کی منزل سے بہت دور جا چکے ہیں" یہ کہا اور رقص کرتے ہوئے درس گاہ سے نکل گئے۔ لوگ حیران و ششدر دیکھتے رہ گئے۔ اب زندگی کے اس دور کا آغاز ہوا جسے لوگوں نے رندی و مستی کا دور کہا۔

لاہوری علما کے ہاں گویا زلزلہ آ گیا کیوں کہ شاہ حسین نے ڈاڑھی منڈوا دی، بھویں تک صاف کرا دیں۔ سرخ کپڑے زیب تن کئے اور لاہور کے کوچہ و بازار میں سرعام جام و مینا تھامے رقص و نغمہ سے تہلکہ مچا دیا۔ تماشائی ساری دنیا تھی، کوئی توبہ استغفار کرتا۔ کوئی کانوں کو ہاتھ لگاتا، کوئی کف افسوس مل کر کہتا "سچے عالم دین بلکہ علم کے سمندر کو ابلیس اغوا کر کے لے گیا" کوئی کہتا "ذات کا جولاہا تھا نا، تنگ ظرف ثابت ہوا اور علم دین کو غرق مے کر کے علما کے نام پر دھبا لگا دیا" مگر شاہ حسین اپنے حال میں مست اعلانیہ نغمات عیش و طرب گا گا کر لوگوں سے ملامتیں وصول کرتے رہے۔ دور آغاز کے اشعار پیش خدمت کرنے سے پیشتر عرض ہے کہ کلام شاہ حسین ان کی وفات کے تقریباً تین صدی بعد منصنہ شہود پر آیا۔ وہ اشعار جو بحر سے خارج نظر آتے ہیں ان کے متعلق ہی کہا جا سکتا ہے کہ مستی و مدہوشی کے دوران تخلیق کئے گئے دوسرے ان کی زبان بھی آج کی مروجہ سرائیکی یا پنجابی کے کسی لہجے میں نہیں۔ بعض الفاظ تو متروک یا بے حد قدیم ہیں۔

بہرحال جو کلام اس وقت شاہ حسین کے نام سے موجود ہے وہ حاضر خدمت ہے۔

ہسن کھیڈن بھا اسانوں' دتا جی رب آپ اسانوں
اک روندے روندے رہ گئے اک ہس رس لے گئے گوئے میدانوں
چھوڑ تکبر پکڑ حلیمی کیہ ویٹو اس خودی گمانوں
کہے حسین فقیر سائیں دا صحیح سلامت چلے جہانوں

(ہم پر ہنسا کھیلنا اللہ تعالیٰ نے خود فرض کر دیا۔ کچھ لوگ بسورتے رہ گئے اور کچھ ہنستے کھیلتے میدان سے گیند لے گئے (سرائیکی مں گوئے بمعنی گیند) تکبر چھوڑ کر حلیمی اپنا لے غرور اور اکڑ سے کیا حاصل ہو گا' اللہ کا فقیر حسین کہتا ہے ہم (اس کے احکام کی پابندی کر کے) جہان سے سلامتی کے ساتھ رخصت ہوئے)

نی مائے' مینوں کھیڈن دے میرا وت کھیڈن کون آسی
نشوہ گن ونتا بیا روپ چنگیرا انگ لائے کہ مول نہ لاسی

(اے ماں ہمیں کھیلنے دے (کیوں کہ یہ زندگی کھیل تماشا ہے) میرا کون اس جہان میں پھر کھیلنے آئے گا۔ میرے ساجن سائیں میں ہزار گن ہیں اور اس کا حسن بھی بلندپایہ ہے' مجھے کیا خبر کہ وہ مجھ پر مہربان بھی ہو گا کہ نہیں)

درگاہ وچ سہاگن سواری
جو کُھل کُھل نچ کھلوئی

(جو کھل کر ناچے گی وہی اس کے گھر کی سہاگن ٹھہرے گی)

اسی انداز کا ایک اور شعر پیش خدمت ہے۔

اساں اندر باہر لال اے' اسا مرشد نالے پیار اے
اساں رل مل جھرمٹ پاونا' اسا ایہو ونج وپار اے

(چوں کہ ہمیں ساجن سے سچا پیار ہو گیا ہے لہٰذا کیف و سرور سے ہمارا رنگ اندر باہر سے سرخ ہو چکا ہے' مل جل کر رقص کرنا ہی ہمارا کاروبار حیات ٹھہرا)

شاہ حسین کی شاعری کے متعلق عرض ہے کہ صوفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے "کافی" مناسب ترین صنف سخن ہے' اس میں ترک دنیا کا درس اور ذات باری تعالیٰ سے عشق کا جو انداز ہے اس کا اپنا الگ سرور ہے۔ شاہ حسین پہلے صوفی شاعر ہیں جنھوں نے

اس صنف سخن کو اپنایا اور اپنے کلام کی بنیاد راگ راگنیوں پر اس طرح استوار کی کہ سوز و گداز کی انتہا نہ رہی۔ جوگ، بہاگ، بھیروی، اساوری ان دھنوں پر کافیوں کو الفاظ کا پیرہن زیب تن کرایا گیا۔ زمانہ گواہ ہے کہ موسیقی کے یہ رنگ جذبات کے تاروں کو چھیڑنے میں لاجواب ہوتے ہیں کل کافیوں کی تعداد ۱۳۹ ہے۔ ان میں چاہت میں وفا، الفت کی مجبوریوں اور ہجر کی کلفتوں کو من موہنے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پیکر خاک کو "چرخے" اور "کاتنے" کو اعمال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کھیل تماشے سے مراد ریاضت و مجاہدے کی مستی اور کیف و سرور ہے۔ کافیوں کی زبان میں سرائیکی، سندھی، لہندی، پنجابی کے مختلف لہجے ہیں۔ (لہندی پنجابی اور ہندی کا ایک لہجہ ہے) ان "کافیوں" کی خاصیات یہ ہے کہ ہندی اور سندھی مزاج کے عین مطابق شاہ حسین نے اپنے آپ کو ہیر، بیوی یا محبوبہ تسلیم کیا ہے اور خالق کائنات کو کنت، رانجھن، شوہ اور ساجن کے نام سے یاد کیا ہے۔

اب پیش خدمت ہے مختلف ادوار کا منتخب کلام۔

گل ووکیتی خیال پئی گل وو نباہی لوڑیئے
شمع دے پروانے وانگوں جلایاں انگ نہ موڑیئے
ہاتھی عشق مہاوت رانجھا آنکس دے دے ہوڑیئے
کہے حسین فقیر سائیں دا لگڑی پریت نہ توڑیئے

(دل کی گہرائی سے سنجیدہ لہجے میں بات کر کے اسے نبھانا چاہئے، جیسے شمع پر فدا ہوتے وقت پروانہ پیچھے نہیں ہٹتا، عشق فیل بے زنجیر کی طرح ہوتا ہے مگر اس کا مہاوت رانجھا ہے جو انکس مار مار کر اسے راہ راست پر لے آتا ہے، حسین اللہ کا درویش یہی نصیحت کرتا ہے کہ پریم کا بندھن توڑنا نہیں چاہئے)

اپنی بے سروسامانی اور نیک اعمال کی کمی کا اظہار بڑے دلکش انداز میں اس طرح کیا ہے۔

چھلڑیاں پنج پائے پروٹے جائے بجار کھلونوں کیوں
نال صرافاں جھیڑا تیرا لیکھا ویندی رونویں کیوں

(پانچ عدد پنڈیاں "سوت کی چھلی" اپنی ٹوکری میں ڈال کر بازار جا کھڑی ہوئی، تیری تجارت

تو صرافوں سے ہے (جو سونے چاندی کا بیوپار کرتے ہیں) اب حساب کتاب کا وقت آیا ہے تو کیوں گھبرا رہی ہے)

ساجن کی بے نیازی اور اپنی مجبوریوں، ہجرہ و فراق کی کیفیت کا اظہار کچھ اس طرح ہوا۔ غالب نے اس کیفیت کو بہت بعد میں الفاظ کا لبادہ اوڑھایا یعنی۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

اس سے ملتی جلتی کیفیت کو شاہ حسین نے اپنے انداز میں پیش کیا۔

قاضی ملاں متیں دیندے کھرے سیانے راہ وسیندے
عشق کیہ لگے راہ نال۔ من اٹکیا بے پرواہ نال
ندیوں پار رانجھن دا ٹھاناں کیتا قول ضروری جانا
منتاں کراں ملاح نال من اٹکیا بے پرواہ نال

(قاضی وغیرہ نصیحتیں کرنے آ جاتے ہیں عقلمند، دوستی کے ناتے راہ راست دکھانے آ جاتے ہیں مگر ہمارے عشق کو سیدھے ٹیڑھے راستوں سے کا مطلب ہماری آنکھ تو بے نیاز سے لگ چکی ہے۔ ہمارا ساجن ندیا کے پار رہتا ہے اور ہم ملن کا ”قول و قرار“ کر چکے ہیں۔ لہذا ملاح کی منت سماجت کر رہے ہیں کیوں کہ ایک تو ساجن کو ہماری پروا نہیں دوسرے ملنے کا وعدہ پورا نہ کیا جانے کیا ہو جائے)

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے کہ ہم نے جنات اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لئے تخلیق کیا ہے۔ اسی مفہوم کو شاہ حسین نے اس انداز میں بیان کیا ہے۔

بندہ بنایا جاپ کوں توں کیا لبھانا پاپ کوں
تیں سہی کیا، کیا آپ کوں
اک شاہ حسین فقیر اے، تیس نہ کہو کوئی پیر
جگ چلتا ویکھ وہیر اے

(انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کے نام کی مالا جپتا رہے مگر تو نے گناہوں کو اپنا لیا، تو نے اپنے آپ کو کیا سمجھ لیا، شاہ حسین تو ایک بے سرو سامان بندہ ہے لوگ اسے پیرو مرشد مان رہے ہیں یہ دنیا بھی بس لکیر کی فقیر ہے۔ (وہیر قدیم سرائیکی بمعنی لکیر)

دنیا کی بے ثباتی اور سفر آخرت کی تلقین کا انداز ملاحظہ ہو۔

سدا نہ پھلے توریا سدا نہ لگے ساون
ایہہ جوبن ہے چار دیہاڑے کا ہے کو جھوٹ کماون
وت نہ دنیا آون
پیو' کڑے دن چار دیہاڑے البت ساہرڑے جاون
شاہ حسین فقیر سائیں دا جنگل جائے سماون
وت نہ دنیا آون

(سرسوں ہمیشہ نہیں پھولتی اور نہ رم جھم برست رہتی ہے' تمہارا رنگ روپ بھی عارضی ہے جب دنیا میں واپس نہیں آنا (اعمال کی درستی کے لئے) تو معصیت کیوں اختیار کرتا ہے۔

۱۔ سسرال

۲۔ اے لڑکی میکے مں قیام چند روز کا ہے آخر سسرال جانا پڑے گا۔ شاہ حسین فقیر کو رونق دنیا سے کیا غرض وہ جنگل میں بھی بسرام کر سکتا ہے۔ یاد رہے دنیا میں واپسی ممکن نہیں)

درج ذیل اشعار مزار شاہ حسین کی مشرقی دیوار پر لکھے ہوئے ہیں اور قابل غور ہیں ان میں رنگ نصیحت اور قسم کا ہے۔

کدی سمجھ ناداناں! گھر کتھے ای کتھے جاناں
آپ کمینہ' عقل کمینی کون کہے توں داناں
اپنیں راہیں جاندے ڈٹھڑے میر' ملک' سلطاناں
آپ مارے آپ جیوائے ارجائیل بہاناں
کہے حسین فقیر سائیں دا بن مصلت اٹھ جاناں

(نادان کبھی سوچ گھر کہاں ہے اور کدھر جانا ہے تو اور تیری عقل ناکارہ کمینی ہے' سفر آخرت پر میر' ملک' سلطان ہر مقام و مرتبے کے لوگ جاتے دیکھے گئے۔ وہ خود سپرد موت کرتا ہے اور حیات بخش بھی وہی ہے۔ عزرائیل تو بس بہانا ہے (ارجائیل بمعنی عزرائیل) اللہ کا درویش حسین کہتا ہے مصلحت وغیرہ جانے بغیر یہاں سے کوچ کر جاتا ہے

(مصلت بمعنی مصلحت

شاہ حسین کی ساری شاعری ویسے تو فنی اعتبار سے لاجواب ہے مگر یہ شعر راقم کو بطور خاص پسند ہے آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

ساجن تمرے روسڑے موئے آدر کرے نہ کوئے
دُردُر کریں سہیلیاں میں تُر تُر تاکوں توئے

(ساجن تو جب سے خفا ہوا ہے مجھے کوئی پوچھتا ہی نہیں (آدر بمعنی آؤ بھگت، سنسکرت زبان کا لفظ) سہیلیاں دھتکار رہی ہیں مگر میں ہوں کہ تیری دلجوئی تلاش کر رہی ہوں)

اب صورت حال یہ تھی کہ شاہ حسین کے ساتھ ان کے ہم مشرب وہم مسلک حضرات کی کثیر تعداد شہر کے گلی کوچوں میں رقص کرتی پھرتی۔ سرعام شغل مے نوشی ہوتا۔ شاہ موصوف کی آواز بھی سریلی تھی، فن موسیقی کے رموز سے آشنائی تھی، کچھ لوگ اشعار کے مفہوم سے جھوم جھوم جاتے کچھ سُروں کے طلسم میں گرفتار ہو جاتے۔ مختلف مکاتب فکر کے لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں پذیرائی کی۔ طبقہ علما البتہ صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس دور رنگین میں بھی شاہ حسین کا دن، راگ رنگ میں بسر ہوتا، احکام شریعت کی کھلی خلاف ورزی ہوتی مگر رات دریائے راوی کے ساحل پر تلاوت کلام پاک میں بسر ہوتی۔ حسب معمول "الحمد سے والناس" تک پورا قرآن ختم ہوتا۔ سامعین ساحل پر گم صم کھڑے اشجار ہوتے یا شوریدہ سر دریا کی لہریں۔

شیخ بہلول دریائی اس زمانے میں دُلا بھٹی کے علاقے میں قیام پذیر تھے۔ لاہور میں ہونے والے دھماکے کی گونج وہاں تک بھی پہنچی۔ وہ اپنے روحانی فرزند کی کایا پلٹ سے باخبر ہوئے تو کشاں کشاں لاہور پہنچے۔ داتا دربار کے قریب شاگرد سے سربازار مٹھ بھیڑ ہوئی۔ شاگرد عالم مستی میں جھوم رہا تھا۔ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ استاد نے مسکرا کر کاندھے پر ہاتھ رکھا تو شاگرد نے مخمور آنکھوں سے دخل در معقولات کرنے والے کو دیکھا۔ رفتہ رفتہ آنکھوں میں شناسائی کی لہریں موجزن ہوئیں "فرزند، کیا حال ہے؟" شیخ بہلول نے شاہ حسین کی ادھ کھلی آنکھوں میں جھانک کر کہا "حضور! اندر باہر لال ہے" شاہ موصوف نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ مرشد نے جو کچھ مرید کی آنکھوں میں دیکھا اسے پسند فرمایا۔ شیخ بہلول تاڑ گئے کہ شاگرد قید شریعت سے آزاد ہو چکا ہے اور کیفیت "جذب" میں ہے۔ مجذوب پر شریعت کی حد ناروا ہوتی ہے بلکہ وہ تمام حدود و قیود سے

مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے۔

"ایک نماز ہمارے ساتھ بھی پڑھ لو" شیخ بہلول نے دلی خواہش کا اظہار کیا۔

"کیا مضائقہ ہے" شاہ حسین نے ہتھیار ڈال دیئے" مگر اس حالت میں؟" یہ اشارہ ڈاڑھی اور اپنی ظاہری شکل و صورت کی طرف تھا۔ مگر شیخ بہلول نے مسکرا کر کہا "فرزند! یہ چمکتار کسی اور کو دکھانا" نماز کا وقت ہوا تو مرشد نے مرید باصفا کو امامت کا حکم دیا اور تلقین کی "فرزند! پورا قرآن سننے کی تمنا ہے اور لہجہ بھی "وہ" ہونا چاہئے" اشارہ اس الوہی لہجے کی طرف تھا جو خضر علیہ السلام نے تعلیم کیا تھا "جو حکم بندہ پرور" شاہ حسین ہوش و حواس میں تھے۔ نماز کی نیت باندھی گئی تلاوت کا آغاز ہوا' شجر و حجر جھومنے لگے' آسمانی لہجے کے سبب وقت کی رفتار تھم گئی۔ یہ لہجہ چشم فلک نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ جوں جوں ختم قرآن کی منزل قریب آتی گئی کیف و سرور میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۳۰واں پارہ شروع ہوا' ہوتے ہوتے سورۃ "الم نشرح" کی باری آئی۔ پہلی دو آیات تلاوت کرنے کے بعد قہقہہ لگایا۔ نماز ختم کی اور کیف و مستی میں پھر ڈوب کر رقص کرتے مسجد سے باہر نکل گئے۔ اب کے یہ عالم تھا کہ شیخ بہلول دریائی بھی شاگرد کی واپسی پہ قادر نہ تھے۔ انہوں نے صدق دل سے شاہ حسین کو دعا دی اور سپرد خدا کرنے کے بعد لاہور سے کوچ کر گئے۔ یہ دونوں کی آخری ملاقات تھی۔ اس عالم کون و فساد میں دونوں پھر کبھی نہ ملے۔

مغل شہنشاہ اکبر نے ایک نئے دین کی بنیاد رکھی۔ علمائے سو' مادی منفعت کی خاطر مہر بہ لب ہو گئے مگر شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانیؒ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے شیر دل علما سیسہ پلائی دیوار کی طرح اس طوفان بدتمیزی کے سامنے ڈٹ گئے۔ (اس کی تفصیل بڑی دکھ دہ اور المناک ہے مگر ہمارا موضوع نہیں بن سکتی) ایسے زمانے میں شاہ حسین کا وجود رندی و مستی کے باوجود ناقابل برداشت تھا لہٰذا جبین شہنشاہ پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ وہ خود زہد و تقویٰ سے دنیا سنوارنے کی جدوجہد میں تھا لہٰذا اس نے کوتوال شہر ملک علی کو حکم دیا ہ شاہ حسین کو پابہ زنجیر دربار اکبری میں حاضر کیا جائے۔ عجیب صورت حال تھی۔ شاہ حسین بحیثیت مجرم ہر جگہ موجود تھا۔ گلیوں' بازاروں' میں رقص کرتا پھر رہا تھا مگر گرفتاری عمل میں نہیں آ رہی تھی۔ چھاپا مار ٹولی ہر بار ناکام و نامراد لوٹتی۔ سراغ ملتے ہی قانون کے محافظ "جائے وقوعہ" پر پہنچتے مگر "مجرم" کو غائب پاتے۔ اس زمانے میں ایک

اور حادثہ رونما ہوا جس نے حکومت وقت کو ہلا کے رکھ دیا۔ سرکار دربار کے تاریخ نگاروں نے اس کی شدت کو کم کر کے' ایک سرپھرے انسان کی بغاوت کا نام دیا جسے جلال اکبری نے سختی سے کچل دیا حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ سرزمین پنجاب کے لوک گیتوں میں یہ داستان آج بھی جوں کی توں موجود ہے جس میں تخت مغلیہ کے لرزنے کی تفصیل محفوظ ہو چکی ہے۔ عام طور پر اسے ڈلا بھٹی کی بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم نے اجمالاً ذکر کیا ہے کہ شاہ بہلول عبداللہ بھٹی کے علاقے میں فروکش تھے۔ شاہ حسین' عبداللہ بھٹی' بہلول دریائی میں تعلق خاص کی متعل تاریخ خاموش ہے یا خاموش کر دی گئی مگر لوک گیت چوں کہ کسی خاص شخص کی قلمی کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ گزرنے والے زمانے کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں لہٰذا بغیر تعصب' لوبھ لالچ کے سچے واقعات کو محفوظ کر لیتے ہیں' شاہ حسین کی گرفتاریکا مقام اور حالات شاہ بہلول کا ڈلا بھٹی کے ہاں قیام اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اس ''تکون'' میں گہرا تعلق تھا۔ دلا بھٹی کے مختصر حالات سے اس بات کی وضاحت ہو جائے گی۔

لاہور کے کوتوال ملک علی کو شاہ حسین کی گرفتاری کا حکم مل چکا تھا مگر وہ قدم قدم پر ناکام رہا۔ اسی دوران دلا بھٹی والا معاملہ پوری شدت کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ ڈلا بھٹی اصل میں عبداللہ کا بگاڑ ہے جسے مغل تاریخ نویسوں نے عمداً بطور تحقیر استعمال کیا مگر بعد میں یہی نام شہزوری کی علامت بن گیا' یہ گیت زبان زد خاص و عام ہوا۔

دلانی جن والیئے جم دتا ای لوہے دی لٹھ
اوہدی اِک للکار تھیں گئی مغلی فوج ترٹھ

(اے ڈلا بھٹی کو جنم دینے والی خاتون' تو نے انسان نہیں آہنی لٹھ کو جنم دیا جس کی ایک للکار سے مغل فوج سہم جاتی ہے)

سیاسی صورت حال کے علاوہ دلا بھٹی مزاج اکبری بشمولیت دین الٰہی کے خلاف پنجاب سے اٹھنے والی ایک خوف ناک آواز تھی۔ ایک زمانے میں لاہور دریائے روای کے مغربی کنارے سے لے کر دریائے سندھ کے کنارے ڈلے والا (دریا خان کے قریب) تک کا علاقہ ''ڈلے دی بار'' کہلاتا تھا۔ وہ سارا علاقہ جو ڈلے کے دادا ''ساندل'' کے نام پر ساندل بار کہلایا اڑھائی سو سال تک بھٹی خاندان کے زیر تسلط رہا۔ یہ حکمرانی ۱۳۲۲ء سے ۱۵۸۹ء

تک رہی۔ فیصل آباد، سرگودھا، شیخوپورہ کی درمیان پنڈی بھٹیاں اس علاقے کا صدر مقام تھا۔ اپنے دور عروج میں بھٹی خاندان کی تین نسلوں نے مغل حکمرانوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ اس کا آغاز ساندل بھٹی سے ہوا۔ جنگ فرید بھٹی سے ہوتی ہوئی عبداللہ بھٹی کے زمانے میں بام عروج تک پہنچی۔ اس علاقے کے سارے کاشتکار اکبری دین الٰہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ بھٹی خاندان ان کا رہنما تھا۔ اصل میں اس کشمکش کا آغاز اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب ۱۶ویں صدی میں تخت دہلی کی کمزوری کے سبب مغل فوج کی یلغار کا آغاز ہوا۔ یہ لشکر اسی علاقے سے گزر کر دہلی کا رخ کرتا اور فصلوں، چراگاہوں کو تباہ و برباد کر کے مقامی باشندوں کی نفرت کو ہوا دیتا۔ گھوڑوں کے لئے بزور بازو خوراک وصول کرنا اور مزاحمت کرنے والوں کو تہ تیغ کر کے لہلہاتی فصلوں کو نذر آتش کر دینا روزانہ کا معمول تھا۔ دلا بھٹی کے دادا بجلی خان ساندل نے فوجی دستے منظم کئے اور مغلوں کے خلاف ایک طویل جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ساندل کا بیٹا فرید خان بھٹی جوان ہوا تو یہ جنگ عروج کو پہنچی۔ مغلوں نے اسے بغاوت کا نام دیا۔ جس دور میں اکبر نے بھٹی خاندان کے خلاف فوج کشی کی پنڈی بھٹیاں والا قلعہ مسمار ہوا، بھٹی سردار گرفتار ہوئے اور لاہور میں دونوں باپ بیٹوں کو دار پر لٹکا دیا گیا۔ اسی پر بس نہیں ہوئی بلکہ مغلوں نے ساندل اور فرید بھٹی کی لاشوں میں بھس بھروا کہ ان کی سرعام نمائش کی تاکہ حکومت کے خلاف سر اٹھانے والوں کو دوسروں کے لئے درس عبرت بنا دیا جائے۔ یہ خبر ساندل بار کے علاقے میں پہنچے تو عبداللہ ابھی بچہ تھا مگر دوسرے نوجوانوں کا خون کھول اٹھا اور وہ پہلے سے زیادہ، مغلوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ کسانوں کا استحصال، باپ دادا کا انتقام ”دین الٰہی“ کے خلاف نفرت ان چیزوں نے عبداللہ کو وقت سے پہلے جوان کر دیا اور اس نے سارے علاقے میں گویا آگ لگا دی۔ مغلوں کا کوئی قافلہ ادھر سے جا سکتا تھا نہ ادھر آ سکتا تھا۔ عبداللہ نے اپنی جنگی طاقت میں اضافے کے ساتھ ساتھ زیر تسلط علاقے میں بھی وسعت کی۔ میاں والی اور مظفرگڑھ کے درمیان دریاخاں کے قریب ”ڈلے والا“ ایک قصبہ آج بھی موجود ہے۔ یہ علاقہ دلا بھٹی کی سرحد تھی۔ علاقے کے سارے سرکردہ سردار جب ”علم بھٹی“ تلے جمع ہو گئے تو اکبر نے پوری توجہ سے اس معاملے پر غور کیا اور بنفس نفیس لاہور میں آ ڈیرے ڈالے اور چھیڑ چھاڑ کا آغاز ہوا۔ اکبر کا اس مہم میں

بنفس نفیس شریک ہونا اور لاہور میں مستقل قیام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ معاملہ ایک "فردواحد" کی بغاوت کا نہ تھا بلکہ جنگی صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ شاہ حسین کا معاملہ سیاسی بل چل تلے دب گیا مگر ختم نہیں ہوا تھا۔

جس موقعے کی اکبر کو تلاش تھی وہ بھی اس کی ہاتھ آ گیا۔ صوبے دار بکا ملکیرہ کی زیر سرگردی بارہ ہزار نفوس پر مشتمل ایک قافلہ مغلیہ رسد لے کر ساندل بار کے علاقے میں داخل ہوا۔ دلا بھٹی اپنا لشکر لے کر آندھی طوفان کی طرح اس قافلے پر حملہ آور ہوا اور قہر خداوندی بن کر مغل فوج پر ٹوٹ پڑا۔ مغل فوج کے سپاہی گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ قافلہ منتشر ہوا یا نیست و نابود کر دیا گیا مگر اس کا سپہ سالار "بکا ملکیرہ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ دلا بھٹی کو خبر ہوئی تو وہ تن تنہا اس کے تعاقب میں ہو لیا۔ تلاش بسیار کے بعد دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو دُلے نے گفت و شنید میں وقت صائع کئے بغیر تلوار کے ایک ہی وار سے بھگوڑے کا سر قلم کر دیا اور کٹے ہوئے سر کو خرجی میں ڈال کر اپنے جاں نثاروں سے آ ملا۔ اس علاقے میں ایک "میدا. نامی کھتری ایسی ہستی تھی جس کی مغل دربار تک رسائی تھی۔ دلا بھٹی نے اسے طلب کیا اور دشمن کا کٹا ہوا سر اس کے حوالے کرتے ہوئے حکم دیا "یہ سر' دربار اکبری میں لے جاؤ اور مغل بادشاہ سے کہنا یہ عبداللہ بھٹی کی طرف سے تحفہ ہے۔ عبداللہ جو ساندل کا پوتا اور فرید خان بھٹی کا فرزند ہے شاید ہماری ملاقات کسی میدان جنگ میں "مردانہ وار" ہو جائے۔ اکبر کو یہ بھی بتا دینا کہ میری اجازت کے بغیر جو شخص بھی میرے علاقے میں داخل ہوا اس کا یہی حشر ہو گا۔"

میدا کھتری یہ "تحفہ" لے کر جب دربار اکبری میں حاضر ہوا تو مغل شہنشاہ آتش زیر پا ہو گیا۔ دلا بھٹی کے ہر کارنامے کی گونج مغل دربار تک پہنچ جایا کرتی تھی مگر یہ گونج نہ تھی بم کا دھماکا تھا۔ بڑے بڑے سردار اس وقت دربار میں حاضر تھے۔ تخت شاہی کے سامنے بکا ملکیرہ مغل صوبے دار کا سر پر غرور پڑا تھا اور اکبر اعظم کی عظمت ڈگمگا رہی تھی۔ اس نے گرج کر اعلان کیا "سطوت مغلیہ کو للکارنے والے کا کون مقابلہ کرے گا؟" دربار میں سناٹا چھا گیا۔ دلے کی داستانیں ہوا کے دوش پر رقص کر رہی تھیں۔ دہشت سے زیادہ اس کی وحشت کے سبب سارے سردار مہر بہ لب تھے۔ آخر مغل سردار

مرزا نظام الدین نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر اس مہم کو سر کرنے کے بیڑا اٹھایا۔ مغل لشکر کو فوراً تیاری کا حکم دے دیا گیا۔

بھرے دربار میں مرزا نظام الدین نے جرأت رندانہ کا مظاہر تو کر دیا تھا لیکن راوی کے اس پار اسے اپنی موت دکھائی دے رہی تھی، مگر تیر' کمان سے نکل چکا تھا۔ اب اگر پیچھے ہٹتا تو مغل شہنشاہ کے قہر کو دعوت دیتا۔ آگے قدم بڑھاتا تو وادی موت میں پیش قدمی ہوتی۔ اسی کشمکش میں کوچ کا دن آ پہنچا۔ سولہ ہزار کا لشکر لے کر مرزا نظام نے دریا عبور کیا اور ساندل بار میں قدم رکھے۔ عبداللہ بھٹی ان دنوں راوی کے بیلوں میں "مصروف شکار" تھا۔ اس کے دارالخلافے پنڈی بھٹیاں میں خواتین اور ذاتی ملازموں کی قلیل تعداد موجود تھی۔ عبداللہ کا ایک بھائی "مہرو" البتہ شہر کی حفاظت کے لئے ضرور موجود تھا۔ مرزا نظام الدین نے دلا بھٹی اور اس کے جاں نثاروں کی عدم موجودگی کو تائید غیبی تصور کرتے ہوئے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مہرو نے اپنے سپاہیوں کو دم آخر تک مقابلے کے لئے تیار کر لیا۔ مغل فوج حملہ آور ہوئی تو زہر آلودہ تیروں کی یلغار نی ان کا خیر مقدم کا۔ پہلے ہلے میں اکتیس سپاہی گر کر تڑپنے لگے۔ مرزا نظام فوراً سمجھ گیا کہ آنے والے تیر زہر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس نے لشکر کو پسپائی کا حکم دیا۔ اس وقت کوش نصیبی خود چل کر مرزا نظام کے در پر پہنچ گئی۔

ڈلا بھٹی کے اپنے "شریک" دوست نما دشمن جو ہر زمانے میں ہر جگہ موجود ہوتے ہیں مغل سپہ سالار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شہر میں داخلے کے محفوظ مقامات کی نشان دہی کرنے لگے۔ اس طرح "پنڈی بھٹیاں" سرنگوں ہوا۔ مگر یہ داستان کا صرف آغاز تھا۔ دلا بھٹی کی والدہ اماں لدھی اور دو بیویاں "بھلاں اور نوراں" مغل فوج کی قید میں آئیں۔ مرزا نظام فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا قیدیوں کو پابہ زنجیر لے کر عزم لاہور ہوا۔ مگر ساندل بار کے سرحدی گاؤں کا سردار' لال خان مغل فوج کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس کی غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ بھٹی خاندان کی خواتین' دربار اکبری میں ذلیل و رسوا کی جائیں۔ یہ گویا سارے پنجاب کی رسوائی تھی۔ مغل سلطنت ویسے بھی کوئی اسلامی ریاست نہ تھی۔ اکبر جیسے شہنشاہ کو ہم بھی بہ امر مجبوری مسلمان حکمران کہتے ہیں ورنہ اس کے "کارناموں" سے کون واقف نہیں۔ ہنود و یہود اس کی عظمت کے گن گاتے ہیں تو یہ بھی

ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

لال خاں نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیز رفتار ہرکارہ دوڑایا اور دلا بھٹی کو اس کی خبر کر دی۔ عبداللہ اپنی فوج لے کر فوراً میدان جنگ میں پہنچا۔ اس کے آتے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ اس نے زبردست جنگی چال چلی جس سے مغل لشکر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گیا اور دُلا ان ٹکڑوں کا صفایا کرنے لگا۔ یہ معمولی جھڑپ نہ تھی جس جنگ میں سولہ ہزار مغل فوج حصہ لے رہی ہو اسے معمولی جھڑپ قرار دینا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ بہرحال مغل لشکر تباہ و برباد ہوا تو مرزا نظام راہ فرار اختیار نہ کر سکا مگر اس کے پاس ترپ کا یکہ موجود تھا وہی اس نے بڑی عقل مندی سے کھیلا۔ اس نے اپنا سر دلا بھٹی کی والدہ اماں لدھی کے قدموں میں رکھ دیا ”نیک دل خاتون‘ ماں بن کر مجھے اپنی پناہ میں لے لے“ مرزا نظام نے یہ التجا کچھ اس انداز سے کی کہ ”نیک دل خاتون“ کو اس پر رحم آ گیا اور اس نے مرزا نظام کو پناہ دے دی۔ دلا بھٹی کو خبر ہوئی ت واس نے صدائے احتجاج بلند کی، ماں کو سمجھایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ادھر دُلا شمشیر براں لئے کھڑا تھا ادھر مرزا نظام عمر رسیدہ خاتون کی پناہ میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ صورت حال عجیب واہیات ہو گئی۔ دلا لاکھ بہادر سہی مگر ماں کے سامنے بلند آواز میں گفتگو کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کمزوری تھی یا سیاسی بصیرت کا فقدان‘ جو کچھ بھی تھا خوب بلکہ بہت خوب تھا۔

”عبداللہ! یہ تلوار نیام میں کر لو اور اس شخص کو گلے لگا کر اپنا بھائی بنا لو“ ماں نے گرج کے ہا۔ دلا بھٹی جانتا تھا کہ وہ سانپ کو گلے لگا رہا ہے مگر مجبوری تھی۔ اس نے تلوار نیام میں کر لی اور مرزا نظام کی نہ صرف جان بخش دی بلکہ اسے گلے لگا کر بھائی تسلیم کر لیا۔ مرزا کی جان میں جان آئی اور اس نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور گواہ بنا کر عہد کیا کہ وہ تاحیات عبداللہ کا وفادار رہے گا۔ سیاست اور چرب زبانی میں چولی دامن کا کب ساتھ نہیں تھا؟ اور کب دلاوری اور چرب زبانی‘ دریا کے دو کنارے نہیں تھے۔ مرزا نظام نے چند دنوں میں دلا بھٹی کا اعتماد حاصل کر لیا مگر درپردہ مغل دربار سے بھی رابطہ رکھا۔ اکبر اعظم اپنی سیاسی بصیرت سے معاملے کی تہ تک پہنچ گیا اور زہر دینے کے بجائے حریف کو ”گڑ“ سے ہلاک کرنے کے خیال سے مطمئن ہو گیا۔

عبداللہ بھٹی کو جنون کی حد تک شکار کا شوق تھا۔ مرزا نظام نے بھی شکار کو اوڑھنا

بچھونا بنا لیا۔ دونوں "بھائی" جنگل بیلوں میں شوق کی تسکین کرتے رہتے ایک روز مرزا نظام سپہ سالار مغل فوج اپنے منہ بولے بھائی کو ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں مغل فوج گھات لگائے بیٹھی تھی۔ مرزا نظام الدین نے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ مغل فوج اس کے اشارے کی منتظر تھی۔ دلا بھٹی کے اسپ تازی نے خطرے کی بُو سونگھ لی مگر مالک کے اشارے پر دشمنوں کے جال میں پیش قدمی پر مجبور ہو گیا۔ دلا بھٹی کو ہوش اس وقت آیا جب وہ چاروں طرف سے دشمن کے تیروں کی زد پر آ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو منہ بولا بھائی غائب ہو چکا تھا۔

"گیڈر صفت لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں چپ چاپ ہتھیار ڈال دوں گا تو ان کی یہ حسرت کبھی پوری نہ ہو گی۔" عبداللہ بھٹی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تلوار بے نیام کر کے دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ وہ چومکھی لڑ رہا تھا اور جدھر کا رخ کرتا سر کاندھوں سے کٹ کٹ کر گرنے لگتے۔ پنجاب میں فن شاعری کی ایک صنف کو "وار" کہتے ہیں۔ اس میں کسی فرد کے بہادرانہ کارنامے گیتوں کی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس مقابلے کی تفصیل ان "واروں" میں آج بھی محفوظ ہے۔ دیکھیں کب کوئی قلمکار اسے موضوع سخن بناتا ہے اور یہ داستان منصۂ شہود پر آ کر تاریخی کرداروں سے انصاف کرتی ہے۔ ایک تنہا شخص مغل فوج سے برسرپیکار تھا۔ وہ کوئی مافوق الفطرت کردار نہیں تھا مگر جو کچھ اس روز پیش آیا' وہ حیرت انگیز ضرور ہے۔ دو سو گیارہ مغل سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ دلا بھٹی کے جسم پر زخم سجتے رہے مگر وہ بدستور جنگ کرتا رہا۔ جب وہ سپاہیوں کے نرغے میں آ جاتا تو اس کا گھوڑا بلند چھلانگ لگا کر اسے دشمنوں کے نرغے ے نکال لے جاتا' ایسی ہی ایک کوشش میں وہ چھلانگ لگا کر زمین پر آیا تو دلدل میں پھنس گیا۔ ادھر دلا بھٹی بھی تھک کر چور ہو چکا تھا۔ حریف غیر متحرک ہوا تو مغل فوج نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس طرح اسے پابجولاں' مغل شہنشاہ اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔

مغل شہنشاہ نے اسے اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ رنگین لالچ اور سنگین نتائج کی دھمکیاں' سارے حربے ناکام ہو گئے۔ دلا بھٹی نے صاف کہہ دیا "میں کس کا طوق غلامی گلے میں پہنوں؟ باپ دادا کے قاتل اور اپنی دھرتی کے غاصب کا؟ یہ اس مٹی کا مزاج ہی نہیں جس سے میرا خمیر اٹھایا گیا ہے۔"

”دین الٰہی قبول کر لو' دنیا کو تمہارے لئے جنت بنا دوں گا“ اکبر نے نیا جال پھینکا مگر یہ جال نہیں زہر میں بجھا ہوا تیر تھا جو دلا بھٹی کے دل میں ترازو ہو گیا۔ پابند سلاسل کر بھی کیا سکتا تھا۔ بے بسی کی حد ہو گئی۔ اچانک بھرے دربار میں اس نے حاکم وقت اکبر اعظم کو ننگی شرمناک گالیوں سے نوازنا شروع کیا۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو مورد الزام ٹھہرایا اور مغل اعظم کی ولدیت کو مشکوک قرار دیا جس کے نتیجے میں اسے دار پر لٹکا دینے کا حکم ہوا۔ ۲۶ مارچ ۱۵۸۹ء لاہور محلہ نخاس موجودہ لنڈا بازار کے قریب نولکھا بازار میں غیرت کے مجسمے' عبداللہ بھٹی کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔

شاہ حسین جسے قانون کے محافظ تلاش کرتے کرتے تھک چکے تھے' پنجاب کی غیرت کے مجسمے کا آخری دیدار کرنے جانے کدھر سے نکل آئے۔ ہمدردوں نے درویش کو اس ”تماشے“ میں شریک ہونے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی مگر شاہ موصوف نے اپنے مست الست لہجے میں کہا ”دیکھنا یہ ہے کہ دیوانہ کس دھج سے مقتل میں جاتا ہے' یہ تو بڑے ثواب کا کام ہے اور پھر دُلا تو ہمارا یار ہے۔ کیا ہم یار کو الوداع کہنے بھی نہ جائیں۔“

ادھر عبداللہ کو سولی پر لٹکایا گیا ادھر شاہ حسین نے جھوم جھوم کر رقص کا آغاز کیا اور ایسے اشعار پڑھے جو تاقیات اصناف سخن میں سنگ میل کا مقام رکھتے ہیں' ملاحظہ فرمائیں۔

یا دلبر یا سر کر پیارا
دے دے لعل لباں دے لارے
سولی پر چڑھ لے ہلارے
آن ملیسی دلبر یارا
یا دلبر یا سر کر پیارا

(یا دلدار سے پیار کر یا سر کو عزیز رکھ۔ تیرے سامنے لبوں کی سرخی جلوہ دکھا رہی ہے' اسے حاصل کرنے کی خاطر سولی پر جھول جا۔ یار خود بخود مل جائے گا)

اسی مضمون کو فیض احمد فیض نے اس طرح بیان کیا۔

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

کوتوال شہر کی توجہ جب شاہ حسین کی طرف مبذول کرائی گئی تو وہ بڑا حیران ہوا۔ وہ دلا بھٹی سے فارغ ہو چکا تھا۔ جو کچھ مصلوب ہونے والے نے جان کا نذرانہ پیش کرنے سے پہلے کہا اور کیا' وہ تاریخ میں محفوظ ہو گیا مگر ملک علی کی مسرت کا ٹھکانا نہ رہا جب اس نے نئے شکار کو نظروں کے عین سامنے دیکھا۔ شہنشاہ کے سامنے اپنی کارگزاری دکھانے اور سرخرو ہونے کا یہ سنہری موقع تھا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ شاہ حسین کو گرفتار کرلیا جائے۔ پیادے قریب آئے تو درویش نے مسکرا کر انہیں اپنی حد میں رہنے کا مشورہ دیا۔ "تم لوگ اس معاملے سے دور رہو' کوتوال کو اپنے دل کی حسرت نکال لینے دو۔ دیکھتے ہیں یہ بدبخت کس حد تک جا سکتا ہے" سپاہی اتنے مرعوب ہوئے کہ وہ واقعی پیچھے ہٹ گئے۔ کوتوال یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی رعونت سے آگے بڑھا اور ایک سپاہی سے ہتھکڑی لے کر شاہ حسین کو پہنانے لگا۔ مگر دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ کوشش بسیار کے باوجود وہ کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ "ملزم" نے مسکرا کر کوتوال کو دیکھا اور کہا "چلو ایک کوشش اور کر دیکھو" بے خبر کوتوال کو چاہئے تھا کہ سبق حاصل کرتا اور اس فعل بد سے باز رہتا مگر اس نے غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر ہتھکڑی پہنا دی۔ شاہ حسین نے آہنی زیور کو بغور دیکھا تو وہ تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔ ہتھکڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر گئی۔ کوتوال بڑا حیران ہوا مگر اپنی حرکت سے پھر بھی باز نہ آیا۔ قریب کھڑے سپاہی سے اس نے دوسری ہتھکڑی طلب کی اور شاہ حسین کو پہنا دی مگر اس نئے زیور کا بھی وہی حشر ہوا۔ ملک علی سرعام تماشا بن گیا۔ غضب سے اس کا رنگ دہکتے انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کشائی کی کوشش کی تو شاہ حسین نے متنبہ کیا "کوتوال! سوچ سمجھ کر بات کرنا' کہیں تمہاری قسمت کا فیصلہ نہ ہو جائے۔"

"اوئے جادوگر' تُو سمجھتا ہے' میں تیرے چمتکار سے مرعوب ہو جاؤں گا" کوتوال نے گرج کر کہا "میں۔ میں تیری پیٹھ میں لوہے کی میخ ٹھونک دوں گا۔"

"اوہ بدبخت' یہ تُو نے کیا کہہ دیا" شاہ حسین نے پُر تاسف لہجے میں کہا "تو نے اپنی سزا کا خود اعلان کر دیا' حالانکہ اس فقیر نے تجھے منع بھی کیا تھا مگر شاید لوح محفوظ پر یہی لکھا تھا' اب کچھ نہیں ہو سکتا" شاہ حسین کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ تماشائیوں کو سانپ سونگھ گا۔ خود ملک علی دھک سے رہ گا۔ شاہ حسین جدھر سے آئے تھے اُدھر

لوٹ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ساری دنیا نے دیکھا' چشم فلک بھی ورطہ حیرت میں ڈوب گئی۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ دلا بھٹی نے بھرے بازار میں "مغل اعظم" کو کھری کھری سنائی تھیں۔ شہنشاہ نے "جرم وفا" کی پاداش میں اسے دار کے حوالے کرنے کے ساتھ یہ ہدایت بھی جاری فرمائی تھی کہ مصلوب ہونے اور کئے جانے کی مکمل روداد تحریرا دربار اکبری میں پیش کی جائے۔ یعنی ایک ایک پل کی مکمل رپورٹ' عوام الناس کا ردعمل اور مجرم کی کیفیت وغیرہ وغیرہ۔ جب عبداللہ بھٹی کو پھندا پہنایا جانے لگا تو اس نے اکبر اعظم اور اس کے خاندان کی شان میں ایسے ایسے کلمات ادا کئے ایسی شرمناک اور غلیظ گالیوں سے نوازا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ دلا بھٹی کو بخوبی علم تھا کہ مقتل سے آگے کوئی راستہ نہیں اور شہنشاہ جان لینے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ دنیاوی سازوسامان پر ملکیت جتانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان صرف ایک حد تک جا سکتا ہے ہر چیز اس کے بس میں نہیں ہوتی۔ مثلاً

قفس ہے بس میں تمہارے' تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم
ہوا کی مست خرامی تہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم

لہٰذا مصلوب ہونے سے پیشتر اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور خوب نکالی۔ ادھر کوتوال کی بدبختی ملاحظہ ہو کہ اس نے ساری رُوداد من و عن' ایک ایک گالی' ایک ایک الزام' شاہ کا ایک ایک گناہ جو کچھ عبداللہ بھٹی کی زبان سے ادا ہوا لکھ کر دربار اکبری میں پیش کر دیا۔ جب یہ خرافات کا پلندہ بھرے دربارے میں پڑھ کر سنایا گیا تو درباریوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ پڑھنے والے کی زبان لڑکھڑانے لگی اور ٹانگوں میں رعشہ طاری ہو گیا۔ ادھر مغل اعظم اچھل کر کھڑا ہو گیا "اس ناہنجار کوتوال کی یہ جرأت؟ یہ ہمت؟ دربار اکبری کے وقار کا ذرہ برابر پاس نہ لحاظ۔ کس نااہل نے اسے کوتوال کے مقام پر فائز کیا؟" مغل شہنشاہ زخمی شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا۔ دلا بھٹی تو اس کے قبضہ قدرت سے نکل چکا تھا۔ قہر شاہی کا ہدف کوتوال ہوا" اس ناہنجار کی پیٹھ میں ابھی اسی وقت لوہے کی میخ گاڑ دو تاکہ

دنیا کو عبرت حاصل ہو اور ہر پل ہر سانس لوگ جلال اکبری کو یاد رکھیں" یہ کہہ کر مغل بادشاہ دربار سے اٹھ گیا۔ فرمان شاہی پر حرف بہ حرف عمل کیا گیا۔ شاہ حسین نے کہا تھا "بدبخت تو نے اپنی سزا کا خود اعلان کر دیا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

تاریخ سے شغف رکھنے والوں کو یاد ہو گا کہ فرعون کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کے ہر خاندان میں سے پہلوٹھی کے اولاد نرینہ کے قتل کا حکم دے دیا تھا اور یہ اس کی اپنی سزا کا اعلان ثابت ہوا۔ ملک علی کوتوال شہر اپنے انجام کو پہنچا تو مغل شہنشاہ کو شاہ حسین کی پیش گوئی سے مطلع کیا گیا۔ وہ خود حیران و ششدر رہ گیا۔ بہرحال اس نے خود پیش گوئی کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے شاہ حسین کو دربار اکبری میں حاضر ہونے کا حکم جاری کر دیا۔ بات وہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو منوانے کی خاطر عجیب و غریب قسم کی مخبوط الحواسیوں کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اس پر نازاں بھی ہوتا ہے۔

شاہ حسین کا معمول وہی تھا سرخ کپڑے، رقص و سرود، سرے عام مے نوشی ڈاڑھی صاف شریعت کے جملہ احکام طاق نسیاں ہو کر رہ گئے تھے لیکن ایک بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ طوق رسوائی گلے میں سجائے، اس شخص کی راتیں کیسے بسر ہوتی ہیں۔ روز روشن میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب کے سامنے تھا اور جو کچھ سامنے تھا وہ قابل عبرت حد تک رندانہ تھا۔ اسی زمانے میں شاہ حسین کا مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری سے ٹکراؤ ہوا۔

ملا عبداللہ سلطان پوری عہد اکبری کا عالم بے مثال، معقولات معروفہ کا ماہر صرف و نحو، معانی و منطق میں دانا، علم ریاضی، ہیت حکمت میں مہارت تامہ رکھنے والا، فقہ، تفسیر اور علم حدیث میں یکتا، دلائل و برہان کے دقیق مسائل کو چٹکی بجا کر حل کرنے والا شخص تھا۔ ان صفات و خصوصیات کی بنا پر مغل شہنشانے اسے ہندوستان کے مخدوم الملک کے عہدہ جلیلہ پر فائز کر رکھا تھا۔ ملا موصوف خلاف شریعت سرزد ہونے والے افعال کا بڑی سختی سے محاسبہ کیا کرتا تھا اور ملزم کو پل بھر میں مجرم ثابت کر کے فوراً سزا سنا دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ غیر شرعی حرکات کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے ملا موصوف کا وجود دہشت سے کم نہ تھا، ظاہر ہے شاہ حسین کے معاملے میں ایسی شخصیت آخر کب تک

خاموش رہ سکتی تھی۔ مخدوم الملک کی لاہور میں آمد ہوئی تو اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا "فوراً اس نام نہاد درویش کو پکڑ کر حاضر کیا جائے" درویش کو خبر ہوئی تو وہ علم کے سمندر سے مرعوب تو نہ ہوا مگر برضا و رغبت کارندوں کے ہمراہ ہو لیا۔ ہیئت کذائی میں البتہ کوئی تبدیلی نہ کی، صراحی اور جام کے ہمراہ عالم بے بدل کی عدالت میں رقص کرتا اور عشق و عاشقی کے گیت گاتا حاضر ہو گیا۔ مخدوم الملک نے دیکھتے ہی استغفر اللہ اور لاحول...... پڑھا پھر آتش غیظ و غضب میں سیخ پا ہو کر پوچھا "یہ کیسی درویشی ہے؟ یہ جام و سبو، شراب نوشی، ڈاڑھی کا صفایا رقص و سرود، کون سی شریعت کی اتباع کر رہے ہیں؟" مخدوم الملک نے تادیبی کوڑا رسید کا۔

"محترم، سوئے ظن سے اجتناب کریں کیوں کہ یہ اثم بھی ہے اور عدوان بھی" شاہ حسین نے قرآنی آیت کی طرف اشارہ کیا جس میں بدگمانی سے پرہیز کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ یہ گناہ بھی ہے اور زیادتی بھی۔

سوئے ظن یعنی بدگمانی" مخدوم الملک نے استہزائیہ لہجے میں دہرایا "آنکھوں کی شہادت سے بڑھ کر بھی کوئی شہادت ہے؟" عالم بے بدل نے درویش کو علم کلام کے خارزار میں گھسیٹنا چاہا۔

"بالکل ہے" درویش نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ "اگر یہ شہادت معتبر ہوتی تو بن دیکھے ایمان لانے کی تلقین نہ کی جاتی، آنکھوں کی گواہی نہایت جھوٹی اور ناقابل اعتبار ہے" یہ ایک ایسا مدلل جواب تھا کہ مخدوم الملک چاروں شانے چت ہو گیا۔

"تمہارا مطلب ہے میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں" مخدوم الملک نے جزبز ہو کر کہا۔

"تمہارے پاس دیکھنے والی آنکھ ہی نہیں ورنہ تم میرے اندر جھانک کر دیکھ سکتے تھے" شاہ حسین نے سنجیدگی سے کہا "میرے ظاہر پر مت جاؤ، تم عالم ہو اس لئے علم کے احترام میں، میں صرف تنبیہہ کر رہا ہوں۔"

"اس صراحی میں کیا ہے؟" مخدوم الملک نے نیا سوال کیا۔

"چکھ کر دیکھ لو" شاہ حسین نے جام بھر کر ملا عبداللہ سلطان پوری مخدوم الملک کو پیش کیا۔ ملا بدک کر پیچھے ہٹ گیا مگر شاہ حسین نے مسکرا کر کہا "پی دیکھو، زبان ناپاک

ہوئی تو سزا کا حقدار ٹھہراتا” مخدوم الملک اس جھانسے میں آ گیا۔ وہ تو شریعت کی حد نافذ کرنا چاہتا تھا اور مجرم خود زیردام آ رہا تھا۔ لہٰذا اس نے درویش کے ہاتھ سے جام لے کر ایک گھونٹ بھرا۔ عرق گلاب کا ذائقہ تھا مگر شیریں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شاہ حسین نے جام لے کر دوبارہ اسی صراحی سے بھر کر پیش کیا ”یہ دیکھیں کیا چیز ہے؟”

مخدوم الملک نے چکھا تو حیران رہ گیا۔ اس بار ذائقہ خالص شکر کے شربت کا تھا پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ اسی صراحی سے سات بار جام بھرا گیا۔ ذائقہ ہر بار مختلف تھا۔ خالص پانی، شکر کر شربت، سرکہ، قہوہ، چائے عرق گلاب اور خالص دودھ۔

”درویش، یہ کیا راز ہے؟” ملا سلطان پوری کا لہجہ یکسر بدل گیا ”کیا یہی شراب پی ک تم مست الست پھرتے رہتے ہو؟”

”ان تمام مشروبات کی اصل ایک، ہے” درویش نے وضاحت پیش کی ”اور یہی توحید ہے، ایک موحد دوئی کو مانتا ہے نہ تقلید کو یعنی ذائقہ تو ادراک کا تابع ہے اور میرا ادراک دوسرے کی تقلید بھی تسلیم نہیں کرتا اب دینی اعتبار سے جو جائز ہے تو کر گزر” شاہ حسین یہ کہہ کر مخدوم الملک کی عدالت سے نکل گئے مگر قاضی تادیر سرنگوں اپنے خیالات میں گم رہا۔ سر اٹھایا تو اس نے برملا کہا ”حسین نیک و بد کی اصل پہچان بن گیا ہے۔ خدا کا درویش جو کر رہا ہے وہ ناروا نہیں، یہ باہر سے زندیق مگر اندر سے مومن ہے۔”

اسی ٹکراؤ کو داراشکوہ نے ”حسنات العارفین” میں ایک دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے۔ متن ملاحظہ فرمائیں۔ ”مخدوم الملک، شاہ حسین کو سزا دینے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا، سربازار دونوں کا ٹکراؤ ہو گیا تو شاہ حسین نے سوار کی لگام تھام لی ”اسلام کے پانچ ارکان ہیں” درویش نے کہا۔ ”توحید میں ہم دونوں برابر ہیں، حج اور زکوٰۃ تو نے چھوڑ رکھے ہیں اور نماز روزہ میں نے، پھر میں سزا کا مستحق کیسے ہو گیا؟” زکوٰۃ والا اشارہ بہت گہرا تھا جو صرف مخدوم الملک ہی سمجھ سکتا تھا۔ اصل صورت حال کی وضاحت مخدوم کی وفات ۹۹۱ھ کے بعد ہوئی جب اس کے گھر سے مصنوعی قبر میں دفن کیا ہوا سونا چاندی دریافت ہوا جس کی مالیت اس زمانے میں تین کروڑ روپے تھی۔ سربازار مخدوم الملک کو لاجواب کر دینا صرف درویش شاہ حسین ہی کا کام تھا۔

اس ٹکراؤ کی گونج بھی دربار اکبری تک پہنچی۔ وہ ملا عبداللہ سلطان پوری کی ذہنی شکست کا سن کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ سب اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ مخدوم الملک کو گفتگو میں لاجواب کرنا انسانی بس میں نہیں۔ اکبر بادشاہ، درویش کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم تو صادر کر چکا تھا مگر فکر یہ دامن گیر تھی کہ وہ شاہ حسین کا سامنا کیسے کرے گا۔ اس نے اپنے ایک خاص کارندے کو حکم دیا کہ وہ شاہ حسین کے ڈیرے پر جائے اور شریعت کی حد نافذ کرنے کی بحث چھیڑ کر صحیح صورت حال کا اندازہ لگائے۔ شہنشاہ وقت کا کارندہ شاہ سے شاہ کا وفادار نکلا۔ اس نے جاتے ہی بڑے پُرغرور لہجے میں کہا "شریعت میں ڈاڑھی منڈوانا کہاں مرقوم ہے؟ کیوں نہ اس جرم کی پاداش میں تمہیں زندان میں ڈال دیا جائے۔"

شاہ حسین فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئے اور بڑی رسان سے کہنے لگے "بھائی، میں کب ڈاڑھی منڈواتا ہوں، آپ حضرات کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"تو گویا آپ دروغ گوئی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔" کارندہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ میں ابھی آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔"

"خدا کے بندے، بات تو سنو، میری بات کا یقین کرو۔ میں نے شرع کے عین مطابق ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے، لو دیکھ لو" یہ کہہ کر درویش نے منڈھی ہوئی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور اسے کھینچ کر دراز کر دیا۔ یہ دیکھ کر کارندے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوا تھا۔ شاہ حسین کے چہرے پر جہاں پہلے کچھ بھی نہیں، اب شرع کے عین مطابق "ریش مبارک" موجود تھی۔

"اتنی لمبی ڈاڑھی کافی ہے یا اور ہونی چاہئے؟" اللہ کے فقیر نے بغیر کسی استہزا کے پوچھا۔

"حضور! میری تقصیر معاف فرمائیں۔ میں آپ کے مقام سے آگاہ نہیں تھا" وہ کارندہ درویش کے پاؤں پر گر گیا۔ (حقیقت الفقراء از محمد پیر میں کارندے کی جگہ دربار اکبری کا "وزیر" لکھا ہے متن میں کوئی فرق نہیں)

شہنشاہ اکبر کے فرسادے نے حقیقت حال گوش گزار کی تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ ملک علی کوتوال بھ شاہ حسین کو گرفتار کرنے میں ناکام رہا تھا بلکہ اس کوشش میں

اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مخدوم الملک اپنی تمام تر علمیت سمیت لاجواب ہو گیا تھا۔ ادھر یہ فرستادہ عجیب و غریب بلکہ ناقابل فہم قسم کی "کہانی" سنا رہا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر حاکم وقت کا اشتیاق دوچند ہو گیا مگر برا ہو نشہ ء حکمرانی کا وہ جوں کا توں تھا۔ حکام ادنیٰ و اعلیٰ کو فرمان جاری ہوا "شاہ حسین کو فوراً حالت رندی میں پیش کیا جائے' مابدولت خود معاملے کی تہ تک پہنچنے کے خواہش مند ہیں۔" اس فرمان نے حکام بالا و اعلیٰ کو مصیبت میں ڈال دیا۔ ایک طرف جلال اکبری تھا تو دوسری طرف قہر شاہ حسین۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ شاہ حسین نے اپنے ہر کردار میں اپنی عظمت ہر خاص و عام سے تسلیم کرا لی تھی۔ پہلے اپنے زہد و تقویٰ کے باعث لوگوں سے احترام کرایا' حالت رندی میں خرق عادت واقعات سے ان کی ذات کے گرد خوف و احترام کا ایک غیر مرئی ہالہ معرض وجود میں آ چکا تھا۔ کوچہ و بازار میں ایک ہی موضوع زیر بحث تھا "ذات حسین۔" اب ایسی شخصیت کی گرفتاری میں خطرے بھی تھے اور وسوسے بھی مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ شاہ حسین بہ آسانی نہ صرف دستیاب ہو گئے بلکہ دربار شاہی میں جانے کے لئے برضا و رغبت تیار ہو گئے۔ بس تھوڑی سی بحث و تمحیص ہوئی۔ درویش نے بڑی نرم زبان اور لہجے میں کہا "درویش اور دربار شاہی' دریا کے دو کنارے ہوتے ہیں۔ بہتر ہے مجھے دربار میں جانے پر مجبور نہ کرو۔"

مگر سپاہیوں نے بصد احترام اپنی مجبوری بیان کی "حضور! آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا مگر ہمارا سب کچھ بگڑ جائے گا" یہ سنتے ہی شاہ حسین اپنے سامان عیش عشرت کے ساتھ اپنے خاص انداز دلربائی میں کارندوں کے ساتھ ہو لئے۔ ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ حضرات بھی دربار میں حاضر ہوئے۔ کسی نے آلات غنا اٹھا رکھے تھے' کسی نے پاس جام و مینا۔ عجیب شان رندانہ سے یہ گروہ شاہ حسین کے جلو میں داخل دربار ہوا۔ مغل بادشاہ کو تمام حالات سے مکمل آگاہی تھی۔ اس نے درباری جی حضوریوں سے دریافت کیا "کون سے دین دھرم اور کون سے مسلک میں یہ چنگ و رباب' سرعام شراب نوشی' فسق و فجور وغیرہ کی اجازت ہے؟ یہ تو کفر و الحاد کی باتیں ہیں۔"

پیشتر اس کے کہ درباری لب کشا ہوں شاہ حسین نے خود گفتگو کا آغاز کیا۔

باطن اہل فقر راست یقیں

چہ شناسند قوم ظاہر بیں

"اہل فقر کی راست باز نگاہیں اندر کا حال جان لیتی ہیں۔ ظاہر دیکھنے والی نگاہ کی رسائی وہاں تک نہیں ہو پاتی۔ لہٰذا آنکھ کی گواہی نامعتبر ہے۔ آنکھ تو بڑی دغاباز اور فریبی ہے۔ جن اشیاء کا تعلق ہماری ظاہری زندگی سے نہیں ان کو یہ بالکل نظرانداز کر دیتی ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے کہ آنکھ سامنے والی شے کو نظرانداز کر دے" حکمران وقت نے بزعم خود بڑی گہری بات کی۔

"تمام الہامی کتب سے "تخلیقات لطیف" کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً جنات وغیرہ آنکھ کے مشاہدہ نہ کر سکنے کی بنا پر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا سکتا ہے۔ ہزاروں اشیاء ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں مگر وہ ہمارے گرد و پیش موجود ہیں تو کیا ایسی صورت میں ان کی نفی کر دی جائے؟ کیا یہ پرلے درجے کی جہالت نہ ہو گی؟" شاہ حسین کا لہجہ ایسا تھا جیسے کوئی بزرگ بچوں کو ابتدائی باتیں سمجھا رہا ہو۔ "باقی رہی آنکھ کی گواہی تو چاندر رات میں اشیاء کا رنگ و روپ چمکتے آفتاب میں مختلف کیوں ہوتا ہے' کیا اشیاء کی "ذات" بدل جاتی ہے؟ ہرگز نہیں' تو پھر صفات کیوں بدل جاتی ہیں؟ صرف اور صرف نامعتبر گواہی کی بنا پر۔"

بات شہنشاہ اور اس کے درباری جی حضوریوں کی سمجھ میں آ چکی تھی مگر دنیاوی جاہ و جلال تسلیم حقیقت میں مانع تھا۔ بھلا ایک بے سر و سامان فقیر' فہم و فراست میں شہنشاہ کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا۔ یہ بات ہمیشہ سچ رہی ہے اور رہے گی کہ خواہ حاکم کے گنبد سر میں عقل کے بجائے بھس بھرا ہوا ہو' وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے اور کبھی غلط نہیں ہوتا یہی تاریخ انسانی کا المیہ رہا ہے اور یہ اس سے بھی بڑا سچ ہے کہ سچائی جب جھک نہ سکے تو اس کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔

شاہ حسین! تم اور یہ تمہارے حواری کھلے عام شراب نوشی کرتے پھر رہے ہیں اور تم ہمیں الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم لوگ پاکیزہ مشروب نوش جاں فرماتے ہو" مغل شہنشاہ نے جھنجلا کر کہا۔

"چند روز کی بادشاہت کے مالک' کون کہتا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں" شاہ حسین

نے بے خوف لہجے میں کہا "پوچھ اپنے مخدوم الملک سے، وہ سامنے بیٹھا ہے، میری شراب کی ماہیت کیا تھی؟" درویش نے صراحی میں سے جام بھرا "تو بادشاہ ہے اور یقینا شراب کے ذائقے سے آشنا بھی، لے چکھ میری شراب، مخدوم الملک نے سات بار آزمایا تُو آٹھ بار آزما دیکھ۔"

درویش نے جام اکبر کو پیش کیا۔ سیال شے کا رنگ و روپ بنت عنب جیسا تھا مگر جب شہنشاہ نے تجسّس سے مجبور ہو کر جام ہونٹوں سے لگایا تو بے ساختہ پکار اٹھا "یہ تو صاف شفاف پانی ہے" اب شہنشاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "آسی صراحی میں سے ایک جام اور پیش کیا جائے مابدولت بنفس نفیس اس تجربے سے گزرنا چاہتے ہیں۔"

شاہ حسین نے صراحی میں سے قلیل مقدار میں مشروب جام میں انڈیلا اور مغل شہنشاہ کو پیش کیا۔ اب مشروب کا نہ صرف ذائقہ بدل چکا تھا بلکہ رنگت بھی یکسر تبدیل ہو چکی تھی، وہ خالص دودھ بن چکا تھا۔ بادشاہ حیرت میں ڈوب کر ابھرا بھی نہ تھا کہ شاہ حسین نے تیسرا جام پیش کیا، چکھا گیا تو وہ نہایت خوشبودار صندل کا شربت نکلا۔ اس طرح آٹھ جام پیش کئے گئے۔ ہر جام ذائقے، خوش بو اور رنگت میں مختلف نکلا اور خاص بات یہ کہ کوئی ایک بھی نشیلا نہیں تھا۔ شہنشاہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "درویش، ایک صراحی میں آٹھ مختلف ذائقے اور رنگ کیسے سما گئے جو تیرے اختیار میں ہیں؟"

شاہ حسین نے جواب دیا۔

گفت بگرزازیں و ہیچ پرس، وحدت فقربیں و ہیچ پرس

(اس بات کو نظرانداز کر جا اور کچھ مت پوچھ، فقر کی وحدت کا نظارہ کر بغیر کسی سوال کے)

بھرے دربار پر سناٹا تھا۔ بادشاہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا کرتا تھا، اس بار سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا مگر وہ حاکم ہی کیا جو ہٹ دھرم نہ ہو۔ اسے ہی "راج ہٹ" کہتے ہیں۔ شاہ حسین تو بھرے دربار کو حیران و ششدر چھوڑ کر اپنی راہ ہو لئے۔ شہنشاہ راج سنگھاسن پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے گرج کر حکم دیا "یہ دربار اکبری کی توہین ہے۔ فقیر کو روک لیا جائے۔

شاہ حسین زیب لب مسکرائے اور خود پلٹ کر تخت اکبری کے سامنی آ کر کھڑے ہو گئے۔

"مشروبات کے ذائقے اور رنگ تبدیل کرنا، کیا یہی "چمتکار" ہیں درویش کے قبضہ قدرت میں؟" شہنشاہ نے تمسخر اڑایا۔ یہی چالاکی تو نے مخدوم الملک کو دکھائی، میں اس مکر و فریب میں آنے والا نہیں، کوئی کرامت ہے تو پیش کر ورنہ......." کچھ سوچ کر اکبر خاموش ہو گیا۔ شاید اسے کوتوال شہر، ملک علی کا انجام یاد آ گیا یا وہ تجسّس برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

"بادشاہ! ضد نہ کر رسوائی سے دامن بچا اور مجھے جانے دے" شاہ حسین نے بڑی نرمی سے سمجھایا۔ "کرامت کا ظہور حق تعالیٰ کی رضا سے ہوتا ہے فقرا کی مرضی پر منحصر نہیں ہوتا" درویش کی گفتگو بے سود ثابت ہوئی اور شہنشاہ نے حکم صادر فرما دیا "شاہ حسین کو زندان میں ڈال دیا جائے اور در زنداں اس وقت تک نہ کھولا جائی جب تک یہ نئ کرامت دکھانے پہ راضی نہ ہو جائے۔" عجیب واہیات صورت حال تھی۔ درویش مسکرا رہا تھا اور شہنشاہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اس طرح شاہ حسین کو قید خانے میں ڈال دیا گیا اور زندان کے گرد سخت پہرے کا انتظام کر دیا گیا۔ یہ کارنامہ سرانجام دے کر مغل شہنشاہ مکروہات زمانہ میں مشغول ہو گیا۔ شام کو دربار برخواست ہوا۔ رات گئے اکبر اعظم جب حرم میں داخل ہوا تو حیرت اس کی منتظر تھی۔ شاہ حسین حرم سرا کی نازنینوں کے جھرمٹ میں راجا اندر بنے بیٹھے ہیں اور عشوہ طراز حسنائیں ناز و ادا سے دلربائی میں مصروف ہیں۔ بادشاہ کا رنگ فق ہو گیا "یہ فریب نظر ہے" اس نے سوچا۔ "درویش اس حد تک نہیں جا سکتا" پھر اسے شاہ حسین کی دربار والی تقریر یاد آئی "آنکھ کی شہادت نامعتبر ہے" بادشاہ مضطرب تھا، حیران و پریشان تھا اور پشیمان بھی۔ وہ الٹے پاؤں واپس ہوا، داروغہ زندان کو طلب کیا پھر خود..... بنفس نفیس بندی خانے کا معائنہ کرنے تشریف لے گیا۔ سارے قفل جوں کے توں لگے ہوئے تھے۔ زندان کے قریب پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ قفل کھولے گئے، در زنداں وا ہوا مگر خالی کمرا سب کا منہ چڑا رہا تھا "قیدی آزاد ہو گیا مگر کیسے؟" یہی ایک سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

"قیدی کو فوراً شہر میں تلاش کیا جائے اور پابجولاں حاضر کیا جائے" یہ حکم دے کر شہنشاہ محل کو لوٹ گیا مگر حرم سرا میں جانے کی اس میں سکت نہ تھی۔ سارا معاملہ اس کی سمجھ سے بالاتر ثابت ہو رہا تھا۔ کسی کو "شریک غم" کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ بات

ہونٹوں تک آ آ کر رک جاتی تھی۔ کسی کو خبر ہو جاتی تو غیرت تیمور کا جنازہ نکل جاتا۔ سارے شہر میں پیادے گشت کر رہے تھے۔ گوشہ گوشہ چھانمارا گیا مگر گوہر مقصود ہاتھ آنا تھا نہ آیا۔

نصف شب کے قریب بادشاہ حرم سرا میں داخل ہوا تو شاہ حسین ایک ستون کی آڑ میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ شہنشاہ اکبر ٹکٹکی باندھے درویش کو دیکھنے لگا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی پھر بھی پوچھے بغیر نہ رہ سکا "درویش' یہ....... یہ کیا معاملہ ہے؟؟"

"تو کرامت دیکھنے کا شوقین تھا۔ کا مزید رسوا ہونا چاہتا ہے؟" دونوں مہر بہ لب ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مہر سکوت پھر شاہ حسین نے توڑا "میں تجھے کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا پھر تو مجھے کیوں تنگ کر رہا ہے؟ فقیر کا تیرے دربار سے کوئی تعلق واسطہ نہیں دوسرے میرے اعمال کا حشر میں' تُو ذمے دار نہیں' نامہ اعمال سیاہ ہو گا تو میرا' جواب دہ میں ہوں گا۔ لوح محفوظ پر جو لکھا ہے اسے ہونے دے اور میرے راستے سے ہٹ جا۔ آئندہ مجھے دربار میں طلب کیا یا مجھ سے کرامت کی فرمائش کی تو رسوا ہو جائے گا اور یہ رسوائی سرعام ہو گی" مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر ندامت سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پشیمان اس لئے تھا کہ شاہ حسین نے رسوائی والی بات بھرے دربار میں کہی تھی۔ مگر عقل سے پیدل شہنشاہ کی سمجھ میں نہ آسکی تھی اور عرق ندامت چننے والی صرف شان کریمی تھی جس کی رضا کے خلاف وہ عمل پیرا ہوا تھا۔ شاہ حسین بادشاہ کو اس کیفیت میں مبتلا چھوڑ کر حرم سرا سے نکل گئے۔ اب شہنشاہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خواجہ سراؤں کو درویش کی گرفتاری کا حکم دیتا۔ جب اس کے بنائے ہوئے زندان کی چاردیواری ہی بے وفا ثابت ہوئی تھی تو اب وہ ہوا کے قلعے میں تو فقیر کو مقید کرنے سے رہا۔

دوسرے روز بادشاہ نے اپنی الجھن اپنے وزیر باتدبیر ابوالفضل سے بیان کی اور رات والا قصہ مناسب الفاظ میں اسے سنایا۔ ابوالفضل نے کہا "سچا درویش حقیقت توحید سے آگاہ ہو جانے کے بعد ایسی صفات کا حامل ہو جاتا ہے جو احاطہ عقل سے باہر ہوتی ہیں اور وہ خرق عادت اعمال پر قادر ہو جاتا ہے۔ یہ مقام بے حد دشوار ہے مگر ناممکنات میں سے نہیں۔"

"مگر گناہ تو ہر حالت میں گناہ ہے" مغل شہنشاہ نے نئی الجھن پیش کی۔

"فقرا اسے گناہ و ثواب کی دوئی کہتے ہیں، ان کے خیال میں، یہ دوئی بھی ناروا ہے مگر اصل بات یہی ہے کہ سچا درویش گناہ کا مرتکب نہیں ہو رہا ہوتا وہ گناہ کی اداکاری کر رہا ہوتا ہے جیسے حضور نے ملاحظہ فرمایا کہ شاہ حسین کا مشروب نشے سے پاک تھا۔"

بادشاہ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ نہیں، اس کے متعلق تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ کوتوال شہر ملک علی، مخدوم الملک والے واقعات اور اپنی "آپ بیتی" کے پیش نظر اس کے دل پر شاہ حسین کی ہیبت طاری ہو گئی جسے اس نے "احترام" کا نام دیا اور پھر کبھی اسے دربار میں طلب نہیں کیا اور نہ وہ "مصلحت" کے پیش نظر دربار درویش میں حاضر ہوا۔ لوگوں میں یہی مشہور تھا کہ مغل شہنشاہ اکبر، شاہ حسین کا معتقد ہے۔ یہ بات بھی مستند ہے کہ اکثر مہمات کو سر کرنے سے پہلے اکبر بادشاہ نے شاہ حسین سے "دعا" کی درخواست ضرور کی۔

عوام لناس تو شاہوں کے "دین" پر ہوتے ہیں۔ شہنشاہ کے رجحان طبع کے پیش نظر درباری بھی شاہ حسین کی عقیدت کا دم بھرنے لگے، کچھ صدق دل سے اور کچھ خوشنودی شاہ کی خاطر۔ شہزاد سلیم تو فی الحقیقت شاہ حسین کا والہ و شیدا تھا۔ اس نے درویش کے فرمودات کو قلم بند کرنے کی خاطر اپنا ایک انشاپرداز مقرر کر دیا جس کا نام بہار خاں تھا۔ وہ ہر وقت شاہ حسین کی خدمت میں حاضر رہتا اور مختلف مواقع پر درویش کی زبان سے ادا ہونے ولے کلمات کو سپرد قلم کر لیتا۔ یہی فرمودات بعد میں "بہاریہ" نامی کتاب کی شکل میں اشاعت پذیر ہوئے۔ مغل شہنشاہ اکبر نے بعد میں ایسے احکامات جاری کئے جن سے شاہ حسین کی قدر و منزلت میں (بزعم خود) اضافہ کیا مگر اس کے باوجود درویش کبھی دربار میں حاضر نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ شہزاد مراد اور دانیال بھی حلقہ عقیدت میں شامل ہو گئے۔ حرم کی اکثر خواتین بھی ارادت مندی میں کسی سے کم نہ تھیں۔ وزراء و احراء میں شیخ ابوالفضل، خواجہ دولت خاں، شیخ عبدالرحمان، خان خاناں مرزا عبدالرحیم، خان اعظم آصف خاں، جعفر بیگ زین خاں کوکلتاش (ترکی زبان میں کوکلتاش بمعنی شاہ کا دودھ شریک بھائی) شہباز خاں کنبوہ اور فلک موسیقیکا آفتاب تان سین ارادت اور عقیدت شاہ حسین سرفہرست ہیں۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں جن حالات میں حلقہ بگوش عقید ہوا اس کی تفصیل پیش

خدمت ہے۔

مرزا موصوف، بیرم خان کا قابل صد افتخار فرزند ۱۵۵۶ء لاہور میں پیدا ہوا۔ اس طرح شاہ حسین اور عبدالرحیم خان خاناں دونوں لاہوری تھے۔ اسی سن میں اکبر نے ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالی۔ عہد اکبری میں مغلیہ سلطنت کو استقامت بخشنے والی شخصیت بیرم خاں ہی کی ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر کے ابتدائی دور میں بیرم خاں نے جو خدمات سرانجام دیں وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ اکبر کے بھائیوں، چچاؤں کی بغاوتیں ہمو بقال سے جنگ، ان تمام مشکلات پر اکبر نے بیرم خاں کی مدد ہی سے قابو پایا۔ اس کے علاوہ مغل شہنشاہ اکبر سے بیرم خاں کا ایک اور رشتہ بھی تھا۔ اکبر اعظم کا باپ نصیر الدین ہمایوں ایک میواتی سردار کی صاحب زادی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا اسی سردار کی دوسری صاحب زادی، بیرم خاں کے عقد میں آئی اس طرح دونوں زلف ٹھہرے۔ بیرم خاں فوت ہوا تو اس کا لخت جگر عبدالرحیم خان خاناں صرف چار برس کا بچہ تھا اس طرح مرزا موصوف کی پرورش اکبر کی زیر سرپرستی شاہی محل میں ہوئی۔ لہٰذا مرزا موصوف اپنے باپ کی طرح اکبر کا قابل اعتماد اور وفادار سپہ سالار ثابت ہوا۔ اس کی شادی بھی خان اعظم کوکا خان ک بیٹی ماہ بانو سے ہوئی۔ عبدالرحیم خان خاناں کا اصل عروج دکن کی مہمات سر کرنے کے بعد ہوا۔ سلطان مظفر گجراتی کو بھی عبدالرحیم خان خاناں ہی نے شکست دی اور پنج ہزاری منصب کے علاوہ "خان خاناں" کا خطاب حاصل کیا۔

مغل شہنشاہ اکبر ہر حیلے وسیلے سے سندھ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ تو یقیناً" ملک گیری کی ہوس تھی مگر اس کے علاوہ بھی سندھ میں اکبر کی دلچسپی کی تین بڑی وجوہات قرار دی جا سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ اسی سرزمین پر بمقام امرکوٹ پیدا ہوا۔ اس زمانے میں مغل شہنشاہ ہمایوں دربدر اور خاک بسر ہو رہا تھا۔ ستارے گردش میں تھے، حالات کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہی کہ نومولود اکبر کے لئے جو لباس تیار کیا گیا وہ سید علی ثانی ایک درباری کے استعمال شدہ لباس سے بنایا گیا تھا۔ اس بات کو اکبر کبھی فراموش نہ کر سکا۔ سرزمین سندھ کو وہ اپنی "جنم بھومی" کہا کرتا تھا اور اس زمین پر کسی اور کا قبضہ دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری سندھ میں دلچسپی کی وجہ وہاں کے مقامی حکمرانوں کا ناپسندیدہ رویہ تھا اور تیسری وجہ غیر ملکی فرنگیوں یعنی پرتگیزیوں کی

سندھ میں مداخلت تھی۔ یہ آخری دو وجوہات تفصیل طلب ہیں۔

۱۵۵۵ء یعنی مغل شہنشاہ اکبر کے تخت نشین ہونے سے ایک برس پیشتر عیسیٰ خان ترخان ٹھٹھہ کا حکمران بنا۔ یہ ایک بیدار مغز حکمران تھا جو ہر حکمران کی طرح ملک گیری کی ہوس میں مبتلا تھا۔ چنانچہ جن دنوں اکبر اپنے ابتدائی دور کی مشکلات پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا حاکم ٹھٹھہ نے اپنے جوشیلے بیٹے مرزا باقی خاں کے ساتھ مل کر بکھر کا محاصرہ کرلیا۔ ہند میں رفتہ رفتہ مستحکم ہونے والی مغلیہ سلطنت کو وہ تشویش کی نگاہ سے دیکھتا تھا لہٰذا مورخین کے بقول اس نے بیرونی طاقت پرتگیزوں سے سازباز کر رکھی تھی۔ پرتگیزی فوج "برتپو" نامی کمانڈر کی زیر سرکردگی' لاہری بندر عبور کر کے ٹھٹھہ پہنچی۔ یہاں سنہری موقع ان کا منتظر تھا۔ یعنی شہر میں نہ حکمران تھا نہ فوج۔ نہتے شہریوں کو دیکھ کر پرتگیزی فوج کی نیت خراب ہو گئی اور گلی کوچوں میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ عیسیٰ خان ترخان کو خبر ہوئی تو وہ بکھر کی مہم کو ادھورا چھوڑ کر ٹھٹھہ پہنچا مگر پرتگیزی لٹیرے اپنا کردار بخوبی ادا کر کے جا چکے تھے۔ مغل شہنشاہ اکبر کے لئے پرتگیزی مداخلت لمحہ فکریہ تھی۔ سندھ اگرچہ اس کی قلمرو کا حصہ نہیں تھا مگر بیرونی طاقت ہندوستان کے دروازے پر دستک دے چکی تھی۔ ادھر مغل افواج میں بحری فوج کا تصور ناپید تھا۔ لہٰذا حملہ آور کے تعاقب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر لحاظ سے یہ صورت حال مغل بادشاہ کے لئے ناخوشگوار تھی۔ عیسیٰ خان ترخان کے عہد حکومت میں ناگزیر وجوہات کی بنا پر سرزمین سندھ مغلوں کی دسترس سے محفوظ رہی۔ عیسیٰ خاں کے بعد مرزا باقی ٹھٹھے کا حکمران بنا۔ یہ بدترین انسان ثابت ہوا۔ اس اذیت پسند شخص نے ظلم وستم کا بازار گرم کیا۔ معمولی خطا کی پاداش میں ایذا رسانی کے نت نئے تجربات کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اکبر کو حملے کا جواز میسر آگیا۔ عوام الناس نے بلاامتیاز مذہب و ملت مرزا باقی کے ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جس کی گونج دربار اکبری میں سنائی دی مگر مغل حملے سے پیشتر مرزا باقی نے طاقتور شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی لاڈلی صاحب زادی "سندھی بیگم" کو قربان کر دیا۔ دربار اکبری کے لئے جو تحائف بھیجے گئے ان میں "سندھی بیگم" بھی شامل تھی۔ جو داخل حرم ہوئی۔ اکبر نے دوسرے تحائف رد کر دیئے اور سندھ پر حملے کا فیصلہ کیا۔ اس بار یہ حملہ ممتاز درباری سید جلال کی

مداخلت سے ملتوی ہا۔ سید جلال کی بات رد کرنا' مغل شہنشاہ کو ناپسند تھی کیوں کہ سید موصوف کے والد بزرگوار سید علی عثمان کے مستعمل لباس سے نومولود اکبر کا تن ڈھانپا گیا تھا جسے مغل شہنشاہ' عمر بھر فراموش نہ کر سکا۔ اکبر کو تخت نشین ہوئے انتیس برس ہو چکے تھے۔ مغل فوج مرزا باقی کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جا سکتی تھی مگر ایسا نہ ہو سکا اور مرزا باقی نے ۱۵۸۵ء میں خودکشی کر کے زنجیر ستم کو اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا۔

مرزا باقی کے بعد مرزا جانی بیگ ٹھٹھہ کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ مجموعہ اضداد قسم کی شخصیت کا حامل تھا۔ جنگ جُو اور انا پر مر مٹنے والا' مزاجا خودمختار انسان تھا۔ اکبر شہنشاہ کی دہشت اس پر بھی سوار تھی۔ عنان حکومت سنبھالتے ہی اس نے درباری اکبری میں تحائف بھیجے۔ اظہار نیازمندی کے بعد مرزا جانی بیگ مطمئن ہو گیا۔ پھر جانے کیا ہوا کہ جملہ اوصاف حمیدہ کو ترک کر کے' ننگ انسانیت عادات و اطوار میں مبتلا ہو گیا۔ ایسے اطوار جن کے تصو ہی سے گھن آئے۔ خوب رو لڑکوں کو نسوانی لباس پہنا کر محل کی زینت بناتا اور لواطت کا بڑے فخریہ انداز میں اعلان کرتا۔ ان بدافعال کی رپورٹ بھی دربار اکبری میں پہنچی۔ سلطنت مغلیہ کوئی اسلامی و فلاحی مملکت نہ تھی صرف شخصی حکومت تھی مگر مرزا جانی بیگ تو دائرہ انسانیت ہی سے خارج ہو چکا تھا لہٰذا اس کی گوشمالی ضروری تھی۔ اکبر نے بکھر کے حاکم محمد صادق خاں کو فرمان بھیجا کہ حاکم ٹھٹہ کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ ادھر مرزا جانی بیگ کو خبر ہوئی تو وہ مرنے مارنے پر تیار ہو گیا۔ مغلیہ دہشت کا طلسم اس وقت ٹوٹ کر بکھرا جب جانی بیگ نے حریف کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اس کے حقیقی بھائی مرزا مظفر نے اختلاف کیا تو جانی بیگ نے اسے بھی نیست و نابود کر دیا۔ زبردست جنگ کے بعد نہ صرف اسے شکست فاش سے ہمکنار کیا بلکہ سندھ ہی سے بھگا دیا۔ ان حالات میں مغل شہنشاہ اکبر نے اپنے ترکش کے تیروں کو جانچا پرکھا اور مناسب ترین تیر' مرزا جانی بیگ کی طرف چلا دیا۔ اس طرح عبدالرحیم خان خاناں بکھر کا گورنر ہوا اور وہ پوری تیاری سے سرزمین سندھ میں داخل ہوا۔

خان خاناںؒ کو بخوبی علم تھا کہ مرزا جانی بیگ پر قابو پانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے استاد مکرم ابوالفضل سے مشورہ کیا۔ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ اس مہم کو سر کرنے کے لئے مغل فوج کے علاوہ روحانی معاونت کی بھی اشد ضرورت

ہے۔ خان خاناں، ابوالفضل کا بیحد احترام کرتا تھا۔ اس نے مزید پوچھا۔ "استاد محترم! اس وقت کون ایسا درویش بے ریا ہے جو میری مدد کر سکتا ہے۔"

ابوالفضل نے بلا تامل کہا "اس زمانے میں شاہ حسین ہی وہ مرد کامل ہے جو اگر تمہیں گالی سے بھی نواز دے تو سمجھو گوہر مقصود حاصل ہو گیا۔"

شاہ حسین کا نام سنتے ہی خان خاناں نے چونک کر ابوالفضل کی طرف دیکھا۔ "استاد مکرم، وہ تو ننگی تلوار ہیں، دوسرے امراء وزراء سے ملنا گوارا نہیں فرماتے۔"

"اسی لئے تو اُن سے ملاقات بے حد ضروری ہے۔" ابوالفضل نے سمجھانے والے انداز میں کہا "اگر وہ درباری سرکاری افراد کو منہ لگانے لگیں تو یقین جانو ہم دنیادار لوگ ان کا جینا حرام کر دیں اسی لئے تو وہ حکام اعلیٰ و ادنیٰ کو دھتکار دیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے اس معاملے میں شاہ حسین تمہیں مایوس نہیں لوٹائیں گے۔" عبدالرحیم خان خاناں کا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ درویش اسے کلمہ خیر سے ضرور نوازے گا لہٰذا ان دونوں حضرات نے دربار شاہ حسین میں حاضری کا فیصلہ کیا۔

اتفاق سے اس رات شاہ حسین نے دوست احباب کی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا اور کام و دہن کی تواضع کے لئے میٹھے نان تیار کروائے تھے۔ محفل رقص و سرود بھی تھی۔ اچانک شاہ حسین نے اپنے مرید خاص سے کہا۔ "دو عدد نان بچا کر رکھ لئے جائیں۔" یہ حکم خلاف دستور بھی تھا اور خلاف توقع بھی کیوں کہ آنے والے وقت کے لئے رزق وغیرہ بچا کر رکھنا یا رزق کی فکر میں مبتلا ہونا مسلک حسینی کے خلاف تھا۔ بہرحال مریدان باوفا یہ بھی جانتے تھے کہ حکم درویش میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے لہٰذا دو نان بچا کر رکھ لئے گئے۔ محفل ناؤنوش اختتام پذیر ہوئی۔ رات بھیگتی رہی، شاہ حسین مختلف موضوعات چھیڑتے رہے۔ نصف شب کے قریب دروازے پر دستک ہوئی تو درویش نے مسکرا کر کہا۔ "دروازہ کھول دو نان کھانے والے آ پہنچے۔" در حجرہ وا ہوا تو ابوالفضل اور عبدالرحیم خان خاناں بصد احترام اندر داخل ہوئے اور دست بستہ فقیر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"ابوالفضل! تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے؟" شاہ حسین نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آج اس سگ دربار کو بھی ساتھ لے آئے۔"

"حضور! جہاں سی روٹی بوٹی کی امید ہو کتے وہیں دمیں ہلاتے آئیں گے۔" ابوالفضل نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا! روٹی کھاؤ بوٹی کے متعلق سوچیں گے۔" شاہ حسین نے زیرلب مسکرا کر کہا' جبین ناز کی شکن دور ہوئی تو ابوالفضل نے خان خاناں کو اشارہ کیا کہ حرف مدعا زبان پر لائے مگر اس سے پہلے شاہ حسین لب کشا ہوئے "آوارہ کتے کی آوارگی حد سے تجاوز کر چکی ہے' ٹھٹھہ شہر کے در و دیوار بھی مغموم ہیں' نان کھاؤ بوٹی بھی مل جائے گی۔"

"حضور! بوٹی کے بغیر روٹی کی خیرات اس دربار کی شان کے خلاف ہے۔" عبدالرحیم خان خاناں جرأت رندانہ سے لب کشا ہوا۔

"ارے! اس سگ دربار کو تو بھونکنا بھی آتا ہے۔" شاہ حسین نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ "خوب مزہ آئے گا آگے آگے ہڑکایا ہوا غلیظ کتا پیچھے پیچھے ریشمی لباس پہنے سگ شاہ۔"

"حضور' سگ شاہ حسین زیادہ مناسب ہے۔" خان خاناں نے سرنیاز فقیر کے قدموں پر رکھ کر کہا اور طلائی سکوں سے بھری تھیلی بھی پیش کی۔

"رحیم کے بندے' ٹھٹھہ تمہارے نام ہو گیا مگر یہ رشوت والی حرکت اچھی نہیں' اٹھاؤ یہ تھیلی اور باہر بیٹھے ہوئے غرباء میں تقسیم کر آؤ۔" درویش نے یہ نوید سنائی تو ابوالفضل طلائی سکوں سے بھری تھیلی لے کر باہر لپکا۔ "مبارک ہو رحیم کے بندے (عبدالرحیم) مرزا جانی بیگ شکست سے ہم کنار ہوا۔ انشاء اللہ ٹھٹھہ تمہارے ہاتھوں فتح ہو گا۔" جاتے جاتے ابوالفضل نے اپنے شاگرد کو خوش خبری سنائی۔ پھر دونوں نے بڑی رغبت سے نان کھائے اور مسرور و مطمئن حجرہ فقیر سے رخصت ہوئے۔ حقیقت الفقرا میں اس ملاقات کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔

داد شاں نان و داد ہم دشنام
شیخ آگاہ بود کرد سلام

(یعنی شاہ حسین نے دونوں کو نان بھی دیئے اور گالیوں سے بھی نوازا۔ شیخ ابوالفضل انداز دروش سے بخوبی واقف تھا لہٰذا اس نے اظہار تشکر کے طور پر شاہ حسین کی خدمت میں سلام پیش کیا۔"

خان خاناں مسرور و مطمئن لاہور سے روانہ ہوا۔ ملتان پہنچا تو اسی وسوسوں نے آ گھیرا۔ لہٰذا مزید معاونت کے لئے مزار بہاؤالدین زکریا پر حاضر ہوا اور فاتحہ خوانی کے بعد حرف مدعان زبان پر لایا۔ اس زمانے میں شیخ کبیر المعروف بالا پیر سجادہ نشین تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو خان خاناں نے طلائی سکوں کی تھیلی بطور نیاز پیش کی۔ بالا پیر نے وہ رقم قبول کرلی مگر دوسرے دن وہ تھیلی جوں کی توں واپس بھجوا دی۔ خان خاناں تو دھک سے رہ گیا۔ بھاگم بھاگ شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ”کیا ٹھٹھہ کی فتح میری قسمت میں نہیں؟“ اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”عزیزم! یہ بات نہیں۔“ شیخ کبیر نے تسلی دی۔ ”رات ہمارے پیر و مرشد (بہاؤالدین زکریا) نے عالم خواب میں مطلع کیا کہ شاہ حسین ٹھٹھہ کی حکمرانی تمہیں سونپ دی ہے اور اس کے لئے تم نے پانچ سو روپے کی رقم فقراء میں بانٹ دی لہٰذا نذر قبول ہوئی اب اسی کام کے لئے جو پہلے ہی ہو چکا ہے، تمہاری نذر کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔ یہ اصول کی خلاف ورزی ہے۔ ہم یہ رقم اپنے جد اعلیٰ کے حکم سے واپس کر رہے ہیں۔“

عبدالرحیم خان خاناں تو ورطہ حیرت میں ڈوب گیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اسے وسوسوں سے مکمل نجات مل گئی اور وہ درویش لاہور کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ مرزا جانی بیگ اور خان خاناں کی معرکہ آرائی کی مکمل تفصیل ”تاریخ سندھ“ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ جس کا متن کچھ اس طرح ہے کہ مرزا جانی کو خان خاناں کی یلغار سے مطلع کیا گیا تو اس نے مجلس مشاورت طلب کی۔ بہی خواہوں نے مرزا باقی کی بیٹی سندھی بیگم کی معاونت سے (جو حرم شاہی میں داخل ہو چکی تھی) اس جنگ سے دامن بچانے کا مشورہ دیا مگر مرزا جانی بیگ نے اسے شیوہ مردانگی کے خلاف قرار دیتے ہوئے رد کر دیا۔ اس کے اصل الفاظ تھے۔ ”سخاوت و شجاعت کا دعویٰ کرنے والے عورتوں کا سہارا نہیں لیا کرتے۔ حکمرانی اور عیش عشرت آنی جانی اشیا ہیں، وہ حضرات جو اس جنگ سے دامن بچانا چاہتے ہیں ان کو میری طرف سے اجازت ہے، جہاں چاہیں چلے جائیں۔“

مرزا جانی بیگ کی ان صفات کی بنا پر اسے مجموعہ اضداد شخصیت کا نام دیا گیا ہے۔ وہ دل کا سخی، بہادر بھی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ننگ انسانیت لواطت جیسی گھناؤنی حرکات کا مرتکب بھی۔ اس نے ایسے ایسے شریف خاندانوں کو رسوا کیا جن کا تذکرہ بھی (اس

ضمن میں) سوئے ادب ہے۔ بہرحال ٹھٹھہ دربار میں مغل فوج سے ٹکرا جانے کا فیصلہ ہوا۔ مرزا موصوف نے اپنے دست راست رستم بیگ کو لشکر عظیم کے ساتھ سیوں شریف کی طرف روانہ کیا اور خود نصرپور وضع بوہری کے وسیع و عریض میدان میں فروکش ہوا۔ خان خاناں بھی پوری تیاری سے مقابل آیا۔ ۶ محرم ۱۰۰۰ھ میں میدان کارزار گرم ہوا۔ کاندھوں سے کٹ کٹ کر سر جدا ہونے لگے۔ چوٹ برابر کی تھی، کبھی ایک کا پلہ بھاری ہو جاتا کبھی دوسرے کا۔ یہ جنگ بڑی طویل ثابت ہوئی۔ ہر طلوع ہونے والا سورج نیا تماشا دیکھتا۔ مرزا جانی بیگ نے قرب و جوار کے علاقوں میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص مغل فوج کے کسی سپاہی کا سر کاٹ کر پیش کرے گا اسے پانچ صد "کبر" بطور انعام پیش کئے جائیں گے۔ اس جنگی چال نے غضب ڈھایا۔ سندھ کے غریب عوام انعام کے لالچ میں مغل سپاہیوں کا "شکار" کرنے لگے۔ خشکی کے راستے سے آنے والا مغل فوج کا خزانہ بھی مرزا جان بیگ نے لوٹ لیا اور دشمن کی دولت، دشمن کے خلاف استعمال ہوئی۔ نوبت بہ اں جارسید کہ دونوں سربراہوں نے ایک دوسرے پر فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کرلیا۔ مرزا جانی بیگ کے سپاہیوں نے اپنی پگڑیوں میں درختوں کی سبز شاخیں سجالیں اور مغل فوج کے افراد نے اپنی پگڑیوں میں تیر لگائے تاکہ قتل و غارت کا بازار گرم ہو تو دوست دشمن کی پہچان ہو سکے۔ اس طرح دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہوئے۔ ابتداء میں مرزا جانی بیگ کا پلہ بھاری رہا۔ خان خاناں کا لشکر نیست و نابود ہو رہا تھا۔ میمنہ و میسرہ پسپا ہو چکے تھے۔ سالار لشکر اندیشوں میں مبتلا تھا کہ انہونی کا آغاز ہوا۔

جانی بیگ کا ایک فیل مست جو دشمن کی صفیں درہم برہم کر رہا تھا اچانک پلٹ کر اپنی فوج میں گھس گیا اور ایسی تباہی مچائی کہ اپنے پرائے حیران رہ گئے۔ دوسری حیران کن بات یہ ہوئی کہ مرزا جانی بیگ کی فوج کے عین سامنے تیز و تند آندھی چلنے لگ جس کا رخ "مرزائی" فوج کی جانب تھا۔ یقینی فتح، شکست میں تبدیل ہونے لگی۔ فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مرزا جانی بیگ نے راہ فرار اختیار کرنے سے صاف انکار کر دیا مگر وفادار سرداروں نے منت سماجت سے اسے قائل کیا اور بذریعہ کشتی "انٹر" پہنچا دیا۔ فوج کا بیشتر حصہ میدان جنگ میں کام آیا۔ باقی جو بچا وہ منتشر ہو گیا۔

مرزا جانی بیگ ہار ماننے والوں میں سے نہ تھا۔ اس نے پھر فوج کے منتشر افراد کو

ایک مرکز پر جمع کیا اور "انٹر" کے گرد خندقیں کھود کر حریف کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ الغرض متعدد معرکہ آرائیوں کے بعد' عبدالرحیم خان خاناں حریف پہ قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ ۱۰۰۱ھ میں اسے دربار اکبری میں پیش کیا گیا۔ اکبر نے جانی بیگ کی عنایت و نوازش سے دل جوئی کی۔ منصب پنج ہزاری عطا کیا۔ جہانگیر کے بیٹے خسرو سے اس کی صاحب زادی کی شادی ہوئی۔ سیہون اور لاہری بندر سلطنت مغلیہ میں شامل کر کے باقی مفتوحہ علاقہ جانی بیگ کو بطور جاگیر عطا کر دیا گیا۔ ۱۰۰۹ھ یعنی شاہ حسین کی وفات حسرت آیات کے ایک برس بعد مرزا جانی بیگ کا برہانپور میں انتقال ہوا۔

عبدالرحیم خان خاناں اور شاہ حسین میں ایک قدر مشترک ایسی بھی تھی جس ک بنا پر درویش اسے پسند کرتا تھا۔ وہ فارسی' ہندئی' سندھی اور میواتی زبان میں شاعری کرتا تھا۔ سخن شناسی کے علاوہ سخن پرست ایسا کہ شعرا کو دولت میں تول کر نوازتا۔ اس کی سخاوت کے قصے اس کی زندگی ہی میں زبان زد خاص و عام ہوئے۔ ایک روز ملا نظیری نیشاپوری نے عجیب و غریب خواہش کا اظہار کیا۔ "جناب' یہ ایک لاکھ روپے کا ڈھیر کتنا بڑا ہوتا ہے' میں نے سن رکھا ہے کہ اس ڈھیر کے سائے میں کتا بیٹھ سکتا ہے۔"

"مولانا کتے وتے کے بیٹھنے کے متعلق تو یہ ناچیز کچھ نہیں جانتا البتہ لاکھ روپے کا ڈھیر ابھی دکھائے دیتے ہیں۔" یہ کہا اور اپنے میر منشی کو ایک لاکھ روپیہ حاضر کرنے کا حکم دیا۔ کھلے میدان میں روپیہ ڈھیر کر دیا گیا۔ ملا نظیری ٹکٹکی باندھے اس "جلوگی" سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ "تو یہ ہے ایک لاکھ' واہ' صاحب واہ۔" کافی دیر وہ سر دھنتے اور خوش ہوتے رہے۔ "جناب آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے میری تمنا پوری کی' خدا آپ کو خوش رکھے۔" مولانا شکریہ ادا کر کے جانے لگے۔

"حضور' کہاں چل دیئے؟" خان خاناں نے زیرلب مسکرا کر کہا۔ "اپنی اس چھیتی "مصیبت بیگم" کو بھی تو ساتھ لیتے جایئے۔" اشارہ دولت کے انبار کی طرف تھا۔

"کیا مطلب جناب؟ یعنی یہ ساری دولت گویا میری ہوئی؟" مولانا کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر وہ "مزاج خاناں" سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ اس طرح لاکھ روپیہ باتوں ہی باتوں میں خان خاناں نے "دان" کر دیا۔ شاہ حسین کو اپنے عقیدت مند کی یہ ادا دل سے پسند تھی۔

سندھ والی مہم کے دوران ایک روز عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ایک مقامی 'تک بند شاعر' خان خاناں کی سخاوت کا سن کر ایک قصیدہ لکھ لایا۔ عبدالرحیم نے قصیدہ بڑے غور سے سنا۔ مقامی شاعر نے اپنا تعارف کراتے وقت انکشاف کیا کہ وہ رحیم اور رحمان تخلص کرتا ہے۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی کیونکہ یہ دونوں تخلص خان خاناں کے تھے مگر شاعر کی بے تکی باتیں سن کر بھی وہ مروت میں خاموش رہا۔ قصیدے کے اختتام پر مقطع پڑھنے سے پہلے 'تک بند شاعر نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "حضور! میرا مقطع ایک لاکھ روپے کا ہے" اور پھر بڑی ڈھٹائی سے عبدالرحیم خان خاناں کا مشہور زمانہ شعر پڑھ دیا۔

یہن کاٹے دھوئیے' کھایئے آدھک پیاس
رحمٰن پیت سراہیے موئے میت کی آس

(مچھلی کاٹ کر صاف کی جائے تو پانی درکار ہوتا ہے کھائی جائے تو پیاس ستاتی ہے۔ (گویا مچھلی پانی میں رہتی ہے اور مرنے کے بعد بھی پانی ہی طلب کرتی ہے) رحمٰن ایسی محبت پر آفرین جو فنا کے بعد بھی اتنی شدید طلب کی حامل ہو)

یہ دوہا آج بھی ضرب المثل کا درجہ رکھتا ہے مگر خان خاناں نے شعر سن کر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور شاعر کو ایک لاکھ روپیہ یہ کہہ کر عطا کیا۔ "جناب' آپ کا مقطع واقعی لاکھ روپے کا ہے۔" اسی پر بس نہیں۔ وہ 'تک بند شاعر دوسری روز پھر آ دھمکا اور آتے ہی مژدہ سنایا۔ حضور' آج میں ایک ایسا شعر پیش کرنے کی جسارت کرنے آیا ہوں جس کی قیمت دو لاکھ ہے۔ آپ چونکہ حقیقی قدردان ہیں لہٰذا پیش خدمت ہے۔

من سے نہیں رحیم نرپ' ورگ سے نہیں دوان
دیکھ نین چھ آگرین من تھی تابک جان

(اے رحیم دل جیسا کوئی شہنشاہ نہیں اور نگاہ سے بڑا کوئی دوست و ندیم نہیں جس کی عزت نگاہ کرے دل بھی اسی کے ہاتھ بک جاتا ہے)

یہ بھی خان خاناں کا مشہور و معروف دوہا تھا مگر مروت کی انتہا یہ ہوئی کہ عبدالرحیم نے شاعر کی تعریف کے بعد دو لاکھ روپے ادا کر دیئے۔ تیسرے دن وہ شاعر پھر آ موجود ہوا اور فرمانے لگا۔ حضور! آج میں آپ کو دو ایسے اشعار سناؤں گا جن کی مجموعی قیمت تین لاکھ ہے۔ پھر خان خاناں ہی کے دو دوہے پڑھ دیئے۔

رحمٰن دھاگو پریم کا جن توڑو جھٹکائے
توڑے سے یہ جڑت نائیں بیچ گانٹھ پڑ جائے

(رحمٰن پریم کے دھاگے کو ہرگز نہ توڑو اول تو یہ جڑتا نہیں' جڑ بھی جائے تو اس میں گرہ ضرور پڑ جاتی ہے۔

چھ رحیم تن من دیو کینو ہردے بیں بھون
تاسے دکھ سکھ کہے کی' رہی کتھا اب کون

(جس کے سپرد تن من کر دیا اور اپنے من میں بسا لیا پھر اس سے رنج و راحت کا شکوہ کیا۔ یعنی دکھ دے تو کیا سکھ دے تو کیا)

شاعر موصوف تو انعام و اکرام لے کر رفوچکر ہو گئے۔ ایک روز بعد عبدالرحیم خان خاناں پانچ لاکھ کی رقم لے کر اس کے منتظر بیٹھے رہے۔ غروب آفتاب تک انتظار ہوتا رہا۔ میر منشی نے کہا۔ "حضور! وہ دھوکے باز اب نہیں آنے گا۔"

"منشی جی! وہ دھوکے باز ہی نہیں کم ظرف بھی تھا' ہم صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ آخر وہ کس حد تک گر سکتا ہے؟" خان خاناں نے مسکرا کر جواب دیا۔

اب پیش خدمت ہے وہ واقعہ جو شاہ حسین کے اس عقیدت مند کی شخصیت کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

ایک بار خان خاناں بغرض شکار جنگل میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ آدھی رات کے قریب وہ محو خواب تھا کہ ایک دیہاتی اس کے خیمے میں گھس آیا اور کوئی سخت سی چیز اس کے پاؤں سے رگڑنے لگا۔ خان خاناں اچانک بیدار ہو گیا اور تلوار بے نیام کر کے گرجا۔ "کون ہو تم؟"

وہ مفلس دیہاتی مارے دہشت کے لرزنے لگا۔ "خدا رسولؐ کے واسطے مجھے مت مارنا۔" اس نے دست بستہ عرض کی۔ "میں ایک غربت کا مارا بدنصیب انسان ہوں۔"

خان خاناں نے حیران ہو کر دیکھا تو اس مفلس کی حالت واقعی ناگفتہ بہ تھی مگر سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس نے ہاتھ میں لوہے کا توا تھام رکھا تھا۔ "یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اور تم اس وقت میرے خیمے میں کیا کر رہے ہو؟" خان خاناں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"حضور! میں نے سن رکھا تھا کہ عبدالرحیم خان خاناں کے جسم سے جو چیز چھو جائے وہ سونے کی بن جاتی ہے۔" دیہاتی نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرنا شروع کیا۔ "مجھ غریب کے پاس یہی لوہے کا توا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ یہ توا خان خاناں کے جسم سے چھو کر لے آؤ تو ہمارے دن پھر جائیں گے مگر افسوس کہ میری قسمت ہی خراب ہے۔" پھر دیہاتی نے بغور آہنی توے کی طرف دیکھا۔ "اگر میں اچھی طرح آپ کے پاؤں سے یہ توا رگڑ لیتا تو آج مفلسی سے نجات مل جاتی۔"

خان خاناں یہ عجیب و غریب حکایت سن کر بڑا حیران ہوا۔ "سادہ لوح انسان! تم نے غلط سن رکھا ہے، میں کوئی........"

"نہ حضور! ایسی بات منہ سے نہ نکالیں۔ ہمارے گاؤں والے سب یہی کہتے ہیں کہ خان خاناں "پارس" ہے۔" دیہاتی گڑگڑانے لگا۔ "اب ساری دنیا تو جھوٹ نہیں بول سکتی نا۔"

اپنے متعلق سادہ لوح دیہاتیوں کا عقیدہ اسے حیران کئے دے رہا تھا۔ وہ فوراً بات کی تہ تک پہنچا اور کہنے لگا۔ "محترم! تم میرا مطلب نہیں سمجھ سکے، تم نے جو کچھ سن رکھا ہے اس میں تھوڑی سی ترمیم کر لو، خانخاناں کے جسم سے چھو جانے والا لوہا، سونے سے دس گنا قیمتی ہو جاتا ہے، آزما دیکھو۔" اب دونوں مسکرا رہے تھے۔ دیہاتی کی آنکھیں تو خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"بس حصور تو پھر مجھے اپنی تقدیر بدل لینے دیں، خدا آپ کو خوش رکھے، آپ کا اس میں ہرج کیا ہے۔" دیہاتی نے لپک کر آہنی توا خان خاناں کے جسم سے رگڑنے لگا۔

"اب اس توے کو اس کونے میں رکھ دو۔" خان خاناں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "کل آ کر اپنی دولت لے جانا، اتنا سونا کہاں بیچتے پھرو گے میں خود اس کا بندوبست کر دوں گا۔"

"حضور! آپ واقعی بڑے اچھے انسان ہیں مگر سودا ذرا احتیاط سے کیجئے گا، سارے لوگ آپ جیسے تھوڑی ہوتے ہیں۔ اب مجھے اجازت دیں، میں یہ خوش خبری اپنی بیوی کو سنانا چاہتا ہوں۔ وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہو گی۔" دوسرے دن وہ دیہاتی واقعی مفلسی کے دندان ہلاکت سے نجات حاصل کر گیا۔

شاہ حسین نے خان خاناں کا نام اپنی شاعری میں استعمال کر کے اسے دوام بخشا۔

مادھولال حسینؒ

مادھولال حسینؒ اگر آفتاب عالم تاب تھے تو ان کے نظام شمس میں عطارد نصیب یا تعلق خاطر کے اعتبار سے قریب ترین دو شخصیات کو قرار دیا جاسکتا ہے جو علم و آگہی میں بھی ان کے ہم پلہ تھیں۔ ابو اسحاق مھزنگ قادری اور شیخ داؤد رشید گڑھی۔ اول الذکر، بحر معرفت کے غواص کا تعلق لاہور سے تھا۔ یہ تینوں حضرات ایک دوسرے کے محرم راز اور ظاہر و باطن سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ دو لاہور میں ایک اور شیر گڑھ میں، مگر نماز پنجگانہ کے اوقات پر تینوں سرزمین حجاز کے دل کعبتہ اللہ میں تشریف فرما ہوتے۔ مسجد نبویؐ میں بھی تینوں کو اکٹھے دیکھا گیا اور یہ دیکھنا دکھانا روزانہ کا معمول تھا۔ یہ ورحانی تعلق یا اس دور میں پیش آنے والے محیرالعقول واقعات، سطحی نگاہ رکھنے والے عوام الناس کی سمجھ سے تو بالاتر ہو سکتے ہیں مگر چشم بینا کے لئے ظہور پذیر ہونے والا کوئی واقعہ ناقابل فہم نہیں ہوا کرتا۔ خصوصاً آج جبکہ روحانیات بھی سائنس کا درجہ اختیار کر چکی ہے بزرگان دین کی کرامات تعجب خیز نہیں ہونی چاہئیں۔ کیا عام زندگی میں یہ اصول کارفرما نہیں کہ دیکھنے والی آنکھ اور ہدف کا درمیانی فاصلہ مناسب نہ ہو تو اشیاء کے خدوخال واضح نہیں ہوتے بلکہ غلط تاثر پیش کرتے ہیں؟ خوردبین سے دہی کا معائنہ کیا جائے تو انسان لاکھوں کروڑوں متحرک جرثوموں کو حلق سے نیچے اتارنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ یہی حال عام ہوا کا ہے جس سے ہماری سانسوں کا تسلسل قائم ہے۔ اگر ہم اس چیز کو دیکھ لیں جو ہمارے اندر جاری ہے تو سانس لینے سے انکار کردیں۔ یہ خالق کائنات کی خاص کرم نوازی ہے کہ ہم صرف حیات آور اشیاء کو دیکھ سکتے ہیں اور حیات کش تمام اشیاء کو پوشیدہ رکھا گیا ہے یا ہماری دسترس سے دور ع

آنکھ ناقص ہے وگرنہ اس جہاں کا اصل روپ
دیکھ لے اک بار جو وہ خوف سے مر جائے گا

دوسری اہم بات آنکھ کے وسیلے سے قوت مدرکہ کو غلط تاثر مہیا ہونا ہے۔ روشنی جو بظاہر بے رنگ سی دکھائی دیتی ہے منشور کی مدد حاصل کی جائے تو سات رنگوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ ہماری آنکھ زمین کو گول نہیں دیکھتی جبکہ ایک خلاپیما اس کی اصل شکل و شباہت کا مشاہدہ کرتا ہے جو گول بھی ہے اور قطبین سے پچکی ہوئی بھی۔ ہمارے نزدیک دہریے کی جامع تعریف یہ ہے جو "کل کی نہ سمجھ میں آنے والی حالت کا انکار کر کے جزو کی قابل فہم حالت ہی

کا ہو کر رہ جائے۔ ان تمام باتوں سے ایک ہی نتیجہ **اخذ** ہونا چاہئے کہ سمجھ میں نہ آسکنے والی بات کا انکار یا اسے غلط قرار دینا، دانشمندی کا تقاضا نہیں

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

شیخ ابو اسحاق بن حسین قادری، شیخ داؤد شیر گڑھی کے نامور خلیفہ اور لاہور کی علمی شخصیت تھے۔ ان کی درسگاہ شہر لاہور سے دو میل کے فاصلے پر فیض عام کا مقام و مرتبہ رکھتی تھی۔ فقہ و حدیث کے علاوہ علم و تفسیر کے **تشنگان** کا ہجوم، ابو اسحاق کو گھیرے رہتا۔ وطن مالوف بخارا اور تعلق سادات خاندان سے تھا۔ لاہور کے نواح میں یہ بستی ایک مغل سردار پیر عزیز نامی شخص نے بسائی تھی جو ابو اسحاق کے قیام کی وجہ سے ”محلّہ شاہ ابو اسحاق **مہزنگ** کے نام سے مشہور ہوئی اور آج اس جگہ کو مزنگ کہتے ہیں۔ ابو اسحاقؒ کا مزار بھی مزنگ ہی میں ہے اسی خانقاہ کے حجرے میں شاہ بلاول بھی مقیم تھے۔ آج سے پچاس برس **پیشتر** تک مزار اچھی حالت میں موجود تھا ہر سال عرس منعقد ہوتا۔ انجمن حمایت اسلام کے جنرل سیکرٹری شیخ عبدالعزیز کی رہائش گاہ، مزار مقدس کے بالکل قریب تھی۔ درویش کی آخری آرام گاہ لکھنؤ کے ایک متمول تاجر، عبداللہ عبدالقادر کی سعی جمیلہ کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی۔ عبداللہ موصوف کی اولاد لکھنؤ سے لاہور آکر مزار کی مرمت اور آرائش و زیبائش کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ کسی زمانے میں ساڑھے سات **بیگھہ** زمین بھی اسی مزار کی ملکیت تھی آج کل آبادی کا سیلاب ہر چیز بہا لے گیا ہے صرف مسجد اور چھوٹے گنبد والا مقبرہ محفوظ ہیں۔ تاریخ وفات جو تربت درویش پر مرقوم ہے وہ فارسی کے اس مصرعے سے نکلتی ہے۔

شاہ عالی فقیر ابو اسحاق

985ھ

شاہ ابو اسحاق کی علمی فضیلت کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف ہر دور میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یعنی ”آیت اللہ“ مشہور رہے۔ تیز رفتاری کا یہ عالم کہ عالم پیری میں بھی جب اپنے رہنما حضرت داؤد شیر گڑھی کی یاد ستاتی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر

پاپیادہ جھنی وال (موجودہ چونیاں) چل دیتے اور راتوں رات چالیس کوس کا فاصلہ طے کر کے دیار یار کی دہلیز تک جا پہنچتے مگر اکثر و بیشتر ملاقات کے بغیر ہی واپس آجاتے

اچھا ہوا جو تم نہیں آمادہ وصال
پھر کیا رہے گا دل میں جو حسرت نکل گئی

درویش اگرچہ آخری عمر میں گوشہ نشین ہو گیا تھا مگر لاہور کے گرد و نواح اور دور دور تک احترام کا ہالہ سا موجود تھا۔ ہر مکتبہ فکر کے لوگ ابواسحاق کا نام سنتے ہی سرنیاز خم کر دیتے "منتخب التواریخ" کے مصنف ملا عبدالقادر بدایونی' ایک بار عجیب و غریب تجربے سے دوچار ہوئے۔ ملا موصوف ایک روز ابواسحاق سے ملنے آئے۔ رات حجرہ درویش میں بسر کی دوسرے دن شیر گڑھ جانے اور شیخ داؤد کی زیارت سے مستفید ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ درویش نے بصد مسرت اجازت دی مگر اپنے ایک خادم کو بھی ہمراہ کر دیا۔

"حضور! اس کی کیا ضرورت ہے؟" ملا عبدالقادر نے کہا "راستے میں اگرچہ رہزنوں' لٹیروں کی حکمرانی ہے مگر میں تو آپ کے آستانے سے شیر گڑھ جا رہا ہوں مجھے فکر و اندیشے سے کیا غرض؟"

"سو تو ہے مگر اس تعلق کا اعلان اگر خود آپ کی جانب سے ہوا تو شاید کوئی یقین نہ کرے" درویش نے وضاحت پیش کی "اس بات کا اعلان کسی گواہ کی زبان سے ہو تو مناسب ہے" اگرچہ وہ دور عہد اکبری کے عروج کا تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ سرکشیاں اور بغاوتیں ہر زمانے کا حصہ رہی ہیں اور مغلیہ عہد حکومت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

ملا صاحب خادم کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوئے۔ شہر لاہور سے شیر گڑھ کا درمیانی علاقہ زیادہ تر گھنے جنگل پر مشتمل تھا۔ آج تو آبادی کا عفریت جنگلوں کو ہڑپ کر گیا ہے مگر اس دور میں واقعی ایسا نہیں تھا۔ لاہور کی حدود سے نکلتے ہی رہزنوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اچانک ہی کہیں سے نمودار ہوئے اور دونوں مسافروں کو نرغے میں لے لیا۔ ملا موصوف کا رنگ فق ہو گیا۔ ڈراؤنی شکلوں والے مسلح افراد سوال و جواب کے تکلف سے آشنا ہی نہ تھے۔ خادم نے بڑے رعب سے ان کے سرغنے کو ڈانٹ پلائی "کچھ خبر بھی ہے کن لوگوں کے حضور کھڑے ہو؟ میں شاہ ابواسحاق کا خادم ہوں اور یہ ان کے مہمان اور ہم شیخ داؤد شیر گڑھی کی زیارت کرنے جا رہے ہیں۔" خادم کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ سارے ڈاکو کف

افسوس ملنے لگے۔ “جناب ہم سے گستاخی ہوگئی” ڈاکوؤں کے سردار نے معذرت پیش کی “آج ہمیں مہمان نوازی کا شرف بخشیں کل ہم خود آپ کے سفر کا خاطر خواہ انتظام کردیں گے۔”

ملا عبدالقادر بدایونی کی جان میں جان آئی۔ رات ڈاکوؤں نے پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا بے تکلف ماحول میں ملا موصوف نے پوچھ ہی لیا “آپ حضرات کا پیشہ رہزنی ہے پھر اس “تکلف” اور درویش کے احترام کا کیا مقصد؟”

“بات یہ ہے جناب” ایک ڈاکو نے وضاحت کی اس دس کوس کے علاقے پر ہمارا راج ہے مغل بچہ (شہنشاہ اکبر) اس حقیقت سے آشنا ہے اور ہم بھی مغل فوج سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر درویش سے ٹکرانے کی ہم میں تاب ہے نہ مجال۔ جن کے آپ مہمان ہیں وہی کیا کم تھے کہ آپ تو شیر گڑھ تشریف لے جارہے ہیں وہ درویش تو شاہ صاحب کے بھی مرشد ہیں۔ ان حضرات کی بے ادبی میں جان کے ساتھ ایمان جانے کا بھی خطرہ ہے”

عجیب منطق تھی ان رہزنوں کی۔ بہرحال بات ملا صاحب کی سمجھ میں آگئی۔ دوسرے دن سفر کا آغاز ہوا تو ڈاکوؤں کے سردار نے تلقین کی “جونہی آپ حضرات اس قسم کی مشکل میں مبتلا ہوں فوراً اپنا تعارف پیش کردیں ورنہ جن لوگوں سے آپ کا واسطہ اب پڑنے والا ہے وہ ہماری طرح “رحم دل” نہیں وہ تو تن کے کپڑوں کے لئے بھی تن سے سر جدا کردیتے ہیں۔” چنانچہ شیر گڑھ تک کا سارا سفر اسی انداز میں طے ہوا۔ جونہی خطرناک “حضرات” سے ملاقات ہوتی ملا موصوف فوراً پکار “اٹھتے ہم شاہ ابواسحاق کے مہمان تھے اب شیر گڑھ ان کے مرشد کے آستانے پر جارہے ہیں۔” یہ سنتے ہی معاشرے کے وہ ناسور، وہ رہزن لٹیرے، زیر دام آجاتے نہ صرف یہ کہ دست ستم، دست شفقت میں بدل جاتا بلکہ وہ “حضرات” خاطر تواضع کرنے پر اصرار کرتے اس طرح وہ سفر جسے ابواسحاق ایک رات میں طے کرلیا کرتے تھے تقریباً ایک ہفتے میں اختتام پذیر ہوا۔ شیر گڑھ پہنچے تو شیخ داؤد نے مسکرا کر استقبال کیا اور کہا “خیل خوب، راستے میں بڑی خاطر تواضع ہوئی آپ لوگوں کی”

“جناب! آپ روشن ضمیر ہیں آپ سے کیا پردہ، خاطر بھی خوب ہوئی اور تواضع بھی” ملا صاحب نے بصد احترام اعتراف کیا۔

شاہ حسین کا ابواسحاق سے ایک اور رشتہ بھی تھا۔ شیخ سعد اللہ استاد ملامت جن کے

آگے شاہ حسین نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا وہ بھی ابو اسحاق ہی کے شاگردان رشید میں شمار ہوتے ہیں۔ اس طرح ابو اسحاق، شاہ حسین کے دادا استاد بھی ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ داؤد اور شاہ حسین میں بھی روحانی تعلق استوار ہو جاتا ہے۔

ایران کے شہر کرمان شاہ سے ایک زاہد شب زندہ دار قسم کا شخص، فتح اللہ، نقل مکانی کر کے ہند کے شہر سیت پور (موجوہ ضل مظفر گڑھ) میں آ مقیم ہوا جس کے ہاں 27 رمضان المبارک 919ھ میں شیخ داؤد تولد ہوئے اس طرح انہیں "کرمانی" بھی کہا جاتا ہے۔ شیخ موصوف کی والدہ ست گھرا (ساہیوال) کے مشہور عالم دین حافظ محمد کی صاحبزادی تھیں۔ پیدائش سے پیشترہی فتح اللہ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ داؤد کرمانی کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد والدہ بھی راہی ملک عدم بقا ہوئیں اس طرح یتیم و یسیر بچے کی پرورش کا بوجھ ست گھرا میں مقیم ماموں کے کندھوں پر آ پڑا۔ ایک روایت کے مطابق ان کی تعلیم کا آغاز جھنی وال میں ہوا پھر عروس البلاد لاہور کے عالم بے بدل شیخ اسماعیل سے اکتساب علم ہوا۔ شیخ اسماعیل کو مولانا عبدالرحمٰن جامی سے تلمذ تھا۔ شیخ اسماعیل عمر بھر اپنے استاد اور شاگرد (مولانا جامی اور داؤد کرمانی) سے تعلق خاص پر نازاں رہے۔ داؤد کرمانی کے زہد و تقوے کا یہ عالم کہ دن رشد و ہدایت میں بسر ہوتا تو رات رکوع و سجود میں۔ مغل شہنشاہ اکبر تک ملاقات کا متمنی ہوا کرتا تھا مگر درویش کے استغنا اور بے نیازی کی بناء پر مغل بادشاہ کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ شہباز خاں کنبوہ جیسا شاہی فرستادہ بھی درویش کو قائل نہ کر سکا کیونکہ شاہ حسین کی طرح داؤد کرمانی بھی شمشیر براں قسم کی شخصیت تھے اور مغل شہنشاہ مادھو لال حسین سے زچ اٹھا چکا تھا لہٰذا اکبر نے ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا۔ یہ درویش دکھاوے کے صوفیوں اور علمائے سو کے حق میں ننگی تلوار سے کم نہ تھے۔ اکثر فرماتے "جن علماء اور صوفیاء نے شاہوں کو اپنا قبلہ بنالیا ان سے وہ مکھی یقیناً ہزار درجے بہتر ہے جو نجاست پر بیٹھی رہتی ہے"

درویش کی باتوں میں ایسا اثر تھا کہ جو سنتا اس کی کایا پلٹ جاتی۔ پنجاب کے علاقے ساندل بار اور اس کے گرد و نواح میں لاتعداد غیر مسلم قبائل، داؤد کرمانیؒ کی مساعی جمیلہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے مثلاً ضلع گوجرانوالہ کے چٹھے، تارڑ، ورک، سنجرا، دھوتار، **چیمے**، ڈرانچ، گورائے، مان، سانسی وغیرہ اور سیالکوٹ کے علاقے سے باجوے، بسرے، **چیمے**، گھمن، کاہلوں، ساہی، سندھو، ضلع ساہیوال کے اراڑہ، **حصیانے**، کولاہکے، **مجھیانے**،

مروانے اور بلوچ۔ یہ تمام قبائل اس دور میں پنجاب کے جنگجو قبائل تھے جو شیخ داؤد کرمانی کی زود اثر گفتگو سے راہ راست پر آئے۔

مادھو لال حسینؒ کا ایک رشتہ شیخ داؤد کرمانی سے ایسا بھی ہے جو نہ صرف منفرد بلکہ ثقافت پنجاب میں مینار نور کا درجہ رکھتا ہے۔ پنجابی ادب میں ہیر رانجھے کا کردار سب سے پہلے شاہ حسین نے متعارف کرایا اور شیخ موصوف نے اسے موضوع سخن بنایا۔ یہ بات مستند ہے پنجابی ثقافت کی جان اس داستان عشق کی طرح‘ شاہ حسین نے ڈالی پھر جو انداز اپنایا گیا اسی کی پیروی ہر دور میں کی گئی۔ صوفی شعرا نے تو اتباع کا حق ادا کردیا۔ اپنے آپ کو "ہیر کے روپ میں پیش کرکے رانجھن" کی جستجو و تلاش وہی تڑپ وہی سوز و گداز وہی اضطراب و بے چینی وہی ہجر و فراق کی کسک‘ ان کرداروں کا طرہ امتیاز رہی۔ اسی سے جل بن مچھلی اور ماہی بے آب وغیرہ کی تراکیب اردو شاعری میں در آئیں اور عظیم شعرا نے اسے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ شاہ حسین کے کلام میں "ہیر رانجھا" کے انداز ملاحظہ فرمائیں۔

رانجھن رانجھن کوک دی میں آپے رانجھا ہوئی
رانجھن مینوں ہر کوئی آکھے ہیر نہ آکھے کوئی

بعض کتب میں پہلے مصرع کا آغاز "ماہی ماہی کوک دی" سے ہوا ہے پھر مختلف ادوار میں اس شعر میں ترامیم بھی ہوئیں حتیٰ کہ یہ کلاسک کا درجہ اختیار کرگیا۔ بعض بے خبرے حضرات نے اس شعر کو وارث شاہ کی قلمی کاوش قرار دینے کی کوشش کی ان کے متعلق ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں۔

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

متعدد کافیوں میں شاہ حسین نے پیر کا ذکر‘ مختلف انداز میں کیا ہے مثلاً

لوکاں سنیاں‘ دیساں سنیا ہیر بیراگن ہوئی
اک سنیندا لکھ سنے میرا کیہہ کرے گا کوئی

(لوگوں نے سنا‘ دیس دیس بات پھیل گئی کہ ہیر بیراگن ہوگئی ہے ایک سنے یا لاکھوں میرا کیا بگڑ سکتا ہے یعنی یہ رسوائی تو اس تماشے کا حصہ ہے)

لوک گیتوں میں یہ مصرع زبان زد خاص و عام ہوچکا ہے

میں جھوک رانجھن دی جانا' نال مرے کوئی چلے

(مجھے رانجھن کی بستی کی طرف جانا ہے کوئی ہے جو میرے سنگ جانے کو تیار ہو)

رانجھن ساہنوں کنڈیاں پائیاں دل وچ لگیاں زور

(رانجھن نے ایسی کانٹے دار زنجیریں ڈال دی ہیں جو دل میں اندر تک کھب چکی ہیں)

ایک اور انداز میں ملاحظہ فرمائیں

ہاتھی عشق مہاوت رانجھا' آنکس دے دے ہوڑیئے

ایک انداز یہ بھی ہے

پار ندی رانجھن دا ٹھانہ کیہتا قول ضروری جانا

کلام شاہ حسین میں ذکر ہیر رانجھا کے یہ چند ایک نمونے ہیں جو پیش خدمت کئے گئے۔ شیخ داؤد کرمانی' درویشی مسلک کی جانب کس طرح راغب ہوئے اور وہ اس قصے کو کیا درجہ دیتے تھے وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

قصہ ہیر از دمودر کے دیباچے میں مرقوم ہے کہ ایک شخص دربار داؤدی میں آیا اور اس نے قصہ ہیر رانجھا بڑے سوز و گداز سے بیان کیا۔ درویش نے بغور سن کر فرمایا "تم نے نیک لوگوں کا ذکر کیا خدا تمہاری پانچ نسلوں پر کرم فرمائے گا" اسی طرح ولیا نامی ایک مغنی اس قصے کو خوش الحانی سے گاتا چلا جارہا تھا کہ شیخ پر وجد طاری ہوگیا اپنے آپ کی سدھ بدھ نہ رہی اور دنیا کے سارے بکھیڑے تج کر جنگلوں کی طرف چلا یئے۔

دنیا سے منہ موڑنے کے متعلق دوسری روایت کچھ اس طرح ہے کہ مرزا کامران پسر بابر مغل شہنشاہ کے دربار میں ایک ایرانی نژاد' علم کلام کا ماہر آیا۔ اس نے ہندی ماہرین الٰہیات و مذاہب کو دعوت مناظرہ دی۔ مرزا کامران نے دیپالپور سے ملا بایزید کو بلا بھیجا۔ شیخ داؤد ان دنوں دیپالپور میں ملا بایزید کے درس سے اکتساب علم کر رہے تھے مرزا موصوف کی دعوت پہنچی تو استاد نے اپنے باصلاحیت شاگرد کی معاونت میں دن رات تیاری شروع کردی۔ کتب قیل و قال کے مطالعے میں ایک روز مصروف تھے کہ کسی درویش کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے بڑے عجیب لہجے میں کہا "اللہ نے کس کام کے لئے تخلیق فرمایا اور تم کن بکھیڑوں میں الجھ گئے" بس یہ سننا تھا کہ گریباں چاک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگل کی طرف چل دیئے۔ شاہوں سے بیزاری و لاتعلقی کا انداز' شاہ حسین نے شیخ داؤد کرمانی ہی سے سیکھا بھ

دونوں ایسے "اک مک" ہوئے کہ من وتو کا فرق مٹ گیا۔ عمر میں شیخ داؤد کرمانی شاہ حسین سے بہت بڑے تھے۔ 982ھ بمطابق 1574ء جب شیخ داؤد نے سفر آخرت اختیار کیا تو شاہ حسین کی عمر 37 برس کی تھی یعنی کوچہ رسوائی میں ابھی قدم رکھا ہی تھا۔

شاہ حسین کے ایک اور ہم عصر بزرگ حسو تیلی ہیں جو منفرد نعرہ بلند کیا کرتے تھے "حسو حسین ہے اور حسین حسو" شاہ حسین اور حسو کے ٹکراؤ کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ چوک جھنڈا لاہور میں حسو تیلی کی دکان تھی۔ یہ دکان محض ظاہری رکھ رکھاؤ کے لئے تھی۔ اصل پیشہ تو درویشی تھا۔ شاہ حسین مجذوبانہ انداز میں رقص کناں اکثر دکان کے قریب سے گزرتے اور اسی انداز میں مزار علی ہجویری تک جاتے۔ ایک روز حسو تیلی سے برداشت نہ ہوسکا وہ خرام ناز بکھیرتے ہوئے شاہ حسین سے مخاطب ہوئے۔ "اے لڑکے! کیا اچھل کود مچا رکھی ہے یہ انداز مرغوب ہے تو کسی اور راستے سے جایا کر" پھر وہ اپنے احباب سے زیرلب مخاطب ہوئے یہ لڑکا شور تو بہت مچاتا ہے مگر مسجد نبویؐ میں مجھے کبھی نظر نہیں آیا۔ شاہ حسین نے سنا تو مطلق توجہ نہ دی اور بدستور اسی راستے سے گزر کر دربار علی ہجویری پر حاضری دیتے رہے۔ تین دن متواتر یہی "تماشہ" ہوتا رہا چوتھے روز والی شب کا ذکر ہے کہ حسو تیلی مسجد نبویؐ میں دربار رسالتؐ کی برکات سے فیض یاب ہو رہے تھے کہ اچانک ایک کمسن لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور آغوش رسولؐ میں بیٹھ گیا۔ حضور پرنور نے لڑکے کے سر پر دست شفقت رکھا پھر وہ لڑکا حسو تیلی کی طرف آیا اور ہمک کر ان کی گود میں جا بیٹھا۔ حسو موصوف نے سنت نبویؐ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے لڑکے کو پیار کیا۔ نور احمد چشتی سیر العارفین میں رقم طراز ہیں کہ "لڑکے نے طفلانہ حرکت کرتے ہوئے حسو موصوف کی داڑھی پر ہاتھ مارا اور چند بال اکھیڑ لئے۔ چند روز بعد ایک بار پھر شاہ حسین حسب دستور رقص کناں چوک جھنڈا سے گزرے تو بزرگ درویش سے پھر رہا نہ گیا اور سرزنش کرنے والے لہجے میں کہا "لڑکے تم اپنی حرکت سے باز نہیں آؤ گے؟"

"شاہ حسین یہ لہجہ سن کر خاموش کھڑے ہو گئے اور زیرلب مسکراتے ہوئے حسو تیلی کے قریب آ گئے' پھر اپنی مٹھی کھول کر دکھائی اس میں وہی بال تھے جو مسجد نبویؐ میں اس کمسن بچے نے درویش کی داڑھی سے نوچ لئے تھے۔ اپنی داڑھی کے بال پہچان کر حسو موصوف کا رنگ فق ہو گیا۔ حقیقت حال کا انکشاف ہوا تو وہ دم بخود رہ گئے پھر لپک کر شاہ حسین کو گلے لگا لیا اور

بے اختیار پکار اٹھے' حسو' حسین ہے اور حسین حسو' ہمارے خدام پر احترام حسین واجب ہے"

1002ھ میں شاہ حسین سے چھ برس پیشتر حسو موصوف کا انتقال ہوا۔ لاہور شاہ جمال بستی میں آج بھی مزار موجود ہے اور وہاں کے سجادہ نشین (مع تیلی برادری) کے مادھولال حسین کا ادب واحترام' اپنے پیرومرشد کی طرح بجالاتے ہیں۔

عموماً فقرا کے مابین مناقشت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ درویشی کی اساس ہی "انا" کے نیست و نابود کردینے پر استوار ہوتی ہے مگر اس کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ داستان شاہ حسین ایسے ہی ایک درویش کے ذکر کے بغیر یقیناً ادھوری رہ جائے گی۔ اس درویش کا نام شیخ ارزائی ہے۔ شیخ بہلول دریائی کے شاگردوں میں شیخ ارزانی ایک بلند مرتبت نام ہے۔ علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے مگر جانے کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ شاہ حسین کے سلسلے میں وسوسوں کا شکار ہوگئے۔ یہی خیال بار بار آتا کہ شاہ موصوف کا مقام و مرتبہ ان سے بلند ہوگیا ہے لہٰذا ان کو روحانی کمالات سے زیر کرنا ضروری ہے۔ یہ ٹھان کر وہ شاہ حسین کے ڈیرے پر پہنچے۔ شاہ حسین نے اپنے پیر بھائی کو دیکھ کر دلی مسرت کا اظہار کیا۔ شیخ بہلول کی بات چلی تو گویا ساری رات چلی۔ دونوں نے اپنی اپنی منزل سلوک کا حال بھی بیان کیا۔ دونوں ایک ہی شخصیت کے پروردہ تھے اخفا و راز والی کوئی بات ہی نہ تھی۔ باتوں باتوں میں شاہ حسین کو مہمان کی آمد کے مقصد کا پتہ چل گیا۔ روحانی مقابلہ ہر لحاظ سے نامناسب بات تھی لہٰذا شاہ حسین صاف طرح دے گئے۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہم قرب خداوندی کے تعین کی خاطر ایک دوسرے سے باطنی معرکہ آرائی کریں" شیخ ارزانی نے کھل کر حرف مدعا بیان کیا"

"بھائی یہ کوئی مناسب بات تو نہیں کہ ہم یہ اندازہ لگانے کی خاطر کہ کون رب العزت کے زیادہ قریب ہے' روحانی زور آزمائی کرتے پھریں" شاہ حسین نے مناسب الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی مگر شیخ ارزانی بضد تھے کہ یہ "مقابلہ" ضرور ہونا چاہئے۔

"ایسا ہے تو پھر مجبوری ہے" شاہ حسین نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہے کہ میں غائب ہوتا ہوں' آپ مجھے تلاش کریں شیخ ارزانی نے وضاحت پیش کی "مجھے اختیار رہے جس ذی روح کی شکل میں چاہوں ظاہر ہو جاؤں"

”یہ چمتکار تو ”جوگی“ بھی دکھا سکتے ہیں“ شاہ حسین نے کہا ”اس سے قرب خداوندی کا اظہار کیسے ہوگا؟ یہ تو محض شعبدہ بازی ہے“

”بہرحال جو کچھ بھی ہے آپ مجھے تلاش کرلیں گے تو میں آپ کے مقام و مرتبے کو تسلیم کرلوں گا“ یہ کہتے ہی شیخ ارزانی پرندے کی شکل اختیار کرکے، فضا کی بلندیوں میں پرواز کرگئے۔ حقیقت الفقرا کے مطابق شاہ حسین نے فوراً شہباز کی شکل اختیار کی اور چند لمحوں کی تیز پرواز کے طفیل، شیخ ارزانی کو جا دبوچا

اگر چاہوں تو تجھے تحت الثریٰ کی سیر کرادوں“ شاہ حسین نے کہا ”مگر یہ مسلک درویشی کی توہین ہے، ہم لوگ خاک نشینی اختیار کرچکے ہیں اور اس فروتنی و عاجزی ہی میں ہماری بڑائی ہے“ پھر شاہ حسین شیخ ارزانی کو سبق سکھانے کی خاطر فضا کی پہنائی میں گم ہوگئے اور شیخ ارزانی سرتوڑ کوشش کے باوجود بھی سراغ نہ پاسکے اور اپنی ہار تسلیم کرلی۔

اس شکست کے باوجود بھی شیخ ارزانی اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ آخر شاہ حسین نے سرزنش کرنے والے انداز میں حکم دیا کہ وہ پنجاب کی حدود سے نکل کر پٹنہ چلے جائیں۔ شیخ ارزانی کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

شاہ حسین کے وصال کے بعد شیخ ارزانی لاہور پہنچے غالباً ان کے دل میں شاہ حسین کی خلافت تھی مگر یہ منصب شیخ مادھولال کو سونپا جاچکا تھا لہٰذا درویش پٹڑی سے اتر گیا اور تربت حسین کی بے حرمتی تک بات جا پہنچی۔ اس نے مزار پر حاضر ہوکر قبر کو ٹھڈے مارے اور نخوت بھرے انداز میں لب کشا ہوا ”او جلاہے زیر زمیں بے خبر سونے والے، دیکھ آج میں شیر اور تو گیدڑ بن چکا ہے اس لئے کہ تو بے بس ہے“ شیخ ارزانی کے متکبرانہ الفاظ کا اگر ارتعاش ابھی اختتام پذیر نہ ہوا تھا کہ فضا میں گونج سنائی دی۔

”ارزانی! تجھ سے یہ توقع نہ تھی تو فنا و بقا کی ابجد سے بھی واقف نہیں، بے خبر انسان، میں جولاہا ضرور ہوں مگر اللہ کی جو رکھنے والا یعنی جوئندہ، متلاشی۔ تو میرے مرشد بہلول کا فقیر ہے اور یہی نسبت مجھے روکے ہوئے ہے۔ بہرحال اب تو واپس پٹنہ چلا جا بلکہ تجھے زبردستی بھیجا جائے گا۔“

ان دنوں شاہ حسین کا مزار دریائے راوی کے اس پار شاہدرہ کے قریب تھا۔ شاہ حسین نے مغل شہنشاہ اکبر سے خواب میں ملاقات کی اور صورتحال کی وضاحت کے بعد کہا شیخ

ارزانی میری تربت پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے اسے پٹنہ بھیج دیا جائے"

مغل شہنشاہ اس خواب سے حیرت میں ڈوب گیا۔ شاہ حسین کے مقام سے وہ بخوبی آگاہ تھا اس نے تحقیق کرائی تو بات پایہ ثبوت کو پہنچی۔ شیخ ارزانی واقعی پٹنہ سے آکر مزار حسین پر براجمان تھا۔ اس نے ناظم لاہور کو حکم دیا کہ شیخ ارزانی کو لاہور سے پٹنہ روانہ کردیا جائے۔ ناظم لاہور نے جب فرمان شاہی' شیخ ارزانی کے گوش گزار کیا تو شیخ کے ہوش اڑ گئے۔ شاہ حسین نے ایسا پائیدار بندوبست کیا تھا جس سے فرار کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ اکبر کے حکم سے سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر شیخ ارزانی اشک ندامت بہاتا' مزار شاہ حسین سے لپٹ گیا اور اپنی زیادتیوں اور گستاخیوں کی معافی مانگنے لگا۔ بہرحال شاہی ملازموں نے اسے بصد احترام پٹنہ پہنچادیا جہاں اسے وہ تمام مراتب میسر آگئے جس کی اسے خواہش تھی

بہلول دریائی اور شاہ حسین کے ارادت مندوں کی تعداد دولاکھ کے قریب ہو گئی۔ شیخ ارزانی کا انتقال 1015ھ پٹنہ ہی میں ہوا۔ مزار محلّہ سلطان گنج میں واقع ہے۔

اب پیش خدمت ہے شاہ حسین کی مادھو لال سے داستان عشق یا تعلق خاطر کی تفصیل۔ یہ بات مستند ہے کہ شاہ حسین کی زندگی میں 'لفظ مادھو یا مادھولال ان کے نام کا حصہ نہیں تھا۔ وہ شاہ حسین یا حسین ڈاھڈا کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ سفر آخرت اختیار کرنے کے چند برس بعد عوام الناس میں مادھولال' ان کے نام کے ساتھ مستعمل ہوا اور اس انداز میں یہ نام' زبان زد خاص و عام ہوا کہ لوگ دونوں کے اصل ناموں ہی کو فراموش کر بیٹھے اور مادھولال سے مراد شاہ حسین کی شخصیت قرار دی جانے لگی۔ ان کی شاعری میں لفظ لال جس سے مراد مادھول لال ہے صرف ایک بار مستعمل ہوا یعنی

پیارے لال کیا بھرواسہ دم دا
اڈیا بھور تھیا پردیسی آگے راہ اگم دا

(پیارے مادھولال سانس کا کوئی اعتبار نہیں طاہر (روح) محو پرواز ہوا تو ان دیکھی دنیا اس کے سامنے ہوگی۔ حسنات العارفین از دارالشکوہ جو درویش کی وفات کے چھ برس بعد لکھی گئی اس میں "مادھولال حسین" والا نام استعمال نہیں ہوا۔ اس داستان عشق کے متعلق دوسری اہم بات حد سے زیادہ حاشیہ آرائی ہے۔ بعض حضرات نے مادھولال برہمن بچے کو "کمسن لونڈا" ظاہر کیا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مادھول لال برہمن نوجوان

سے پہلی ملاقات کے وقت شاہ حسین' عمر عزیز کے 56 ویں برس میں قدم رکھ چکے تھے' عالم پیری کا آغاز ہو چکا تھا اور "حکم حضوری" پہنچنے میں صرف سات برس باقی تھے۔ (شاہ حسین کا انتقال پر ملال تریسٹھ برس کی عمر میں ہوا)

راوی کے اس پار شاہدرہ میں ایک برہمن خاندان آباد تھا۔ مادھول لال اسی خاندان کا خوبصورت شادی شدہ نوجوان تھا جس کی عمر تقریباً اٹھارہ برس تھی۔ شاہ حسین "کوچہ ملامت" میں عرصہ بیس برس سے محو خرام تھے "ہندو بچے" پر نظر پڑی تو دم بخود رہ گئے۔ "اتنی نورانی صورت اور جہنم کا ایندھن بنے؟" بس اسی خیال سے دنیائے دل زیر و زبر ہو گئی۔ ادھر مادھولال بھی حسن جہاں سوز کے ساتھ گداز دل کا مالک تھا۔ شاہ حسین عالم سکر میں اپنے دوست احباب کے ہمراہ دیار یار تک جا پہنچے۔ مسلک ملامت تو پہلے ہی اپنا چکے تھے۔ مادھولال کی قیام گاہ کا طواف شروع ہوا تو شہر میں گویا زلزلہ آ گیا۔ چھپن برس تک تجرد کی زندگی گزارنے والا جو گلی کوچوں میں مست الست رقص کناں گھومتا رہتا تھا' جسے دنیاوی حکمران زیر کر سکے نہ مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری جیسا عالم دین' لاجواب کر سکا' جس کے آستانے پر دربار اکبری کے نورتن حاضری دینا باعث عزو شرف گردانتے تھے۔ جو رات رات بھر' دریائے راوی کی موجوں کو تلاوت کلام پاک سے محظوظ و مسرور کیا کرتا تھا' ایک برہمن لونڈے کے عشق میں گرفتار ہو گیا اور وہ بھی عالم پیری میں لاہور کے گلی کوچوں میں بس یہی موضوع سخن تھا۔ شاہ حسین نے مسلک ملامتیہ کے پیش نظر اس رسوائی کا طوق بھی دلی مسرت کے ساتھ زیب گلو کیا۔

شاہ حسین کا معمول تھا کہ رات ڈھلتے ہی برہمن زادے کے مکان کا طواف شروع کر دیتے اور اہل خانہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کی تفصیل' باواز بلند' سر عام دہرا دیتے۔ یہ مادھولال کے لئے لمحہ فکریہ تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا تجسّس بیدار ہوا اور وہ اس رند مشرب درویش کی جانب مائل ہونے لگا۔ یہ جان پہچان گرویدگی میں بدل گئی اور برہمن زادہ بھی رندوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ کون سا جلوہ تھا' وہ کون سی کشش تھی جس نے مادھولال کی کایا پلٹ دی؟ دنیا نے یہی دیکھا کہ خود مادھولال بھی رنگ شاہ حسین میں رنگا گیا ہے۔ مسلسل دو برس اس تعلق کو برہمن زادے نے پوشیدہ رکھا مگر یہ ساری داستان خوشبو کی طرح پھیل گئی اور لوگوں نے اس داستان میں وہ سارے رنگ بھر دیئے جو بھرے جا سکتے تھے' وہ سارے

مفہوم اجاگر کر دیئے گئے جو اجاگر کیے جا سکتے تھے۔ ادھر وہ برہمن خاندان ہدف ملامت ہوا۔ طعن و تشنیع رسوائی اور تہمت کے قلعہ بند خاندان کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ اس دور ابتلا میں لوگوں نے رائی کا پہاڑ اور بات کا بتنگڑ بنایا۔ دنیا تو کچھ نہ ہونے سے سب کچھ بنا لیتی ہے اور یہاں تو بنانے کے لئے بظاہر سب کچھ تھا۔ مادھول لال اور شاہ حسین دن رات اکٹھے رہتے تھے۔

بظاہر مٹی' پانی' ہوا اور گلاب میں کوئی قدر مشترک نہیں مگر سب جانتے ہیں کہ پھولوں کی نمو ان ہی عناصر سے معرض وجود میں آتی ہے۔ پھول اپنی خوشبو اور رنگ' ان عناصر ہی سے حاصل کرتا ہے اور پھول' پودے تلے کی مٹی بھی خوشبودار ہو جاتی ہے۔ یہ گلوں کی قربت کا اعجاز ہے۔ اسی طرح مادھو لال نے شاہ حسین کے سارے رنگ اخذ کر لئے اور ساری خوشبو فصیل جاں میں جذب کر لی۔ وہ مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا مگر اس اعلان کے لئے جس جرات رندانہ کی ضرورت تھی وہ اس میں موجود نہ تھی۔ اس معاملے میں راہبر بھی کام نہیں آتا یہ سفر تنہا ہی طے کرنا پڑتا ہے۔ راہبر صرف دو گام سہارا دے سکتا ہے۔ اگر اعلان بھی راہبر کی جانب سے ہو تو جبر و اکراہ والی بات بن جاتی ہے اور دین میں اس کی اجازت ہے نہ جواز

برہمن خاندان اس طوق رسوائی سے تنگ آ گیا تو وہی فیصلہ کیا گیا جو حالات کا تقاضا تھا یعنی "تنگ آمد بجنگ آمد" مادھو لال اور شاہ حسین کے قتل کا فیصلہ ہو گیا۔ شاہ کے مخالفین ہندو جوشیلے نوجوان کیل کانٹے سے لیس' دونوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ خبر ملی کہ شاہدرہ کے ایک مکان میں شاہ حسین اپنے حواریوں کے ساتھ "رنگ رلیاں" منا رہے ہیں۔ ایک کمرے میں مادھو لال اور درویش محو ناؤ نوش ہیں۔

دس مسلح افراد روز روز کی اس دانتا کل کل کو ختم کرنے کے لئے آندھی طوفان کی طرح' اس مکان پر حملہ آور ہوئے۔ عمارت کو نرغے میں لے لیا گیا مگر یہ دیکھ کر سارے حملہ آور حیران و ششدر رہ گئے کہ اس مکان کا تو کوئی دروازہ ہی نہیں۔ سیدھی سپاٹ دیواریں' کھڑی ان کا منہ چڑھا رہی تھیں۔ ایسا تو کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ بستی کا وہ مکان سب کا دیکھا بالا تھا۔ پڑوس کے لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی سب نے اقرار کیا کہ مکان پرانا ہے اور اس میں دروازے' کھڑکیاں موجود ہیں۔ یہ تماشا سب نے دیکھا اور ہجوم ورطہ حیرت میں ڈوبا۔ حملہ آور بے نیل و مرام' ناکام و نامراد' اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ بس پھر تو یہ تماشا اکثر و بیشتر

دہرایا جانے لگا۔ لاہور شہر میں جہاں جہاں سے خبر ملتی کہ شاہ حسین اپنے منظور نظر کے ہمراہ "رنگ رلیاں" منا رہے ہیں حملہ آور وہاں پہنچ جاتے کبھی مکان غائب پاتے کبھی در و دریچہ غائب ہوتے۔ یہ بات البتہ قابل غور تھی۔

ہندوؤں نے اسے جادو قرار دیا لہٰذا اپنے "ماہرین فن" کی معاونت کے طلب گار ہوئے مگر یہ جادو ایسا تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سب کچھ سب کے سامنے تھا لہٰذا جادوگر بھی عاجز آگئے۔ کسی کے پاس اس کا توڑ نہیں تھا۔ برہمن خاندان خون کے گھونٹ پینے پر مجبور ہوا۔

ادھر مادھو لال اپنے عزیز و اقرباء سے سارے تعلق توڑ چکا تھا۔ اس کا مرنا جینا اب شاہ حسین کے ساتھ تھا۔ قبول اسلام کی خبر بجلی بن کر برہمن خاندان پر گری۔ مادھو لال کے خاندان نے بھی ترکی بترکی جواب دیا اور اپنے "کپوت" سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا یہ 1015 ھ کا واقعہ ہے۔ شاہ حسین عمر عزیز کے 60 برس میں قدم رکھ چکے تھے اور مادھو لال، بیس برس کا خوبرو نوجوان تھا۔

سانپ گزر جائے تو اس کی لکیر باقی رہ جاتی ہے اسی طرح مادھو لال اپنے آبائی مذہب سے قطع تعلقی کے باوجود پرانی رسوم و قیود سے نجات حاصل نہ کر سکا تھا۔ ہولی، بیساکھی وغیرہ کے تہوار آتے تو اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ شاہ حسین اس بچپنے پر مسکرا کر رہ جاتے۔ یہ بات مستند ہے کہ انہوں نے اپنے نوگرفتار "بالک" پر کبھی کوئی قدغن نہ لگائی بلکہ بسا اوقات اس "کھیل تماشے" میں خود بھی مادھو لال کے ساتھ شریک ہوئے۔ ان کا مسلک ہی یہی تھا۔

بیساکھی کا تہوار آیا، برہمن خاندان شاہدرہ لاہور سے "گنگا سفر" پر روانہ ہوا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ گنگا اشنان سے ان کے پاپ ایسے جھڑ جاتے ہیں جیسے خزاں میں سوکھے پتے۔ یہ عقیدہ زیر بحث نہیں اسی کا نام تو اندھی تقلید ہے اور جب بصارت ہی نہ رہے تو قوت مدرکہ بہت بڑے وسیلے سے محروم ہو جاتی ہے اور جب قوت مدرکہ محروم ہو جائے تو سب کچھ "مرحوم" ہو جاتا ہے۔ خیر! مادھو لال، گنگا اشنان کی ضد کرنے لگا۔ اس بالک ہٹ پہ مرشد زیر لب مسکرایا۔

"گنگا اشنان کی آخر ضرورت کیا ہے؟" شاہ حسین نے بڑی رسان سے پوچھا۔

"بس میرا جی چاہتا ہے کہ میں سب کے ساتھ مل کر گنگا میں نہاؤں" مادھولال نے مسکرا کر

جواب دیا

"اس کے لئے کالے کوسوں کا سفر کرنا کوئی دانشمندی تو نہیں۔" شاہ حسین نے ایک عجیب وغریب حل پیش کیا۔ بات مادھو کی سمجھ میں آئی تو وہ دھک سے رہ گیا۔ آخر حرف مدعا ہونٹوں تک آہی گیا۔ "گنگا ماتا تو سفر کرنے سے رہی وہ تو کانپور کے اس پار بہت دور بہہ رہی ہے۔ ہم سفر نہیں کریں گے تو یہ سب کیسے ہوگا؟"

"عزیزم! اگر گنگا ماتا سفر کرنے سے معذور ہے تو ہم بھی نہیں جائیں گے مگر تم گنگا اشنان ضرور کروگے یہ میرا وعدہ رہا۔" شاہ حسین کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ مادھو لال خاموش ہوگیا۔ اس کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ کوئی انہونی بات ہونے والی ہے۔

"گنگا اشنان والے دن تم ہمیں یاد دلادینا' تمہاری مراد پوری ہوجائے گی۔" شاہ حسین نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

برہمن خاندان اور دوسرے ہندو سفر پر روانہ ہوگئے۔ گنگا اشنان والا دن آیا تو مادھو لال نے دھڑکتے دل کے ساتھ شاہ حسین کو ان کا وعدہ یاد دلایا "آج سب لوگ گنگا میں نہا رہے ہوں گے"

شاہ حسین حجرے میں کھڑے ہوگئے اور اپنا پاؤں آگے بڑھا کر کہا "میرے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ کر آنکھیں بند کرلو" مادھو لال نے اس حکم کی تعمیل کی "اب آنکھیں کھول کر سامنے دیکھو" شاہ نے دوسرا حکم دیا۔ مادھو نے آنکھیں کھولیں تو وہ کھلی کی کھلی رہ گئیں' سامنے دریائے گنگا بہہ رہا تھا اور مادھو لال کا خاندان اس میں نہا رہا تھا۔

"یہ........ یہ سب کیا ہے؟" مادھو نے لکنت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یہ راز ربانی ہے' بس خاموش رہو" شاہ نے انگشت شہادت کھڑی کرکے اسے لب بستہ رہنے کی تلقین کی "تم جا کر اشنان وغیرہ سے فارغ ہولو میں اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا"

مادھول لال کا خاندان بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ والدین کے دل میں یہ خیال آیا کہ شاید ان کا لخت جگر اپنے کئے پہ پچھتا رہا ہے۔

پرانے تعلقات کو توڑنا اور رسوم وقیود سے رہائی حاصل کرنا' بڑا ہی دشوار مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ رسم ورواج کی زنجیریں بڑی مضبوط ہوتی ہیں۔ سچائی کی طرف جانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی رسوم کی پابندی ہے۔ قرآن کھول کہ اس کی تصدیق کرلیجئے۔ ہر دور کے افراد نے

یہی سے بے تکا جواب دیا "ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایسا ہی کرتے پایا' اب ہم اس کی مخالفت کیوں کریں' ہمارے اجداد کے افعال ہی "سچائی" ہیں۔"

مادھول لال اشنان سے فارغ ہوا تو شاہ حسین نے حسب سابق اسے اپنے پاؤں پر پاؤں رکھنے کا حکم دیا۔ آنکھیں بند ہوئیں اور پل بھر بعد کھول دی گئیں۔ وہی لاہور تھا وہ حجرہ تھا وہی طالب و مطلوب۔

پھر یوں ہوا کہ مادھولال گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا

"اب کیا ہے عزیزم؟" شاہ حسین نے مسکرا کر پوچھا "وہ میری چھڑی گنگا کنارے ہی رہ گئی۔ مادھول لال نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"اب ہم گنگا کنارے نہیں جائیں گے" شاہ نے عمداً تنگ کرنے والے لہجے میں کہا" مگر میری چھڑی تو بڑی قیمتی ہے" مادھو نے مایوسی سے کہا۔

"آرام سے بیٹھو' گنگا تمہاری چھڑی لے کر بس آتی ہی ہو گی" "یہاں' یعنی اس حجرے میں؟ مادھو نے حیرت سے اپنے رہنما کی طرف دیکھا۔ شاہ حسین نے مسکرا کر اپنے مصلے کا کونا اٹھایا تو مادھو پھر ورطہ حیرت میں ڈوب گیا اس نے دیکھا کہ وہی کنارہ ہے وہی گنگا گھاٹ اور اسے اپنی چھڑی بھی نظر آ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اپنی چھڑی قابو کی مگر اس بار ان محیر العقول واقعات کی تشریح بھی طلب کی۔ بڑی شے چھوٹی شے میں کیسے سما سکتی ہے؟" مادھو نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"جیسے آسمان کی وسعتیں آنکھ پتلی میں سما جاتی ہیں' میری آنکھوں میں دیکھو تمہیں اپنا چہرہ میری آنکھ کے "تل" میں نظر آئے گا۔ اسی طرح دل بظاہر چھوٹی سی شے ہے مگر بے کراں کائنات' اس کے ایک گوشے میں سما جاتی ہے" شاہ حسین کی گفتگو سے مادھو مطمئن ہو گیا۔ وہ حجرے سے باہر آیا تو ایک بدلا ہوا انسان تھا' حق و باطل میں تمیز کرنے والا انسان اور اس میں تمیز کا اعلان کرنے کی جرات بھی پیدا ہو چکی تھی لہٰذا اس نے اپنے "حلقہ بگوش اسلام" ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان کے بعد بھی شاہ حسین نے اپنے منظور نظر پر پرانی رسومات ادا نہ کرنے کی پابندی عائد نہیں کی۔ بسنت پنچمی' ہولی دیوالی وغیرہ کے تہوار منائے جاتے رہے۔ دیوالی کے موقع پر چراغاں' ہولی پر رنگ وغیرہ پھینکنا' بسنت کے تہوار پر پتنگ بازی۔ ہولی کے ایک

موقع پر تو مادھو نے اپنے مرشد کا لباس بھی رنگین کر دیا۔ احباب شاہ حسین، مادھو کی خوشنودی کے لئے ان تہواروں میں حصہ لیتے۔ پس مرگ، مزار شاہ حسین پر میلہ چراغاں بڑی دھوم دھام سے لگا کرتا تھا۔ یہ میلہ چراغاں اسی دور کی یاد تازہ کیا کرتا تھا۔ اس میلے کی باقیات آج بھی موجود ہیں مگر قیام پاکستان کے بعد رفتہ رفتہ جوش و ولولے میں کمی آتی چلی گئی۔ آج صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ پہلوانوں کے دنگل، بٹیروں کی پالیا اور دیگر رونقیں قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔ شاہ حسین کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز کر چکی تھی بہت کچھ تعلیم کیا جا چکا تھا مگر بہت کچھ ابھی باقی تھا ادھر وقت تھا کہ پھر لگا کر اڑا جا رہا تھا۔ مادھو لال صاحب ''قال'' تو ہو چکا تھا مگر ابھی اسے صاحب ''حال'' بننا تھا۔ آخر جس لمحے کا شاہ حسین کو انتظار تھا وہ آپہنچا، پہلے ظرف کی وسعت مقصود تھی۔

''دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر''

والی بات تھی۔ ظرف چھلک جائے تو اپنے ساتھ گرد و پیش کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ بابو پورہ (موجودہ باغبانپورہ) کا بابو ڈھڈی بستی کا محترم رئیس اور شاہ حسین کا عقیدت مند تھا۔

''مادھو لال میرے عزیز چلو بابو پورہ چلیں'' ایک روز شاہ حسین نے کہا ''کنج تنہائی میں باتیں ہوں گی

''اور کون کون ساتھ ہو گا۔؟'' مادھو نے بر سبیل تذکرہ پوچھا

''اس سفر میں ہم دونوں تنہا ہوں گے، گوشہ عافیت کا انتظام کر لیا گیا ہے'' شاہ نے معنی خیز مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''کوئے ملامت میں رسوائی بھی تو ہو گی'' مادھو لال نے سر جھکا کر یاد دلایا۔

''ان بکھیڑوں سے بہت دور جانے کا وقت آ گیا ہے۔ رسوائی، ملامت، تہمت ان باتوں کی پرواہ نہ کیا کرو۔'' مادھو لال کی تسلی ہوئی تو اس نے سر تسلیم خم کر دیا۔ ویسے بھی وہ اتنا کچھ دیکھ چکا تھا جو اس کی سات پشتوں کو حیرت زدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ دونوں بابو پورہ پہنچے۔ بابو ڈھڈی دیدہ و دل فرش راہ کئے بیٹھا تھا۔ اس نے تکمیل ارشاد میں الگ مکان کا بندوبست کر دیا اور سامان عیش و طرب بھی فراہم کیا۔

شاہ حسین اپنے منظور نظر کو لے کر کمرے میں داخل ہوئے اور اپنے عقید مند بابو ڈھڈی کو تلقین کی۔ ''آج رات کوئی اس طرف نہ آئے ہم مکمل تنہائی چاہتے ہیں'' شاہ کی یہ

بات البتہ عقیدت مند کو ہضم نہ ہو سکی۔ عموماً محفل ناؤنوش میں دوسرے بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اسے وسوسوں نے آگھیرا۔ ”یہ عمر رسیدہ درویش اور اس کا خوبرو مرید‘ آخر تنہائی میں کیا کرنے والے ہیں؟“ بابو ڈھنڈی کی دلی کدورت‘ خیالات کا لبادہ اوڑھنے لگی۔

انسان اپنی حسب منشاء اشیاء کو دیکھنے کا خواہشمند رہا ہے اور رہے گا۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں۔ انوکھی بات تو یہ بھی نہیں کہ تاریکی میں اپنے خیالات ہی مختلف روپ دھار کر ہمارے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ چشم تصور کی کرشمہ سازیوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ شاہ حسین نے کمرے میں جلنے والا چراغ بھی گل کر دیا۔ ”مادھو لال نے حیران ہو کر پوچھا ”یہ چراغ کیوں گل کر دیا؟“ ”اس کی ضرورت ظاہری آنکھ کو ہوتی ہے‘ ویسے بھی یہ بزم طرب ہے اور خوشی کی محفل میں جلنے والوں کا کیا کام؟“ جواب تو بڑا مدلل اور خوبصورت تھا مگر مادھو لال کی تشفی نہ ہوئی لہٰذا مرشد نے چراغ روشن رہنے دیا۔ محفل راز و نیاز سے آغاز ہوا اور بابو ڈھنڈی اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا اور دروازے کے کیواڑ کی درز میں سے اندر جھانکنے لگا۔ جو کچھ اسے نظر آیا وہ ضرورت سے زیادہ تھا‘ شاہ حسین کے ہونٹ مادھو لال کے رخسار کے قریب تھے وہ اس دھماکہ خیز منظر کی تاب نہ لا سکا اور بھاگم بھاگ اپنے دوستوں کے پاس پہنچا۔

”اندر تو بڑی خرابی والی باتیں ہو رہی ہیں“ اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔

انہی احباب میں غالب جنگ نامی صاحب ظرف و شرف انسان بھی موجود تھا۔ اس نے بابو کو ٹوکا ”سوء ظن سے پرہیز کرو“ آنکھ کی گواہی اکثر دھوکہ دے جاتی ہے پھر دوسروں کے معاملات میں مداخلت شرفاء کا شیوہ نہیں“

”اچھا تو شریف انسان! تم خود جا کر سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ لو“ بابو نے زہر خنداں سے جواب دیا اندر تو رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔“

”مجھے دیکھنے کی ضرورت ہے نہ تمنا“ غالب جنگ نے عجیب لہجے میں کہا ”میں یہیں بیٹھے بیٹھے ہر چیز کا مشاہدہ کر سکتا ہوں۔“

”تو گویا آپ بھی مقام ولایت پر فائز ہیں‘ اچھا بتائیں اندر کیا ہو رہا ہے؟“ بابو نے تمسخرانہ لہجے میں کہا

”شاہ حسین اپنے مرید کو رازہائے ربانی تعلیم کر رہے ہیں اور یہ بڑے نصیب کی بات

ہے" غالب جنگ نے تمسخرانہ لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے جواب دیا "اگر یقین نہ ہو تو ایک بار پھر جاکر اندر جھانکو، تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

"میں ایسا ضرور کروں گا کیونکہ اب منظر اپنے "عروج" پر ہوگا۔ ان الفاظ کے ساتھ بابو ڈھڈی درِ حجرہ پر پہنچا اور کیواڑ کے سوراخ سے آنکھ لگا کر اندر جھانکنے لگا۔ رفتہ رفتہ منظر کی دہشت سے اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں وہ بمشکل اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکا۔ اندر نہ مادھو لال تھا نہ شاہ حسین بلکہ دو خونخوار شیر بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، بابو گرتا پڑتا، اپنے دوستوں کے قریب آیا اور بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ غالب جنگ اسے ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے بابو ڈھڈی "وقفہ، تسلیم و رضا سے عالم ہوش میں آیا تو شدت خجالت سے وہ زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ "مجھ سے پہاڑ ایسی غلطی ہوئی" اس نے ندامت سے سر جھکا کر اعتراف کیا خدا مجھے معاف فرمائے میں نے کیا دیکھا اور کیا سمجھا؟ واقعی سوظن انسان کو تباہ و برباد کر دیتا ہے، اب خدا جانے میرا کیا حشر ہوگا۔"

شاہ حسین نے اپنے منظور نظر کو کیا تفویض کیا؟ اس کی تفصیل کون بیان کر سکتا ہے؟ اس بات کا دعویٰ کرنا مضحکہ خیز ہے البتہ بعد کے شواہد سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ مرد کامل کی نگاہ نے مادھو کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ چند باتیں منظر عام پر ضرور آئیں مثلاً یہ کہ مادھو اس راز ربانی کی تادم آخر حفاظت کرے گا۔ فقرا والے طور طریقے اپنائے گا نہ ان جیسا لباس زیب تن کرے گا، اور سب سے اہم بات کہ ایک عام دنیادار کی طرح زندگی بسر کرے گا۔ رزق حلال کے لئے ملازمت اختیار کرنا پڑی تو وہ بھی اختیار کر لے گا۔ شاہ نے اپنے مرید باصفا کو اپنے سفر آخرت کے متعلق بھی آگاہ کر دیا اور واضح الفاظ میں اڑتیس برس کی عمر تک درویشی سے دور رہنے کی تلقین کی۔

"میری موت کے تیرہ برس بعد میرے مزار پر آجانا" شاہ نے دوٹوک الفاظ میں کہا

"اس وقت تمہاری عمر اڑتیس برس ہوگی اور یہی تمہاری درویشی کے ظاہری دور کا آغاز ہے۔ اس طرح مادھو لال کی ساری زندگی کی منصوبہ بندی کی گئی۔ مادھو لال اب "مقامات حیرت" سے آگے نکل چکا تھا۔ اس نے ساری باتیں بغور سنیں اور ان پر حرف بحرف عمل پیرا ہونے کا وعدہ کیا۔ شاہ حسین نے اسے مغل فوج میں شمولیت اختیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ بات البتہ ناقابل فہم سی ہے۔ اس کی عقل دلیل تو یہی دی جا سکتی ہے کہ شاہ حسین اپنے منظور نظر

کو لاہور سے دور بھیج دینا چاہتے تھے، ممکن ہے، مادھولال اور شیخ ارزانی میں ممکنہ چپقلش کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہو یا اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاہ حسین کی اپنی شخصیت متنازعہ فیہ بن چکی تھی اور وہ حاکم وقت، دین الٰہی کے موجد اور سرپھرے اکبر سے ٹکراؤ نہ چاہتے ہوں۔ ایک بار تو حاکم وقت خفت سے دوچار ہو چکا تھا مگر دوبارہ ٹکراؤ کی صورت میں مادھولال بھی زد پر آسکتا تھا۔

خلافت شاہ حسین پر شیخ ارزانی کی دیرینہ خواہش کا تدارک تھا یا معروضی حالات کا تقاضا، اس کے متعلق صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ بات مستند ہے کہ مادھولال افواج اکبری میں شامل ہو گیا۔ فوج کا یہ حصہ راجہ مان سنگھ کی زیر کمان تھا اور راجہ مان سنگھ ان دنوں اڑیسہ سے ملحقہ علاقے، دکن کو زیر کرنے میں مصروف تھا۔ یہ علاقہ لاہور سے کالے کوسوں دور تھا۔ مادھولال بادل نخواستہ فوج میں بھرتی ہو کر راجہ مان سنگھ کے پاس جا پہنچا۔

حکمت ربانی ملاحظہ ہو کہ شاہ حسین، مغل شہنشاہ اکبر سے دلی نفرت کے باوجود اس کی افواج کا دوبار مددگار ثابت ہوا۔ ایک بار جب ابوالفضل، عبدالرحیم خان خاناں کو لے کر دربار درویش میں حاضر ہوا اور دوسری بار تو اس نے اپنے منظور نظر مادھول لال کو راجہ مان سنگھ کے حوالے کر دیا۔

تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ معاونت، واقعی بروقت اور اشد ضروری تھی۔ خان خاناں کے ہاتھوں فتح سندھ کی تفصیل تو بیان کی جا چکی ہے یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ دکن کی مہمات کے دوران مادھولال کی موجودگی بھی بے حد ضروری ثابت ہوئی۔ غیر منقسم ہندوستان کا یہ دور افتادہ علاقہ ہر میں ناقابل تسخیر نہیں تو خطرناک ترین علاقہ ضرور رہا ہے حد یہ ہے کہ بیرونی حملہ آور آرین تک یہاں نہ پہنچ پائے۔ علاؤ الدین خلجی پہلا ارادے کا پکا انسان تھا جو اس علاقے پر حملہ آور ہوا۔ ان دنوں وہ اکڑہ (الہ آباد) کا گورنر تھا۔ جنوبی ہند یعنی دکن کے علاقے تک حملہ آور ہوا۔ ان دنوں وہ اکڑہ (الٰہ آباد) کا گورنر تھا۔ جنوبی ہند یعنی دکن کے علاقے تک رسائی کے لئے پانچ رکاوٹیں عبور کرنا پڑتی تھیں۔ کوہ ست پڑا اور کوہ بندھیا چل دو پہاڑ، دو شوریدہ سر دریا یعنی دریائے نربدا اور تاپتی ان کے درمیان ایک مہیب گھنا جنگل تھا جسے "ڈنڈک" کہتے تھے۔ اب یہ مہم راجہ مان سنگھ کو سر کرنا تھی اور مادھولال شاہ حسین کا منظور نظر، اس کی فوج کا ادنیٰ سپاہی تھا۔

راجہ مان سنگھ افواج اکبری کا قابل اعتبار سپہ سالار' مزاجا" مسلمانوں کی طرف مائل تھا شہزادہ سلیم کا برادر نسبتی بھی تھا۔ دین اسلام کی طرف اس کے فطری رجحان کے سلسلے میں دو ایک مشہور واقعات سپرد قلم کئے جاتے ہیں۔

عہد اکبری ایک لادینی دور تھا۔ مذہبی رواداری اور چیز ہے مگر دین کی جڑوں پر وار کرنا۔ چیزے دیگر است "مذاہب کا تقابلی جائزہ کے موضوع کے تحت مناظروں کا انعقاد ہوا کرتا تھا یہ ایک اچھی رسم تھی مگر اس کا انجام اچھا ثابت نہ ہوا۔ خیر! آمدن بر سر مطلب' اسی قسم کے ایک مناظرے میں راجہ مان سنگھ کو کرسی انصاف پر بٹھادیا گیا۔ یہ ایک سید اور برہمن کے درمیان' دلائل کی جنگ تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے دین کے حق میں دلائل دیئے۔ ہندو برہمن کو پورا یقین تھا کہ فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔ مناظرے کے بعد جب راجہ اپنا فیصلہ سنانے لگا تو وہ بھی مخمصے کا شکار ہوگیا ایک طرف سچائی تھی تو دوسری طرف تعصب' ایک طرف جذبات تھے تو دوسری طرف فہم و فراست۔ آخر اس نے فراست سے کام لیتے ہوئے کہا۔ میں کوئی عالم فاضل شخص تو نہیں عملی انسان ہوں۔ ہندوؤں میں ایک شخص خواہ کتنا ہی بلند مرتبت ہو' اس کی موت کے ساتھ ہی اس کے فیوض و برکات کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ ہندو لاش کو جلا کر اس کی راکھ تک بہادیتے ہیں گویا خود اس شخصیت کو صفحہ ہستی سے مٹادینے کا اہتمام کرتے ہیں' جبکہ مسلمانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس مذہب میں تو بلاامتیاز رند و متقی' مرنے کے بعد اس کی لاش کو بڑے احترام سے نہلا کر سپرد خاک کردیا جاتا ہے۔ ہر شہر میں ایسے ایسے بزرگان دین کے مزار موجود ہیں جہاں ذہنی آسودگی کی خاطر مخلوق ہر پل' ہر لمحہ جاسکتی ہے اس کے مقابلے میں ہندو اپنے مرنے والوں سے دشمنوں جیسا سلوک کرتے ہیں اور مرنے والا بھی شاید اسی کا بدلہ لیتا ہے' چنانچہ شمشان گھاٹ میں رات ڈھلتے ہی بھوتوں کا راج شروع ہوجاتا ہے۔

راجہ مان سنگھ نے اپنی عقل کے مطابق اسلام کی فوقیت کے حق میں فیصلہ دے دیا اور دلیل بھی لاجواب دی۔ اسی طرح چکرورتی راجہ کی گوشمالی کے لئے جب مان سنگھ نے بنگال پر چڑھائی کی تو مونگیر کے مقام پر ایک صاحب حال و کمال شخص "شاہ دولت" کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب نے دعائے خیر و برکت کے بعد اس کے ذہنی رجحان کے مدنظر راجہ کو دین اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ مان سنگھ نے کہا شاہ صاحب "ختم اللہ علیٰ

قلوبھم" کے مصداق میرا دل مقفل ہو چکا ہے' آپ اپنی توجہ سے یہ قفل شقاوت کھول دیں میں ابھی اسلام قبول کرلوں گا" یہ کہا اور اسی جگہ دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ ایک دو دن نہیں پورا ایک ماہ گزر گیا وہ "قفل" کھلنا تھا نہ کھلا۔ بعض لوگ شاہ دولت کو دوش دیتے ہیں' بعض کے خیال میں' مان سنگھ بد نصیب تھا امر واقعہ کیا تھا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

مادھولال ایک عام سپاہی کے روپ میں مان سنگھ کے لشکر میں موجود تھا جب مغل افواج کا دکنی فوج سے ایک زبردست معرکہ ہوا۔ دکنی فوج کی سربراہی مشہور و معروف حبشی جرنیل "عنبر" کر رہا تھا جو فنون سپہ گری میں اپنی مثال آپ تھا۔ سالار با صلاحیت ہو تو فوج کی کارکردگی بے مثال ہوتی ہے۔ دکنی فوج اس بے جگری سے لڑی کہ مغل فوج کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ مان سنگھ کے تو ہوش اڑ گئے۔ فوج میں بھگدڑ' متعدد بیماری کا درجہ رکھتی ہے۔ دیکھا دیکھی سپاہی بھاگنے لگے۔ مان سنگھ گھوڑا دوڑائے کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کوئی نادیدہ ہاتھ اس کے کاندھے پر موجود ہے۔

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور سوچا "میں تو گھوڑے پر سوار ہوں اور کوئی شخص اتنا بلند قامت کیسے ہو سکتا ہے جو گھوڑ سوار کے کاندھے پر ہاتھ رکھ سکے" پھر اس کی نظر ایک ایسے سپاہی پر پڑی جو بڑی بے فکری سے میدان جنگ میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ یہ مادھولال تھا۔

مان سنگھ اس کے مقام و مرتبے سے تو قطعا" نا آشنا تھا مگر اس کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یہ سپاہی کوئی خاص چیز ہے۔ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مصداق راجہ نے رحم طلب نگاہوں سے مادھولال کی طرف دیکھا۔

"فکر و اندیشے کی کوئی ضرورت نہیں" مادھو نے حرف تسلی سے نوازا۔ اب تو مان سنگھ کو یقین آگیا کہ سپاہی کوئی غیر معمولی شخصیت ہے وہ فوراً گھوڑے سے کود کر نیچے اترا اور مقام و مرتبے کو پس پشت پھینک کر دست بستہ' مادھو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مہاراج مجھے تباہ و برباد ہونے سے بچالیں۔"

"راجہ مان سنگھ تم فوج کے سپہ سالار ہو' ہوش میں آؤ" مادھولال نے سرزنش کی "اس بندہ ناچیز نے کہہ دیا ہے کہ کامیابی تمہارے نام لکھ دی گئی ہے اور خدا اپنے حقیر بندے کو جھوٹا ثابت کر کے رسوا نہیں کرے گا"

"مگر حضور! یہ سارے بزدل تو بھاگے جا رہے ہیں مان سنگھ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا

تھا۔

مادھولال نے آنکھیں بند کر کے زیر لب کہا "یا حضرت اب کیا کروں؟"

شاہ حسین اس وقت لاہور میں دوست احباب کی محفل سجائے بیٹھے تھے اچانک انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا' پھر اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ "حضرات! میں تھوڑی دیر کے لئے بہ امر مجبوری باہر جا رہا ہوں" انہوں نے حاضرین مجلس سے معذرت چاہی آپ لوگ تشریف رکھیں میں ابھی حاضر ہوا"

"آپ جا کہاں رہے ہیں؟ آخر بات کیا ہے؟" ایک دوست نے پوچھا "حضرت کچھ ایسی ہی بات ہے" یہ کہہ کر شاہ حسین تیز تیز قدم اٹھاتے محفل سے باہر نکل گئے اور دوسرے پل لاہور سے ہزاروں میل کی مسافت پر میدان جنگ میں پہنچ گئے۔ "عزیزم' کیا معاملہ ہے؟" مادھولال اپنے مرشد کو سامنے دیکھ کر مسکرانے لگا پھر اس نے ساری صورتحال ان کے گوش گزار کی۔ دکنی فوج قہر خداوندی بن کر مغل فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھی' مغل فوج' سب اہم شے' حوصلہ ہار چکی تھی۔

"اپنے سالار سے کہو دونوں ہاتھ بلند کر کے فوج کو آواز دے پھر اشارے سے لشکریوں کو بلائے" شاہ حسین کی تجویز پر فوراً عمل کیا گیا۔ مان سنگھ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بھاگتے ہوئے سپاہی پلٹ کر زخمی شیروں کی طرح حملے کرنے لگے پھر ایک اور عجیب و غریب بات ہوئی۔ ایک تازہ دم فوج میدان جنگ میں آموجود ہوئی اور دکنی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ دکنی فوج شکست سے ہمکنار ہوئی۔

"لاہور میں دوست احباب میرے منتظر ہیں لہٰذا عزیزم خدا حافظ" یہ کہہ کر شاہ حسین لاہور پہنچ گئے۔ ہر چیز پہلے کی طرح جوں کی توں موجود تھی' محفل ناؤنوش کا از سر نو آغاز ہوا جنگ ختم ہوئی تو راجہ مان سنگھ' مادھولال کو لے کر اپنے خیمے میں آیا اور بے اختیار اس کے قدموں پہ سر رکھ دیا۔ "حضور! میں آپ کے مقام و مرتبے سے قطعاً" نا آشنا تھا لہٰذا میری خطا معاف فرمائیں۔ آپ کے طفیل شاہ حسین کی زیارت بھی ہو گئی یہ میری خوش نصیبی کی انتہا ہے۔

"مان سنگھ' ہم کیا اور ہماری بساط کیا' یہ سب اللہ کا کرم اور اس کے حبیب کی کرم نوازی ہے" مادھولال نے انکساری سے جواب دیا۔ "یہ ملازمت میں نے مرشد کے ایما پر کی تھی

لیکن اب میرا راز فاش ہوچکا ہے اور ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ مجھے ملازمت سے سبکدوش کردیا جائے' اب میں بقیہ زندگی لاہور' اپنے پیرو مرشد کی مصاحبت میں گزارنا چاہتا ہوں"

راجہ مان سنگھ نے مادھولال کے سفر کا مناسب اہتمام کیا اور وہ لاہور شاہ حسین کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ 1008ھ میں شاہ حسین کا وصال ہوا تو مادھولال ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ شاہ حسین کی وصیت کے مطابق راوی کنارے شاہدرہ میں انہیں دفن کیا گیا۔ مادھولال کا حال بالکل ویسا ہی ہو رہا تھا جیسا شیخ نظام الدین اولیاء کے وصال کے بعد امیر خسرو کا ہوا تھا۔ وہ دن رات تربت سے لپٹ کر روتا رہتا۔ آنکھ دریچوں سے رس رس کر جان خارج ہوتی رہی' کوئی حرف تسلی کارگر ہوتا نہ غم خواروں کی قربت سکون بخشتی۔ سب کو یقین تھا کہ مادھولال اس غم سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ مسلسل ایک برس یہی کیفیت رہی تربت حسین سے ایک پل کی جدائی بھی اسے گوارا نہ تھی۔ ایک رات وہ تربت یار سے لپٹ کر روتے روتے سو گیا۔ عالم خواب میں شاہ حسین آئے۔ "جان من! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" انہوں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "موت' زندگی کا اختتام نہیں' یہ تو اصل زندگی کا آغاز ہے۔ یہ دوریاں' یہ فاصلے' ان کی کوئی حقیقت نہیں تم اپنی ملازمت پر واپس چلے جاؤ' مان سنگھ تمہارا منتظر ہے یاد ہے تم نے وعدہ کیا تھا؟"

آنکھ کھلی تو پہاڑ جیسا بوجھ سر سے اتر چکا تھا دوسرے روز مادھولال' حسب ارشاد ملازمت پر روانہ ہو گیا۔ مان سنگھ نے بصد احترام استقبال کیا 1021ھ میں مرشد کے حکم کے عین مطابق وہ مدت ملازمت پوری کر کے دوبارہ لاہور آیا۔ شاہ حسین کی پیش گوئی کے عین مطابق' 3 برس بعد نعش مبارک کو شاہدرہ سے موجودہ مقام پر منتقل کیا جا چکا تھا (اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی) مادھو عمر عزیز کے 38 ویں برس میں قدم رکھ چکا تھا یہی سال' اس کی ولائت کے اظہار کا تھا۔ مزار پر خاکی نامی نو مسلم جوگی موجود تھا۔ اس نے مقصد امانتیں مادھو کے سپرد کیں اور روایت ہے کہ وہ زندہ زمین میں سما گیا۔ اس زمانے میں یہ مثل مشہور ہوئی "مادھو آیا خاکی سمایا" 35 برس تک مادھو تربت حسین پر مجاور بن کر خدمت سرانجام دیتا رہا۔ 1056ھ 73 برس کی عمر میں وہ اپنے پیرو مرشد سے جا ملا۔ دونوں طالب و مطلوب' ساتھ ساتھ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ دونوں کی تربتیں ساتھ ساتھ بالکل ایک جیسی سنگ سفید سے تعمیر کی گئی ہیں۔ سنگی کتبے پر مرقوم ہے

راز حسین کا امین' معشوق و محبوب نازنین حضرت شیخ مادھو قادری
وصال 22 ذوالحجہ 1056ھ ولادت 983ھ

شاہ حسین اور مادھو لال کا تعلق ویسے تو صرف سات برس پر محیط تھا مگر یہ سات برس کی طوالت صدیوں پر بھاری معلوم ہوتی ہے یک جان و دو قالب والی مثال سے بڑھ کر معاملہ تھا۔ مادھو لال حسین کے نام ہی پر غور کریں۔ دو تہائی مادھو لال ہے اور صرف ایک تہائی حسین لیکن اس کے باوجود اس سے مراد شاہ حسین ہی تھا' ہے اور رہے گا۔ لفظ "شاہ" قربان کر کے 'مادھو لال اپنایا گیا۔ ہے کوئی ایسی مثال تعلق خاطر کی۔؟

شاہ حسین اول تو کسی کو مرید ہی نہ بناتے تھے اگر بہ امر مجبوری ایسا مرحلہ طے کرنا پڑ جاتا تو شرائط بڑی کڑی ہوا کرتی تھیں **مثلاً**" پہلے داڑھی منڈواؤ اور جام قبول کرو۔ جب ملا عبدالحکیم سیال کوٹی' صدق دل سے مرید ہونے گئے تو درویش نے مسکرا کر کہا "تم ٹھہرے قیل و قال والے ملا' مجھے دنیا میں رسوا کر دو گے' یہ نبھا ممکن ہی نہیں"

ملا موصوف کی علمی فضیلت کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس دور میں لوگ ان کو بو علی سینا اور ابو نصر فارابی کا ہم پلہ قرار دیتے تھے۔ ایسے لوگ اگر شاہ حسین کو مرشد و راہبر ماننے کے لئے بے چین تھے تو شاہ حسین کا علمی مقام و مرتبہ کیا ہو گا؟ یہ موضوع بذات خود ایک مکمل قسط کا متقاضی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں شاہ حسین کے نزدیک لفظ فقر اور درویش کا مفہوم۔ بقول درویش' حرف "ف" سے مراد' فقر و فاقہ و فنا' فرائض حق ادا کرنا اور فسق و فجور سے مکمل پرہیز کرنا۔

ق:۔ قناعت' قصد اور قرب حق کی تمنا۔

ر:۔ ریاضت' رضاء الٰہی پر راضی ہونا اور روئے دل ماسوا (غیر خدا) سے پھیرنا۔

لفظ درویش کی تشریح شاہ حسین نے کچھ اس طرح کی۔

د:۔ درد دل۔

ر:۔ ریاضت میں مگن رہنا اور رو ریا کو ترک کرنا' رخصت ماسوا۔

و:۔ وحدت' وداع وجود اور واصل بالحق۔

یے:۔ یقین محکم یاری صرف حق سے' یاد حق سے ایک پل غافل نہ رہنا' یک رنگ و یک دل یعنی شرک سے مکمل پرہیز کر کے صرف ذات حق کے رنگ میں ڈوب جاتا۔

ش:۔ شکر ادا کرنا (ہر پل ہر سانس) شکوہ شکایت سے دور رہنا' شرم و حیاء۔

ان حروف کی تشریح پر غور کیا جائے تو شاہ حسین کی ذات والہ صفات کھل کر سامنے آ

جاتی ہے اور ان تمام فسق و فجور سے بھرپور، غیر شرعی افعال کی قلعی کھلی جاتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید ثبوت ہے کہ شاہ حسین کے حجرہ دل میں ذات حق کا بسیرا تھا۔ باقی ساری باتیں مسلک ملامتیہ کے زمرے میں آتی ہیں۔

شاہ حسین سفر کے عادی نہ تھے ایک ضعیف روایت کے مطابق لاہور سے امرتسر کا سفر کیا جس کا متن کچھ اس طرح ہے۔

جس زمانے میں گورو ارجن دیو "گرنتھ صاحب" کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے، اسی زمانے میں کاہنا بھگت، چھجو بھگت، پیلو بھگت اور شاہ حسین لاہور میں موجود تھے (گورو ارجن دیو کا زمانہ 1563ء سے 1606ء تک کا ہے) "گورو بلاس" کے مولف کا بیان ہے کہ گورو ارجن دیو کی شہرت سن کر یہ چاروں درویش، گورو جی سے ملنے امرتسر پہنچے اور "سرودر" نامی وسیع و عریض تالاب کے کنارے ملاقات ہوئی۔ گورو ارجن دیو نے کہا "بڈکرپا، ہم پر کری، دئیو درس الیہ وار" (آپ حضرات نے مجھے روشن دے کر بڑی مہربانی سے نوازا) پھر انہوں نے تمام "بھگتوں" سے کلام کی فرمائش کی شاہ حسین کی باری آئی تو انہوں نے اپنی "کافی" سنائی

شاہ حسین تب کیہہ سناوے بولن دی ایتھے جانا ہے

چپ وے اڑیا چپ کر جاوے

(تب شاہ حسین کہے یہ بولنے کی جگہ نہیں اس لئے اے دل، خاموش ہو جا)

شاہ حسین کا سن ولادت اور سکھ مذہب کے بانی گورو بابا نانک کا سن وفات ایک ہی ہے یعنی 1538ء اس بات کی سکھوں کے ہاں بڑی اہمیت ہے وہ اسے طرح طرح کے رنگ دیتے ہیں۔ گورو بابا نانک چونکہ اہل تصوف کی طرح ہر مکتبہ فکر میں مقبول تھے لہٰذا اس "ولادت و وفات" والی بات کا یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ 1538ء میں گورو جی کی "فکری ولادت" ہوئی۔ گورو بابا نانک نہ صرف پنجابی کے قادر الکلام شاعر تھے بلکہ مستند روایات کی رو سے انہوں نے بابا فرید گنج شکر کے مزار پر حاضری دی اور ان کے "دوہوں" کو محفوظ کر لیا۔ بہرحال شاہ حسین کی امرتسر سے حاضری والی بات اس لئے قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ گرنتھ صاحب، میں اپنے کلام کو شامل کرنے کی غرض سے، شاہ حسین کا امرتسر جانا ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ عام خیال یہی ہے کہ گرنتھ صاحب میں شاہ حسین اور بابا فرید

گنج شکر کا کلام موجود ہے۔ ہمارے لئے اعزاز والی بات ہو نہ ہو، سکھوں کے نزدیک گرنتھ صاحب میں شاہ حسین کا کلام، موصوف کے لئے قابل صد افتخار بات ہے۔ لاجونتی رام کرشن نے پنجابی صوفی پوئٹس "PUNJABI SUFI POETS" میں واضح الفاظ میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ "گرو گرنتھ" میں شاہ حسین کی شاعری شامل کی گئی۔

مادھو لال کے علاوہ شاہ حسین کا حلقہ احباب جن حضرات پر مشتمل تھا ان میں میاں شعبان، ابراہیم، ملا محمود، شیخ یعقوب، بہار خاں، بابو ڈھڈی، قاضی شاہ، بابا حاجی، عبدالسلام، شہاب الدین کالو، یسین، اور محمد صالح سرفہرست ہیں یہ لوگ گویا مقبولان شاہ حسین میں شمار ہوا کرتے تھے اور ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی یہی حضرات تھے۔

کرامات شاہ حسین میں، حاجی یعقوب کا قصہ سرفہرست ہے۔ اس شخص نے عمر عزیز کا پیشتر حصہ سرزمین حجاز پر بسر کیا۔ مسجد نبوی اور خانہ کعبہ، ان دو مقامات مقدسہ پر سجدوں سے لطف اندوز ہونا، اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا ایک روز اس کی ملاقات شاہ حسین سے ہو گئی۔ یہ جان پہچان دوستی کے مراحل طے کرتے کرتے اُنسیت میں بدل گئی۔ فریضہ حج دونوں نے اکٹھے ادا کیا۔ یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ برسہا برس تک دونوں طواف کعبہ اور روضہ رسولؐ پر حاضری دیتے رہے حاجی یعقوب، شاہ حسین کے خشوع خضوع سے بڑا متاثر ہوا۔ کئی سال بعد گردش زمانہ کے زیر اثر وہ لاہور آ گیا۔ شاہ حسین کو سربازار محو رقص و سرور دیکھا تو پہچان ہی نہ سکا۔ آخر اس نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی سے پوچھا "یہ ڈھول کی تال پر رقص کرنے والا فاسق و فاجر چہرہ مجھے آشنا لگتا ہے مگر یہ کون ہے؟"

"یہ گدائے رسول اور عاشق خدا، شاہ حسین ہے" اس شخص نے جواب دیا۔

"لاحول ولا" یعقوب بے اختیار پکار اٹھا "تلاش حق کا یہ کون سا طریقہ ہے؟" شاہ حسین کے نام پر حاجی صاحب کی یاداشت میں سرزمین حجاز والے یار غار کا چہرہ ابھرا اور وہ لپک کر محو رقص شخص کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "اگر میرا حافظہ بے وفائی نہیں کر رہا تو ہم دونوں، کافی عرصہ سرزمین حجاز پر رکوع و سجود سے لطف اندوز ہو چکے ہیں، مگر یہ کیا خرافات ہیں؟ تم نے ابلیس کی پیروی میں سب کچھ بھلا دیا۔ کیا وہ رنگ بالکل کچا تھا؟"

"میرے بھائی خاموش رہو" شاہ حسین نے سرگوشی کی "اگر تم میں صلاحیت ہے تو میرے اندر

جھانک کر دیکھو تمہاری تسلی ہو جائے گی۔"

"میں ان چمتکاروں کا قائل نہیں تم نے بڑے سستے داموں اپنی عاقبت بیچ ڈالی' افسوس صد افسوس"

حاجی یعقوب دلی رنج سے کف افسوس ملنے لگا شاہ حسین اس کی تشویش سے بڑے متاثر ہوئے

"اچھا میرے بھائی ذرا آنکھیں بند کر کے چشم تصور سے تماشا کر"

حاجی یعقوب نے آنکھیں بند کیں تو نظارگی میں ایسا محو ہوا کہ انہیں کھولنا ہی بھول گیا۔ مسجد نبوی اپنے پورے تقدس کے ساتھ سامنے تھی اور روضہ رسولؐ کے دروازے پر' شرعی لباس اور وضع قطع میں شاہ حسین وہاں موجود تھے۔

"بھائی اب آنکھیں کھول دے" شاہ حسین نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا "مفت میں اتنا نظارہ کافی ہے" حاجی صاحب نے آنکھیں کھولیں تو مارے حیرت کے گنگ ہو چکا تھا۔ "یہ سب کیا تھا؟" اس نے لکنت بھرے لہجے میں پوچھا "ہم نے اتنے برس طواف کعبہ اور مسجد نبوی میں بسر کئے آپ وہاں بھی موجود ہیں اور یہاں بھی اور اس "حال" میں"

"حاجی صاحب! آپ زبان بند رکھیں' بیتے دنوں کا پاس تھا جو میں آپ کی تسلی کرنے پر مجبور ہوا' ورنہ یہ طوق رسوائی میں نے اپنی رضا اور رغبت سے زیب گلو کر رکھا ہے۔ ایک آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟" یہ ساری گفتگو سرگوشی میں ہو رہی تھی اس کے بعد شاہ حسین تماشائیوں میں مخاطب ہوئے "اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے' بھلا میں اور حج بیت اللہ؟ میں جو گرفتار حرص و ہوا ہوں' مجھے یثرب سے کیا کام" ان الفاظ کے ساتھ شاہ حسین اپنے حواریوں کو لے کر رخصت ہو گئے۔ مگر حاجی یعقوب نے شور و غل سے آسمان سر پر اٹھالیا۔

"لوگو یہ شخص برسوں میرے ساتھ مسجد نبوی اور خانہ کعبہ میں مقیم رہا۔ آج بھی یہ وہاں موجود ہے اور ---- اور یہاں بھی" لوگ قہقہے لگا رہے تھے اور وہ اپنی بات بار بار دہرا رہا تھا۔ "یہ شاہ حسین فسق و فجور کے بہروپ میں' بلند مرتبت ولی ہے' آپ لوگ میری بات کا یقین کریں آپ لوگ کچھ نہیں جانتے مگر میں حقیقت سے آشنا ہوں؟ یہ شخص بیک وقت لاہور اور مدینے میں موجود ہونے پر قادر ہے" حاجی یعقوب چلا چلا کر اعلان کر رہا تھا اور

تماشائیوں کی اکثریت اسے پاگل قرار دے رہی تھی۔ آخر وہ اچانک خاموش ہو گیا اور دیوانہ وار شاہ حسین کی تلاش میں چل نکلا۔

دن ڈھلا، شام آئی غبار شب اترا، مگر اس کے دل کی مراد پوری نہ ہو سکی۔ کئی روز وہ لاہور کے کوچہ و بازار میں مارا مارا پھرتا رہا مگر شاہ حسین سے ملاقات کی حسرت پوری نہ ہوئی، یہ بذات خود ناقابل فہم سی بات تھی۔

تصویر کا دوسرا رخ کچھ اس طرح ہے کہ حاجی یعقوب، ہند کی سکونت ترک کر کے پھر بطحا جا پہنچا اور پہلے ہی روز، مسجد نبوی میں شاہ حسین سے ملاقات ہو گئی۔ ”جناب، مجھ سے پہاڑ ایسی غلطی سرزد ہو گئی تھی صرف ایک بار معاف فرما دیں“ حاجی یعقوب نے صدق دل سے معذرت پیش کی۔

”جس نے اپنے راز کی حفاظت کی وہ با مراد ٹھہرا“ شاہ حسین نے عربی میں جواب دیا ”لہٰذا میرے بھائی خاموشی ہی میں عافیت ہے“

اسی زمانے میں ملا سعید خان لاہوری، عالم بے بدل اور زاہد شب زندہ دار کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ ایک روز ملا موصوف کے کان میں درد کی اتنی شدید لہر اٹھی کہ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا ”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“ والا معاملہ ہو گیا وید، حکیم سیانے سب ناکام ہو گئے۔ سعید خاں کی زندگی مبتلائے عذاب تھی۔ کسی نے اسے در درویش پر حاضری کا مشورہ دیا۔ مگر ”علمی فضیلت“ راستہ روکے کھڑی ہو گئی۔ ”عالم بے بدل اور ایک فاسق و فاجر کے در پر جائے، یہ کیسے ممکن ہے؟“ بس یہی خیال دامن گیر تھا۔ جب درد لا دوا نے بالکل عاجز کر دیا تو ملا موصوف نے دل کو تسلی دینے کا جواز تلاش کیا۔ ”شاہ حسین شرابی کبابی ہے تو کیا ہوا؟ مریض کے لئے تو حرام اشیاء بھی حلال ہوتی ہیں لہٰذا میرا فاسق و فاجر کے ہاں جانا شرعی اعتبار سے جائز ہے“

درویش اس وقت بوریئے پر بیٹھا دوست احباب سے مصروف گفتگو تھا۔ سعید خان کو دیکھا تو حیرت زدہ سے لہجے میں پوچھا ”محترم، علم کے نور سے تو چہرہ روشن ہوتا ہے آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی، کہیں کوچہ عشق سے تو تعارف نہیں ہو گیا؟“

”بس جناب! جان عذاب میں ہے، کان کے جاں لیوا درد سے زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے“

”محترم! یہ تو صحت کی زکواۃ ہے اور زکواۃ بندے کو ہنسی خوشی ادا کرنی چاہیے“ شاہ حسین نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر اس درد کی کوئی حد بھی تو ہو، سکھ چین کے لمحے تو گویا خواب ہو کر رہ گئے ہیں، برائے کرم اس عذاب سے نجات دلائیں"

"مولانا توبہ کیجئے توبہ" شاہ حسین نے سنجیدہ لہجے میں کہا "عذاب تو گناہ گاروں کا نصیب ہے اور آپ ٹھہرے زاہد شب زندہ دار" پھر تھوڑی دیر کچھ سوچ کر ادھر ادھر دیکھا قریب ہی ایک کھردرے سے کاغذ کا ٹکرا پڑا تھا۔ شاہ حسین نے اس کی طرف اشارہ کیا "یوں کریں، وہ کاغذ اٹھا کر کان میں رکھ لیں"

"یہ "ٹوٹکا" بھی آزما چکا ہوں" سعید خان نے لیت و لعل سے کام لیا "یہ تو ناکارہ سا کاغذ ہے نرم و ملائم عمدہ ترین کاغذ آزمائے گئے، کوئی افاقہ نہ ہوا"

"ایک پتھر بت خانے میں ہوتا ہے ایک خانہ کعبہ میں" شاہ حسین نے بڑی گہری بات کی "ایک کی تعظیم جہنم کا راستہ دکھاتی ہے جب کہ دوسرے پتھر کا احترام، مناسک حج میں سے ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"جناب! اس مثال کا میرے درد سے کیا تعلق؟"

تعلق یہ ہے کہ جس جگہ مقام پر کوئی شے موجود ہو، اسکی بڑی اہمیت ہوتی ہے، جیسے صنم خانے کا پتھر اور کعبے کا حجر اسود، نرم و ملائم ریشم ایسے کاغذات دربار شاہی میں پائے جاتے ہیں مگر یہ کاغذ، ایک فقیر پر تقصیر کی جھونپڑی میں موجود ہے، دونوں میں کچھ تو امتیاز ہونا چاہیے"

بات سعید خان کی سمجھ میں آگئی اور اس نے لپک کر فرش خاک سے کاغذ کا ٹکرا اٹھایا اور جھٹ اپنے کان میں ٹھونس لیا۔ پل بھر میں درد کا نام و نشان نہ رہا۔

مریض کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی تو شاہ حسین نے چوٹ کی "مولانا، شرک سے اجتناب کیا کریں، کاغذ یا کسی بھی دوا میں تاثیر سمجھنا اور اسے نجات دہندہ قرار دینا، شرک ہے اور یہ سوچ اوپر والے کو پسند نہیں" یہ اتنی گہری بات تھی کہ سعید خاں جیسا عالم اجل بھی ششدر رہ گیا۔ ایک اور عجیب بات یہ ہوئی کہ ملا سعید، درویش بے ریا کا ایسا معتقد ہوا کہ زندگی بھر اس کی کفش برادری کو اعزاز سمجھتا رہا، علاوہ ازیں، دقیق علمی مسائل کا حل بھی وہ آستانہ شاہ حسین سے پاتا، درویش اس کے دل کی ہر خلش، سوچ کی ہر سلوٹ دور کر دیتا۔ ملا سعید خاں کہا کرتا تھا "شاہ حسین کے پاس علمی لدنی کا سمندر ہے"

مطلوبہ بستی آئی تو گروہ فقراء منتشر ہو گیا اور گلی کوچوں میں مٹر گشتی ہونے لگی۔ اسی بستی کا رئیس بہار خاں منڈہ بڑا چالاک ہوشیار انسان تھا اسے مطلع کیا گیا کہ لاہوری درویشوں کا ٹولہ گاؤں میں اودھم مچا رہا ہے اور ان کا "سرغنہ" شاہ حسین ہے جو سنا ہے مقام ولایت پر فائز ہے۔ اتفاق سے وہ علاقہ خشک سالی کا شکار تھا بہار خاں کے دل میں عجیب و غریب منصوبہ تشکیل پانے لگا۔ اس نے دیہاتی نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور سارے فقیروں کو رسیوں سے باندھ کر، ایک کمرے میں بند کر دینے کا حکم دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ شاہ حسین اپنے احباب کو چھڑانے آئے گا تو فقراء کی رہائی، باران رحمت سے مشروط کر دی جائے گی۔ جب حسب منصوبہ بارش برسنے لگے گی تو درویشوں کو آزاد کر دیا جائے گا۔ بس پھر کیا تھا۔ نوجوانوں نے گلیوں میں ناچتے گاتے فقیروں کو دھڑا دھڑ پکڑنا شروع کیا اور سب کو ایک وسیع و عریض مکان میں قید کر دیا۔ حسب توقع شاہ حسین، بہار خاں کے پاس آئے اور اس نازیبا حرکت پر احتجاج کیا۔

"جناب! میں سیدھی سادی دوٹوک بات کرنے کا عادی ہوں، ہماری فقراء سے کوئی دشمنی نہیں مگر خشک سالی کا شکار ہیں۔ سنا ہے آپ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں بس، بارش برسوا دیں اور اپنے حواریوں کو لے جائیں" بہار خاں نے صاف صاف اپنی شرط پیش کر دی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟ باران رحمت تو رب العزت کے قبضہ قدرت میں ہے، ہمارا اس سے کیا تعلق؟" شاہ حسین نے سمجھایا۔

"تعلق ہو یا نہ ہو، بارش کے بغیر فقیروں کی رہائی ممکن نہیں" بستی کے سردار نے کہا۔

"دیکھ خدا کے بندے، بارش دست قدرت کا کرشمہ ہے ہماری دعاؤں یا اعمال کا نتیجہ نہیں، انسانی اعمال کے نتیجے میں تو آسمان سے آگ برسنی چاہیے۔" دونوں اپنے موقف پر قائم رہے آخر شاہ حسین نے تجویز پیش کی "ایک صورت ہے، تم ان درویشوں کو نان اور گھی شکر کھلاؤ یہ خوش ہو کر، دعا کریں گے اور امید ہے اللہ ان بھوکے ننگے مفلسوں کی دعا کو شرف قبولیت بخشے گا۔"

"ٹھیک ہے، ہم خور و نوش کا اہتمام کرتے ہیں، مگر یاد رہے، اگر بارش نہ برسی تو ان تمام حضرات کے منہ کالے کر کے گدھوں پر بیٹھا کر، جلوس نکالا جائے گا" سر پھرے سردار نے نئی پخ لگائی تو شاہ حسین نے بھی ترکی بترکی جواب دیا۔ "اگر تم نے فقیروں کی حسب منشاء خورو

نوش کا انتظام نہ کیا تو بارش کی بجائے فلک سے انگارے برسیں گے“

المختصر فقراء کو آزاد کیا گیا، دعوت کا اہتمام ہوا، سب نے حسب طلب کھانا کھایا تو ان کو شاہ حسین کے ”عسرو یسر“ والے الفاظ یاد آئے۔ کھانے کے بعد شاہ حسین نے ان کو رقص کرنے کا حکم دیا۔ ادھر رقص کا آغاز ہوا ادھر آسمان پر گھٹائیں چھا گئیں ایسی بارش ہوئی کہ بستی اور اس کے گردو نواح کا علاقہ جل تھل ہو گیا۔ جب یہ رحمت ”زحمت“ میں بدلنے لگی تو بستی کا سردار جو قائل بھی اور گھائل بھی ہو چکا تھا، دست بستہ ملتمس ہوا۔ ”بس جناب! مزید بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں، اپنے ساتھیوں کو رقص بند کرنے کا حکم دیں ورنہ ساری فصلیں تباہ و برباد ہو جائیں گی“ بارش ختم ہوئی تو بہار خاں ایک بار پھر شاہ حسین سے ملتجی ہوا ” اگر یہی رقص مجھے بھی سکھا دیں تو بڑی کرم نوازی ہو گی“

”مفت میں تو رسوائی بھی نہیں ملتی“ درویش نے مسکرا کر کہا۔

”مجھ میں اس کی قیمت ادا کرنے کی ہمت ہے“ بہار خاں منڈہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”جانتے ہو اس کی قیمت؟“

”ترک تعلقات“ رئیس بستی نے سر جھکا کر جواب دیا۔۔ شاہ حسین واپس لاہور آئے تو گروہ میں ایک اور درویش کا اضافہ ہو چکا تھا۔ بہار خاں نے سرداری اپنے بیٹے کو سونپی اور تلاش حق میں نکل کھڑا ہوا۔ بہار خاں منڈہ، مقبولان شاہ حسین میں ایک سرکردہ نام ہے۔

تریسٹھ برس کی عمر میں درویش کو ”حکم حضوری“ کی آہٹ سنائی دی یہ 1008ھ کا ذکر ہے شاہ حسین اپنے احباب باوصفا کے ہمراہ شہر سے نکلے۔ کشتی کے ذریعے دریا عبور کیا۔ وہی دریا جس کی شوریدہ لہریں، بارہا درویش کی زبان سے کلام الٰہی سن چکی تھیں مگر ان کا اضطراب جوں کا توں تھا۔ رخ سفینہ اس وقت شاہدرہ کی جانب تھا راستے میں ”بریتہ“ حائل ہو گیا ”بس حضرات، اپنی منزل آ گئی“ درویش نے عجیب لہجے میں ساتھیوں سے کہا۔

”جناب، منزل تو ابھی دور ہے، نہ آر نہ پار بھلا یہ کون سی منزل ہوئی؟“ ایک ساتھی نے کہا۔

”اگر کوئی دوست بڑی چاہت سے بلائے تو انسان کو کیا کرنا چاہیے؟“ شاہ حسین نے پوچھا

”دعوت کو قبول کر لینا چاہیے“ سب نے متفقہ فیصلہ سنا دیا۔

”بڑی مناسب بات ہے، وفا کا تقاضا بھی یہی ہے“ یہ کہا اور ایک چادر ریت پر بچھائی پھر بڑے سکون سے چادر پر لیٹ کر نیلے آسمان کی وسعتوں کو بغور دیکھنے لگے پھر زیر لب کچھ پڑھتے

رہے۔ دوست احباب کھیل تماشے میں مصروف تھے کہ طائرہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ "حیات دنیا کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں" کی انوکھی تشریح کرنے والا ہنستے کھیلتے سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔

جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شاہ حسین اپنے عارضی مدفن کی نشان دہی' اپنی زندگی ہی میں کر دی تھی۔ راوی کنارے سرسبز و شاداب درختوں کا جھنڈ تھا جہاں ایک کنواں کھدوایا گیا تھا۔ پشین گوئی کے مطابق انہیں تیرہ برس' زیر زمین استراحت فرمانا تھی اور پھر اپنے نئے 'مدفن' بابو پورہ منتقل ہو جانا تھا اور اسی جگہ ان کے منظور نظر 'مادھولال کو' اظہار ولائت کے بعد قیام کرنا تھا۔ ساری منصوبہ بندی ہو چکی تھی۔ اس میں تبدیلی صرف اس قدر ہوئی تھی کہ مادھولال اپنی ملازمت کو خیرباد کہہ کر واپس آگیا تھا مگر عالم خواب میں وصول ہونے والی ہدایات کے مطابق 'ایک برس بعد' دوبارہ افواج اکبری میں چلا گیا تھا۔ مادھولال کی عدم موجودگی میں دریائے راوی نے اپنا فریضہ سرانجام دیا۔ ایسا پھرا کہ مغربی کنارے کے اس پار والا علاقہ زیر آب آگیا۔ مزار کے گرد و پیش پانی ہی پانی تھا۔ عقیدت مندوں کو فکر لاحق ہوئی ان کو پشین گوئی بھی یاد آگئی لہٰذا قبر کھود کر "خاکی پنجرے" کو موجودہ مزار والی جگہ منتقل کرنے کا اہتمام ہوا۔ تربت میں شگاف ڈالا گیا تو سارے دھک سے رہ گئے۔ قفس عنصری کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہڈیاں' ناخن' بال کوئی شے موجود نہ تھی۔ یہ ایک حیران کن بات تھی نہ کسی نے ایسا کبھی دیکھا نہ سنا۔ سینکڑوں برس بعد بھی زیر زمین سونے والے کے آثار باقی رہتے ہیں' یہی لوگوں کا تجربہ تھا

لوگوں کو شاہ حسین کی شاعری میں "پیکر انسانی اور خاک زمین" سے متعلق اشعار یاد آئے۔

کہے حسین فقیر سائیں دا انت خاک وچ رلنا
کہے حسین فقیر نمانا آخر خاک سماؤ رے

اسی طرح ایک بار کہا

کہے حسین فقیر نمانا آخر خاک سمان

ایک بار جنگل کا ذکر بھی کیا تھا اور عارضی مدفن کی مشابہت جنگل ہی سے تھی

شاہ حسین فقیر سائیں دا جنگل جائے سماون

"کہیں ایسا تو نہیں کہ درویش نے ان اشعار کا عملی ثبوت پیش کر دیا ہے؟" ہر دل میں یہی سوال تھا' ہر ذہن میں اس کی باز گشت' عقیدت مندوں نے شگاف بند کرنے کے متعلق سوچا۔ غور و فکر کے لئے ایک جگہ اکٹھے ہوئے اچانک تربت میں سے رنگین شعاعوں کا اخراج ہوا۔ دھڑکنیں تیز ہو گئیں' چشم تماشا' جلوگی کی منتظر' ہر متنفس' پردہ غیب سے کسی انوکھے تماشے کا انتظار کر رہا تھا مگر مخلص و وفادار محمد صالح دیوانہ وار قبر میں کود گیا "محتاط حضرات" منع کرتے رہ گئے۔ احتیاط اچھی چیز ہے مگر کبھی کبھی اسے بالائے طاق رکھ دینا چاہئے۔ ایسی صورت میں جست جنوں خیز ہی کام آتی ہے۔ محمد صالح روشنی میں نہایا کھڑا تھا اور سارے عقیدت مند دم بخود کھڑے یہ خلاف عقل "واردات" ملاحظہ فرما رہے تھے۔ اسی کی سماعت سے شاہ حسین کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ صدا جسے محمد صالح' آوازوں کے ہجوم میں بھی پہچان سکتا تھا۔ "عزیزم' میرا جسد خاکی' رضائے الٰہی سے خوشبودار رنگین پھولوں کے روپ میں اسی جگہ موجود ہے' یہی میرے پیکر خاک کی باقیات ہیں اور اسے ہی نئی جگہ دفن ہونا ہے' مگر اس گلدستے کو سونگھنے کی کوشش نہ کرنا کہ کوئی قوت شامہ (سونگھنے کی قوت) اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ایک راز ربانی ہے۔" قبر کے اندر ریحان کی مہک تھی اور صالح محمد نے دیکھا کہ پھولوں کا ایک گلدستہ واقعی وہاں موجود ہے پھر دوسری سرگوشی سنائی دی۔ "مجھے دیکھنے کے تمنائی' مادھو کی زیارت کریں وہی میری مشابہت کا حامل ہو گا۔ میں نے اپنی شکل و شباہت اس کے سپرد کی" سرگوشیوں کا سلسلہ ختم ہوا۔

"شد گل' گور گل زنور حسین" (خاک تربت حسین کی روشنی سے گل و گلزار ہوئی) محمد صالح اور دیگر عقیدت مندوں نے یہی "گل دستہ" جنازے کی صورت بابو پورہ پہنچا دیا۔ موجودہ مدفن پر جنازہ پہنچا تو ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ جگہ گورکھ ناتھی جوگیوں کے قبضے میں تھی۔ پیر گورکھ ناتھ اپنے چیلوں کے ساتھ یہاں مقیم تھا وہ اسی جگہ سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ "یہ ہماری جگہ ہے' ہم ٹھہرے ہندو اور یہاں مسلمان کی تدفین ممکن نہیں" پیشتر اس کے کہ فساد بپا ہوتا' جنازے سے آواز آئی" جوگی بحث و تکرار سے پرہیز کر اور اس جگہ کو کھود کر دیکھ اندر کیا ہے؟ سارے ثبوت تجھے مل جائیں گے" قبر کھودی گئی تو جوگی دنگ رہ

گیا۔ ایک سرخ دستار تھی، ایک تسبیح، ایک قرآن شریف اور ایک عدد مصلا۔ جوگی مقام مدفن سے برضا و رغبت، دست بردار ہوا اور ملتجی لہجے میں کہنے لگا۔ "جناب یہ جگہ تو ہوئی آپ کی مگر میں کہاں جاؤں؟"

"تمہارا قیام ٹلہ گورکھ ناتھ میں ہونا چاہیے" محمد صالح اور دیگر عقیدت مندوں کو ہدایت دی گئی۔ "مادھو لال آئے تو سرخ دستار اسے سونپ دی جائے"

یہ خلاف عقل باتیں دیکھ، سن کر، جوگی مہاراج کا سب سے چہیتا چیلا دھرنا مار کر وہیں بیٹھ گیا۔ گورو نے ساتھ چلنے کا حکم دیا تو اس نے آہ بھر کر کہا "اب کوچہ یار سے کون جائے"

یہ وہی چیلا ہے جو مشرف بہ اسلام ہوا اور "خاکی دیوان" کہلایا۔ مادھو لال کی عدم موجودگی میں یہی مزار کا مجاور تھا اور اسی نے سرخ دستار، شاہ حسین کے منظور نظر کو پیش کرنا تھی اور اسی کے متعلق مشہور ہوا تھا "مادھو آیا خاکی سمایا" (دیوان خاکی کی قبر مزار کے قریب کافی عرصہ موجود رہی۔)

مزار شاہ حسین، شالامار باغ کے مغرب میں تھوڑے فاصلے پر موجود ہے۔ عظمت شاہ حسین کا اعتراف مغلیہ خاندان میں سب سے پہلے، دارا شکوہ نے کیا اس نے تو بہار خاں نامی شخص کو یہ فرض سونپ رکھا تھا کہ فرمودات درویش کو سپرد قلم کرتا رہے۔ شہنشاہوں میں اکبر اور جہانگیر بھی عقیدت مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ عہد شاہجہان میں، شالامار باغ معرض وجود میں آیا تو انجینئر خلیل اللہ کو اس مشہور زمانہ باغ کی تعمیر و آرائش کے فرائض سونپے گئے۔ صرف مزار کی موجودگی کے سبب، دیوار گلستان کو روک دیا گیا ورنہ باغ کی وسعت شمال مغربی جانب، مزار سے آگے تک تجویز کی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہجہان نے بھی عظمت درویش کے آگے سر تسلیم خم کیا۔

معزالدین جہاندار شاہ جب اپنے بھائیوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب تخت سے معزول ہوا تو اس نے مزار پر عالیشان عمارت بنانے کی منت ماہی۔ چنانچہ تخت شاہی پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد اس نے، منت پوری کی۔ بہادر شاہ (معظم شاہ عالم) کے چاروں بیٹوں، معزالدین، رفیع الدرجات، عظیم الشان اور رفیع الدولہ شاہجہان ثانی، آپس میں دست و گریباں ہوئے اور غیرت تیمور کا جنازب نکلا۔ جہاندار شاہ سب کو نیست و نابود کر کے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا مگر یہ جلوگی تا دیر قائم نہ رہ سکی۔ 1713ء میں مقتول ہوا۔ شاہ حسین

اور جہاندار شاہ میں ایک قدر مشترک' شاعری تھی۔ مشہور زمانہ شعر......

آخر گل اپنی صرف در مے کدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اسی مقتول شہنشاہ دہلی کا ہے۔ شاہ حسین کی وفات کے تقریباً" ایک صدی بعد' لاہور کے مغل گورنر نواب ذکریا خاں نے 1144ء میں مزار کے احاطے میں' عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ مغل بادشاہ محمد شاہ کی عقیدت بھی اسمیں شامل تھی۔ اسی زمانے میں شاہ حسین یا حسین ڈاہڈا دونوں نام پس منظر میں چلے گئے اور "مادھو لال حسین" نام منظر عام پر آیا۔ یہ عوام الناس کی عقیدت کا کرشمہ تھا جو طالب و مطلوب کو الگ الگ ناموں سے یاد کرنے کے روادار نہ تھے۔ 1151ھ بمطابق 1739ء' نادر شاہی فوج نے لاہور کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ شاہ حسین کا مزار بھی محفوظ نہ رہ سکا اور قیمتی دستاویزات وغیرہ تلف ہو گئیں رہی سہی کسر' احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں ہوئی یہی وجہ ہے کہ شاہ حسین کی زندگی کے اکثر گوشے تاریکی میں گم ہو گئے اور منظر عام پر نہ آسکے۔ یہ حالات درجنوں کتب میں ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں اور محققین کو دعوت فکر و عمل دیتے ہیں۔ عہد سکھا شاہی میں' لاہور کو جی بھر کے لوٹا گیا مگر حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ رنجیت سنگھ عقیدت حسین میں ڈوبا ہوا تھا۔ بسنت کا تہوار اس انداز میں منایا جاتا کہ چشم فلک حیران و ششدر رہ جاتی۔

دربار سے منسلک ہر ادنے و اعلے فرد' مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے "بسنتی" لباس زیب تن کرتا' حتی کہ افواج کا لباس بھی زرد رنگ کا ہوتا۔ گھوڑوں کی زینیں' ہاتھیوں کے ہودج' سامان حرب و ضرب' ہر چیز بسنتی رنگ میں ڈوبی ہوتی۔ مزار کے گردو نواح میں اسی رنگ کے خیموں کا شہر بسایا جاتا اور بسنتی پوش ہجوم' شاہی محل سے مزار اقدس کے راستے پر' شاہی سواری کا منتظر ہوتا۔ دو بجے دوپہر توپوں کی گھن گرج میں مہاراجہ کی سواری' سوئے مزار چل نکلتی۔ پانچ سو گھوڑ سوار' ساٹھ ستر ہاتھی' دو رجمنٹ پیدل فوج گویا شاہی قلعہ لاہور سے بسنتی رنگ کا دریا رواں ہوتا اور باغبان پورہ کا رخ کرتا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ مٹھیاں بھر بھر کر طلائی سکے ہجوم پر نچھاور کرتا۔ یہ سلسلہ مزار تک جاری رہتا۔ مزار کی حدود میں داخل ہونے سے پیشتر' مہاراجہ سوار کو چھوڑ کر پیادہ سفر طے کرتا اور عقیدت و احترام کا مظاہرہ کرتا ہوا تربت حسین پر حاضری دیتا۔ جشن مسرت اس وقت بام عروج پر پہنچتا جب رنجیت سنگھ'

اپنی فوج کو ایک ماہ کی تنخواہ (بطور بونس) ادا کرنے کا اعلان کرتا۔ غروب آفتاب تک مہاراجہ موجودہ مقام مدفن پر موجود رہتا۔

ہیرا منڈی کی مشہور زمانہ طوائف "موراں" نے ایک عظیم الشان مسجد کا اضافہ کیا فرنگی دور کا آغاز ہوا تو مزار کی شان و شوکت کے تنزل کی ابتداء ہوئی۔ رفتہ رفتہ مزار سے ملحقہ' وسیع و عریض اراضی سکڑتی چلی گئی۔ نواب زکریا خاں کی مسجد کا نقشہ تبدیل ہوا۔ مسجد مائی موراں کا نام و نشان نہ رہا۔ انواع و اقسام کے ایک ہزار اشجار لہلہاتے اور بہاریں دکھاتے تھے۔

چھروز' نیم' کریر' برنا' سکھ چین شرینہ' پھر پھل دار درخت الگ تھے۔ آج گنتی کے چند درخت موجود ہیں شجر ثمربار تمام کے تمام بیخ و بن سے اکھڑ چکے ہیں۔ حالات حد سے زیادہ دگرگوں ہوئے تو لاہور کے شعراء نے تاریخ میں پہلی بار عظیم صوفی شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے کا اہتمام کیا۔ مجلس شاہ حسین کا قیام عمل میں آیا۔ محکمہ اوقاف نے مزار کو اپنی تحویل میں لیا تو انتظام و انصرام گویا بے ہنر بندوں کے ہاتھ آ گیا۔ رہی سہی کسریوں پوری ہوئی۔

1984ء میں' پنجابی کے شہرہ آفاق شاعر چراغ دین المعروف استاد دامن کو ان کی وصیت کے مطابق مزار شاہ حسین کے قریب دفن کیا گیا۔ استاد دامن نے زندگی کا بیشتر حصہ اسی مسجد کے حجرے میں بسر کیا تھا جس میں شاہ حسین نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی استاد ابوبکر بگھوی اور بہلول دریائی کے آگے زنوائے تلمذ تہ کیا تھا (یہ مسجد البتہ آج بھی ٹکسالی گیٹ کے آغاز میں موجود ہے)

مزار شاہ حسین جہاں' جہاں داروں کے سر خم ہوا کرتے تھے' آج موجود تو ہے مگر وہ شان و شوکت' وہ عظمت رفتہ' قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ لوح مزار پر تاریخ وفات تک غلط ہے غفلت کی انتہا ملاحظہ ہو تاریخ وفات 1058ھ درج ہے جب کہ قریب لیٹے ہوئے شیخ مادھو قادری کی تاریخ وفات 1056ھ مرقوم ہے حالانکہ وہ پینتیس برس تک اپنے پیرو مرشد کے مزار پر مجاور بن کر بیٹھے رہے۔ شاہ حسین کی تاریخ وفات میں پچاس برس کی غلطی ناقابل فہم سی بات ہے۔ عمارت کی دیواروں پر لکھے ہوئے سب اشعار بحر سے خارج اور غلطیوں کا شاہکار ہیں' یہ سب کیا ہے؟ یہی ناکہ مزار کے کارکنان قضا و قدر پرلے درجے کے جاہل

مطلق ہیں ان تمام باتوں سے درگزر کا جواز ہو سکتا ہے مگر وہ مجرمانہ غفلت جو ناقابل معافی و تلافی گناہ ہے' وہ قرآنی عبارت کی غلط املا یا "غلط نویسی ہے" چبوترے پر چڑھتے ہی جس آیت مبارکہ پر نگاہ پڑتی ہے وہ ہے گیارہویں پارے "گیارہویں رکوع کی دوسری آیت جس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

"الا ان اولیا اللہ.....الخ" حالانکہ اصل آیت مقدسہ کا آغاز لفظ الا سے ہونا چاہیے۔ الا کا ترجمہ "مگر" اور الا بمعنی "خبردار" ایک استثنے ہے دوسرا "تنبیہہ" یہ غلطی جرم و گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔ کلام الٰہی پر تو اعراب کی تبدیلی بھی ناقابل برداشت ہونی چاہیے 'مگر یہ سب کچھ سب کے سامنے ہو رہا ہے۔ جو لوگ ان دو الفاظ میں امتیاز نہیں کر سکتے وہ خواہ مجاور ہوں خواہ کارکنان مذہبی امور کمیٹی' ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ دینی معاملات میں دخل انداز ہوں۔ موجودہ مجاور اللہ رکھا جو اوقاف کا ملازم بھی ہے اور عرصہ بائیس برس سے مزار کا منتظم بھی' جب اس کی توجہ راقم نے ان امور کی طرف مبذول کرائی تو "آئیں بائیں شائیں" کرنے لگا۔ تاریخ وفات کی اصلاح کا وعدہ اس نے ضرور کیا۔ رنجیت سنگھ دربار کے ایک شاعر نے تفنن طبع کے لئے ایک شعر کہا جو محکمہ اوقاف' مجاور اور دیگر کارکنان کے حسب حال ہے۔

گل گئے گلشن گئے جنگلی دھتورے رہ گئے
چل بسے عاقل جہاں سے بے شعورے رہ گئے

یہ تمام حضرات برابر کے شریک جرم ہیں اور ہم صفحات کی وساطت سے ان بے شعور حضرات کی توجہ' ان امور کی طرف مبذول کراتے ہیں کہ وہ کم از کم آیت مقدسہ والی غلطی کی اصلاح کر لیں ورنہ حشر سے پہلے حشر بپا ہو جائے گا۔ صحرا میں اذان دینا بھی تو اہم فریضہ ہے کوئی سنے نہ سنے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ

سروں سے قرض امانت اتارتے رہیے
جواب آئے نہ آئے پکارتے رہیے

حضرت میاں میرؒ بالا پیر

سرزمین سندھ میں پیدا ہونے والی وہ ہستی جس کے آستانے ہر شاہ و گدا، یکساں سرنیاز ختم کرتے رہے۔ وہ مینار نور جس کی ضیا پاشیوں سے پنجاب کی زمین روشن ہوئی اور اس روشنی نے برصغیر کو منور کیا۔ اس پاکیزہ ہستی کی داستان جس نے لاہور کو آخری آرام گاہ کے طور پر پسند فرمایا۔ بالا پیر، شاہ میر، میاں جیو اور میاں میرؒ کے اسمائے گرامی سے مشہور ہونے والی آفتاب معرفت، واقف اسرار زماں، سلسلہ قادریہ کے مہتاب درخشاں کی روشن داستان حیات

شب سیاہی کے پس منظر میں بے کراں آسمان پر چمکنے والے ستارے بہت شوخ دکھائی دے رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی چمک ماند پڑنے لگی تو صبح کاذب کے آثار ہویدا ہوئے۔ یہ وقت غافلوں کے لئے گہری نیند میں ڈوب جانے کا ہوتا ہے جب نفس امارہ انسان کو تھپک تھپک کر راحت پہنچاتا ہے مگر راہ عشق کے مسافر' اس وقت راز و نیاز کے آخری مراحل میں ہونے کی بناء پر چاک و چوبند ہوتے ہیں۔ یہی نورانی گھڑیاں تھیں جب وہ پارسا خاتون کرب تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ بستی والے اس خاتون کو رابعہ ثانی کہتے تھے۔ واقعی اس کی پاک دامانی کا یہ عالم تھا کہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں" زچگی کے مراحل سے گزرنے والی یہ صاحب بصیرت و بصارت خاتون مقام ولایت پر فائز تھی۔ اسی پر کیا موقوف سارا گھرانہ دولت دین سے مالامال تھا۔ سنت نبویؐ کی اتباع ان کا اوڑھنا بچھونا اور زہد و تقویٰ' توشہ آخرت تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ خاتون' فصیل جاں میں اٹھنے والے درد کے سیلاب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر رہی تھی۔ اچانک اس کی سماعت سے اپنے مشفق باپ قاضی قادن کی آواز ٹکرائی بات تو ماضی بعید سے تعلق رکھتی تھی مگر اس کا ایک ایک لفظ رابعہ ثانی کو صاف سنائی دے رہا تھا۔

"بیٹی! میں نے تمہارا نام بنت رسولؐ کے نام پر رکھا ہے' اب اس "نسبت" کی لاج رکھنا" قاضی قادن' زاہد شب زندہ دار نے کہا "دنیا میں فاطمتہ الزہرا کے علاوہ دو اور خواتین مقام و مرتبے میں لاثانی ہیں"

"ابو! وہ کون خوش نصیب خواتین ہیں؟" فاطمہ رابعہ ثانی نے پوچھا۔

ام عیسیٰؑ مریم اور زوجہ فرعون آسیا' مگر میں نے بنت رسولؐ کے اسم مبارک کا انتخاب کیا" "قاضی قادن نے کم سن بیٹی کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے کہا

بیٹی کے دل پر یہ بات نقش ہو کر رہ گئی کہ اسے بنت رسولؐ کے نام کی لاج رکھنا ہے پھر اس نے شعور کی آنکھ کھولتے ہی حب اللہ و الرسولؐ کو زندگی کا شعار بنالیا۔ سن بلوغت میں قدم رکھا تو اپنے ہی خاندان کے ایک صالح نوجوان قاضی سائیں اللہ دتہ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی۔ پہلے بچے کی ولادت ہوئی تو فاطمہ رابعہ ثانی نے چشم بصیرت سے نومولود کی پوری زندگی کا مشاہدہ کیا اور مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ دنیاوی اعتبار سے بچے کی زندگی کامیاب و کامران تھی مگر اس میں نہ شان قلندری تھی جس کے آگے شان فغفوری

جھلک جاتی ہے نہ عشق الٰہی کا مطلوبہ رنگ۔ قرآنی آیت "ومن احسن من صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہے؟) کے مطابق خاتون کی دلی تمنا تھی کہ اس کی اولاد رنگ خدا میں ڈوبی ہوئی ہو چنانچہ اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی "اے رب کائنات مجھے ایسی اولاد سے نواز جس کا ہر سانس ہر پل تیری رضا کے لئے وقف ہو' میں اپنی اولاد کے لئے نہ مال و زر کی خواہشمند ہوں نہ دنیاوی جاہ و جلال کی بس اپنی اور اپنے محبوب کی محبت میں سرشار اولاد میرے نصیب میں لکھ دے۔"

یہ دعا دنیاوی زیب و زینت کے طلب گاروں کے لئے' بے شک عام ڈگر سے ہٹ کر یا منفرد نوعیت کی تھی مگر وہ جو راہ حق کے مسافر ہوتے ہیں' ان کی سوچ ایسی ہی ہوتی ہے۔ سیم و زر کی حقیقت ان کی نگہہ بلند میں پرکاہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ادھر دل کی رغبت اور روح کے میلان سے نکلی ہوئی دعا کے لئے ہاتھ بلند ہوئے' ادھر رحمت خدا جوش میں آئی اور دعا کو شرف قبولیت حاصل ہوا اور آج طلوع سحر سے ذرا پہلے سائیں اللہ دتہ کی زوجہ' فاطمہ خاتون کرب تخلیق کا خندہ پیشانی سے استقبال کر رہی تھی' قبولیت کی مبارک گھڑی' در پر دستک جو دے رہی تھی۔

اس داستان کا آغاز سرزمین سندھ کے شہر بھکر اور ٹھٹھہ کے درمیان موجودہ شہر دادو کے علاقے سیوستان (سہون شریف) میں ہوا۔ رابعہ ثانی نے اپنے نومولود لخت جگر کی پیشانی پہ نگاہ ڈالی' پھر چشم بصیرت سے لوح محفوظ کا مشاہدہ کیا تو خوشگوار حیرت میں ڈوبتی چلی گئی۔ اس بے نیاز نے دست کرم اتنا کشادہ کر دیا تھا کہ فاطمہ خاتون کو تنگی داماں کا احساس ہونے لگا۔ بچہ پیدائشی ولی تھا۔ رابعہ ثانی نے رات کے گھپ اندھیرے میں اچانک طلوع ہونے والا ایسا آفتاب عالم تاب دیکھا جس کی ایک ایک کرن' ظلمت کدے کو روشن کرنے والی تھی۔ بچے کی اپنے جد اعلیٰ سیدنا عمر فاروقؓ سے لہو کی نسبت تھی جو اندھیرے اجالے میں امتیاز کر رہی تھی۔ نومولود کا سلسلہ اٹھائیس واسطوں سے امیر المومنین عمر فاروقؓ سے جو مل رہا تھا۔ وہی عمر فاروقؓ جن کے متعلق کائنات کے سب سے عظیم انسان کا ارشاد تھا کہ عمرؓ حق و باطل میں امتیاز کرنے والا یعنی فاروق ہے مزید یہ کہ جس راہ سے یہ ہستی گزر جائے' ابلیس اس راہ سے بھاگ جاتا ہے ارشاد نبیؐ کا انداز ملاحظہ ہو "واشد فی امر اللہ عمر" خدائی معاملات میں شدید ترین ہستی عمر فاروق کی ہے۔"

نومولود کا نام محمد میر" تجویز ہوا یعنی محمدؐ کاروان کائنات کا امیر و رہنما' مالک و مختار کل ہے یہی محمد میر برصغیر کے کونے کونے میں حضرت میاں میر' بالا پیر' میاں جیئو اور شاہ میر کے اسمائے گرامی سے مشہور ہوئے۔ لفظ میاں" صاحب کا مترادف ہے اور جیو کلمہ توقیر آپ کے دادا قاضی قلندر بھی سرزمین سندھ میں بلند مرتبت ہستی تھے۔ قاضی اللہ دتہ تو سندھ کے عالم بے بدل تھے اور زہد و تقویٰ میں اپنا جواب آپ تھے۔ اس طرح بالا پیر ننھیال ددھیال سے نجیب الطرفین ہستی اور فاروقی تھے۔ اس میں شبہے کی گنجائش نہیں کہ اگرچہ حضرت میاں میر کی کم و بیش ساری زندگی سرزمین پنجاب پر بسر ہوئی اور آخری آرام گاہ کے لئے بھی آپ نے شہر اولیاء لاہور کو پسند فرمایا مگر آپ پیدائشی سندھی تھے اور آپ کی مادری زبان بھی سندھی ہی تھی۔ مقام ولایت اور نور ہدایت کے جس مقام پر بالا پیر فائز تھے اگرچہ وہاں جگہ مقام کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی کہ مینار نور کی ضیا پاشیاں چارو طرف ایک جیسی ہوتی ہیں پھر بھی علم و آگہی کے لئے آپ کی جائے پیدائش کا تذکرہ ضروری تھا۔

محترمہ رابعہ ثانی کی دعا مقام "قبولیت" سے دو قدم آگے نکل گئی اور ان کے ہاں ایک ایسی بچی بھی تولد ہوئی جو اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مقام ولایت پر فائز ہوئی۔ یعنی بی بی جمال خاتون۔ فاطمہ رابعہ ثانی کے بطن سے بالا پیر کے تین بھائی اور دو ہمشیرگان تولد ہوئیں اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

قاضی بولن' قاضی عثمان' قاضی طاہر' اس اولاد نرینہ کے علاوہ بی بی جمال خاتونؒ اور بی بی جمال بادیؒ بی بی جمال خاتون اور قاضی لطف اللہ توام پیدا ہوئے تھے اور قاضی لطف اللہ کمسنی ہی میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ بالا پیر کے سن ولادت کے متعلق دو آرا پائی جاتی ہیں پہلی یہ کہ پیدائش 938ھ بمطابق 1532ء کو ہوئی۔ اس طرح یہ مغل شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں کا پہلا عہد حکومت بنتا ہے یعنی شیر شاہ سوری سے شکست کھانے سے پہلے دوسری رائے جس پر اکثر لوگ متفق ہیں وہ 957ھ بمطابق 1550ء جو مغل شہنشاہ اکبر کا دور حکومت ہے البتہ سن وفات متفقہ طور پر 1045ھ 7 ربیع الاول بروز سہ شنبہ بمطابق 1635ھ جانا جاتا ہے۔ (بر سبیل تذکرہ یہ شاہ جہان مغل شہنشاہ کا 7 واں سن جلوس ہے) اس طرح جب حضرت میاں میر نے شعور کی آنکھ کھولی تو عہد اکبری کا آغاز پھر نور الدین جہاں گیر شہاب الدین شاہ جہان کے زمانے میں آپ کا وصال ہوا۔ ان شاہوں کی اولادیں بھی آپ

کی غلام ہوئیں بالا پیر واقعی بادشاہو کے پیر تھے۔ درویش کی حیات طیبہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ درویشی میں اگر سچائی ہو تو شان فغفوری اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔ آستانہ درویش پر وقت کے شہنشاہ برہنہ پا حاضر ہوا کرتے تھے اور اس حضوری کو توشہ آخرت تصور کرتے تھے۔

محمد میر کا بچپن سیوستیان کے گلی کوچوں میں گزرا۔ سرزمین سندھ میں چونکہ دین فطرت کا بیج سب سے پہلے بویا گیا تھا لہٰذا فضائیں اس کی مہک سے نسبتاً” زیادہ عطر بیز تھیں ان ہواؤں میں لیا جانے والا ہر سانس بچے کی بنیاد مضبوط کر رہا تھا اور اس کے مقامات بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ ننھے سے کورے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے سوالات جنم پذیر ہوتے۔ قاضی اللہ دتہ علم لدنی کی روشنی میں لخت جگر کی تسلی و تشفی کرتے۔ بالا پیر جب کم سنی میں ایسے سوالات کرتے جو ان کی عمر سے لگا نہیں کھایا کرتے تھے تو وہ سننے والے جو واقف حال نہیں تھے ورطۂ حیرت میں ڈوب ڈوب جاتے‘ البتہ بچے کی حقیقت سے آشنا سماعتیں حیرت زدہ ہونے کی بجائے لطف اندوز ضرور ہوتیں۔ چھ سات برس کی عمر میں میاں جیوؒ نے پہلی مرتبہ علم لدنی کا مظاہرہ کیا اور واقف حال لوگوں کو بھی حیران کردیا۔ انداز بیاں گرچہ شوخ نہیں تھا مگر تقریر کا ہر لفظ سامعین کے دلوں میں اتر گیا یہی اکتسابی اور لدنی علم میں فرق ہوتا ہے۔ مسئلہ تقدیر زیر بحث تھا اور سائیں اللہ دتہ دلکش انداز میں نکتہ نظر کی وضاحت فرما رہے تھے۔ یک از سامعین نے سوال کیا ”اگر قسمت کا لکھا ہر صورت ہونا ہے تو انسان مجبور محض ہوا لہٰذا جزا و سزا چہ معنی دارد؟“ سوال اگرچہ صدیوں پرانا تھا مگر اس کی تلخی بہرحال ناگوار حد تک محسوس کی جاسکتی تھی۔

”تقدیر اندازے کا نام ہے“ کم سن بچہ تلخی کو برداشت نہ کرسکا انسان کا علم چونکہ محدود ہوتا ہے لہٰذا اس کا اندازہ ناقص ہوسکتا ہے مگر قادر مطلق کا علم اس کی اپنی ذات کی طرح ہر نوع کے نقص سے پاک ہوتا ہے لہٰذا اس کا اندازہ بے عیب اور ہر نقص سے پاک ہونا چاہئے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ تقدیر اٹل ہے تو اصل میں ہم اپنے رب کے علم کی تعریف و توصیف کرتے ہیں جس نے خیر و شر تخلیق فرمانے کے بعد انسان کو برے بھلے کا شعور بھی دیا اور اندازہ لگا کر لوح محفوظ پر لکھ بھی دیا کہ میرا یہ بندہ اس راستے کا مسافر ہوگا اور اپنے رویے کے مطابق سزا یا جزا کا مستحق ٹھہرے گا۔“

تقدیر کی یہ سادہ مگر جامع تشریح سن کر قاضی اللہ دتہ بھی حیران رہ گئے۔ فاطمہ خاتون کو خبر ہوئی تو اس نے لخت جگر کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور سمجھایا ”میرے فرزند! اپنی عمر کے مطابق بات کرنا ہی دانش کا تقاضا ہے ورنہ راز ربی کا اخفا ممکن نہیں“

”امی جان! میں آئندہ محتاط رہوں گا“ بالا پیر نے سر تسلیم ختم کرتے ہوئے کہا۔ یہ بات مستند ہے کہ بالا پیر اپنے والد بزرگوار سے زیادہ، والدہ رابعہ ثانی کی فکر رسا سے فیض یاب ہوئے۔ سات برس کی عمر میں اس ہستی کو دنیاوی سائے سے محروم کر دیا گیا جسے خود آگے چل کر شاہ و گدا کے لئے شجر سایہ دار بننا تھا۔ قاضی اللہ دتہ نے دم آخر ڈوبتی نگاہوں سے اپنے لاثانی لخت جگر کو شریک حیات کے سپرد کیا اور ان کی داستان حیات کا عارضی باب اختتام پذیر ہوا۔ ایک زندگی کی شام ہوئی دوسری کا آغاز ہوا موت کی زندگی کا اختتام سمجھنا پرلے درجے کی جہالت ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

رابعہ ثانی نے اپنے فرزند محمد میر کو سلسلہ قادریہ سے باقاعدہ متعارف کرایا، ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ علم باطن تعلیم کیا۔ طلب و عطا کا یہ سلسلہ پانچ برس تک جاری رہا بارہ برس کی عمر میں بچے پر عالم ملکوت کے اسرار ظاہر ہونے لگے والدہ کی ذات بابرکات اور زہد و تقویٰ پشت پناہی کو موجود تھے۔ عطا میں خلوص کی انتہا نہ تھی راہ سلوک کا مسافر برق رفتاری سے منازل طے نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ میاں میرؒ اس لحاظ سے خوش بخت واقع ہوئے تھے کہ راہبر، حقیقی معنوں میں دل و جاں فدا کرنے والا تھا۔ پروردگار نے بھی ماں کی محبت ہی کو معیار قرار دیا ہے (اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رب کائنات اپنے ہر بندے پر ستر ماؤں سے زیادہ محبت نچھاور فرماتا ہے) بالا پیر اکثر اوقات راہبر سے اجازت لے کر سیوستان کی پہاڑیوں میں یا کسی مناسب گوشہ تنہائی میں عبادت اور غور و فکر کی خاطر چل دیتے۔ اضطراب حد سے بڑھ جاتا تو یہ پہاڑی سلسلہ ”گرفتار نو“ کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔

”امی جان! جانے کیوں مجھے ان پہاڑیوں میں پہنچ کر دولت سکون و اطمینان میسر آتی ہے“ ایک روز محمد میر نے والدہ سے کہا

”فرزند! اس بات کا جواب تمہیں عنقریب مل جائے گا بس اتنا یاد رہے کہ جہاں آب و

دانہ ہو وہیں پرندہ چہچہاتا ہے" رابعہ ثانی نے زیرلب مسکرا کر فرمایا۔

"آب و دانے کے ساتھ صیاد کے جال کی موجودگی کا احتمال بھی تو ہوتا ہے" ماں، بیٹے یا پیر و مرید میں اشارے کنائے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ والدہ نے چونک کر لخت جگر کی طرف دیکھا۔

"بیٹا جال سے تمہاری مراد اگر شیطانی وسوسے ہیں تو ان کی موجودگی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن جن شاہینوں کے پروں میں دم خم ہو وہ کبھی زیردام نہیں آتے۔ خدا کے فضل و کرم سے تمہاری رگوں میں فاروقی خون رواں دواں ہے اور پشت پناہی پر غوث الثقلین پھر ابلیس لعین سے کیوں خائف ہو؟"

"امی حضور! میں خائف نہیں بلکہ اس لعین سے دو دو ہاتھ کرنے کو بے تاب ہوں" محمد میر اصل مدعا زبان پر لے آیا۔ دن گزرتے رہے اور بچے کا اضطراب بڑھتا رہا جو کچھ والدہ ماجدہ کے پاس تھا وہ حاصل کیا جاچکا تھا۔ شاہین کو رنگین ابرپارے دعوت پرواز دے رہے تھے وہ آسمان سلوک کی بے کراں وسعتوں میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔ رابعہ ثانی اپنی ظاہری آنکھ اور باطنی چشم بصیرت سے سب کچھ ملاحظہ فرما رہی تھی۔ آخر ایک روز جدائی کی گھڑی نے در پر آ دستک دی۔

"امی حضور! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں سفر اختیار کر جاؤں؟" محمد میر کے دل کی بات زبان پر آہی گئی آپ کی دعاؤں کے طفیل میں بے سر و سامان نہیں رہا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی مجھے کافی کچھ حاصل کرنا ہے"

"ہاں میرے فرزند ابھی تمہاری منزل واقعی بہت دور ہے، میں نے تجھے خدا کی حفظ و امان میں دیا" پھر فاطمہ خاتون نے بیٹے کو سینے سے لگایا چند وظائف بطور خاص عنایت کئے اور لخت جگر کو سفر کی اجازت دے دی۔ آپ میں ابھی تک بلوغت کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے مگر قلب و نظر میں وسعت پیدا ہو چکی تھی۔

محمد میر نے قلب سلیم کو راہبر تسلیم کیا۔ (قلب سلیم جس میں تقویٰ، ایمان، عرفان تینوں صفات پیدا ہو چکی ہوں) دل تھا کہ سیوستان کی پہاڑیوں کی طرف جانے کو بے قرار ہو رہا تھا "اس میں ضرور کوئی مصلحت ہے" راہ سلوک کے مسافر نے سوچا "ورنہ یہ بے تابی بلاجواز نہیں ہو سکتی۔"

پہاڑیوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ دولت قناعت سے مالامال تھے "رخت سفر" کی حاجت ہی نہ تھی۔ پنچھی اور درویش جب سفر اختیار کرتے ہیں تو "رزق" کے بکھیڑے نہیں پالا کرتے۔ صرف رازق کے بھروسے پر چل نکلتے ہیں اور بالا پیر کی قناعت کا تو یہ عالم تھا کہ غبار شام کے اترتے ہی کوزے کا پانی تک گرا دیتے اور فرماتے "مجھے اس کی رزاقی پر ایمان کامل ہے اور ایمان ہی کا تقاضا ہے کہ ضرورت سے زیادہ پانی کی ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے۔" بھوک زیادہ ستاتی تو کسی درخت کا پھل استعمال میں لے آتے تشنگی دور کرنے کے لئے پہاڑوں کے پتھروں سے پانی حاصل ہو جاتا۔ سورج نصف النہار پہ تھا جب ایک باریش ہستی سے محمد میر کی ملاقات ہوئی۔

"یہ عمر اور زہد و تقویٰ کا یہ عالم‘ باریش بزرگ نے توصیفی کلمات سے آپ کو مخاطب کیا۔ "اپنی عبادت کے طفیل ہی تم اس ویرانے میں زندہ سلامت موجود ہو" لڑکے نے چونک کر اجنبی کو دیکھا۔ پل بھر کے لئے تعریفی کلمات سے فصیل جاں میں سرور کی لہر سی اٹھی مگر فوراً ہی مثبت سوچ نے اسے دبا دیا۔ "آپ کی تعریف؟" محمد میر نے شائستہ لہجے میں اجنبی سے پوچھا۔ "میں رب کائنات کی جانب سے بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہ راست پر لانے کے لئے مامور کیا گیا ہوں" اجنبی نے دراز ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "مگر تمہاری پیشانی نور عبادت سے منور ہے تمہیں "راہ راست" کی ضرورت ہی نہیں"

"راہ راست کی ضرورت تو ہر فرد بشر کو ہر پل رہتی ہے محترم‘ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟" محمد میر نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"برخوردار! خالق کائنات کی بے ریا عبادت جسے تم زندگی کا شعار بنا چکے ہو‘ بہت بڑی بات ہے۔ اس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ عبادت ہی تو بندے کی بخشش کا وسیلہ ہے" اجنبی نے بڑے دلکش انداز میں رنگین جال پھینکا "اور بخشش ہی کی ساری اہمیت ہے یہی تو جنت میں داخل ہونے کا شہادت نامہ ہے میں تمہیں چند ایسے وظائف تعلیم کرنا چاہتا ہوں جو تقرب الٰہی کے لئے تیر بہ ہدف کا درجہ رکھتے ہیں" اجنبی اپنی رو میں کہتا جا رہا تھا مگر محمد میر کے ہونٹوں پر عجیب نوعیت کی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"محترم! میں آپ کو اچھی طرح پہچان گیا ہوں‘ آپ سے ملاقات کا تو میں ایک عرصے سے تمنائی تھا" لڑکے نے بے باک لہجے میں کہا "رہی بخشش والی بات تو کان کھول کر سن لو اس کا

دارومدار عبادت پر نہیں خواہ وہ بے ریا ہی کیوں نہ ہو، بخشش صرف اور صرف اس کی رحمت اور کرم نوازی کا نتیجہ ہوگی ورنہ جس انسان کی تخلیق کا آغاز ناپاک حیض والے خون سے ہو وہ کس منہ سے اپنے تقدس کا راگ الاپ سکتا ہے۔ کبھی آپ نے انسان کی ہڈیوں کو پہنائے ہوئے لباس پر غور فرمایا؟ ہمیں صرف "کھال" عطا کرکے اور اندر کی غلاظتوں کی پردہ پوشی فرماکر رب کائنات نے کتنی بڑی کرم نوازی فرمائی۔ ہم کس منہ سے عبادت بے ریا کا ڈھنڈورا پیٹیں اور اپنی عبادت کو بخشش کا وسیلہ قرار دیں؟ ہم جو غلاظت کا ڈھیر ہیں اپنے تقدس پر کیوں کر اترائیں؟ لڑکے کا انداز بیاں 'باڑ پہ آئی ہوئی ندی کی مانند اجنبی کے فلسفے کو بہالے گیا اور اجنبی حیران و ششدر اسے دیکھنے لگا۔ "آپ کے وظائف کا جواب میں صرف ایک فقرے سے دیتا ہوں اور وہ ہے "لاحول ولاقوت" محمد میر کے ہونٹوں سے یہ کلمات ادا ہوئے تو دراز ریش اجنبی چیختا چلاتا دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس پہاڑی علاقے میں فرزند رابعہ ثانی کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ابلیس نے کیسے کیسے رنگین جال پھینکے اور کون کون سے داؤ آزمائے یہ ایک طویل داستان ہے مگر راہ سلوک کے جواں ہمت مسافر کے پائے استقامت میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی۔ یہ رب کائنات کی خاص کرم نوازی سے ممکن ہوا۔ اسی علاقے میں ایک روز محمد میر کو ایک ایسی شے دکھائی دی جس کی موجودگی کا وہاں کوئی جواز نہ تھا۔

پھرتے پھراتے محمد میر ایک ایسے مقام پر پہنچے جو فرش زمیں پر جنت کا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا پھل دار اشجار پر طائران خوش گلو چہچہا رہے تھے مگر ایک کونے میں تنور تھا جس کا منہ پتھر سے ڈھانپا ہوا تھا وہ حیرت زدہ اس تنور کو دیکھنے لگے۔ "سبزہ و گل اور پرندوں کی موجودگی کے سبب اس جگہ کو آباد قرار دیا جاسکتا ہے مگر انسانوں کی عدم موجودگی اسے ویران بنائے دے رہی ہے محمد میر نے دل میں سوچا "اس تنور سے پرندے تو استفادہ کرنے سے رہے تو پھر اس کی یہاں موجودگی کا سبب؟' کون یہاں روٹیاں پکاتا ہے؟ روٹیوں والے سوال کو دل نے رد کردیا تو دھڑکتے دل سے انہوں نے آگے بڑھ کر تنور کا "ڈھکنا" اٹھایا اندر ایک بڑا سا پتھر دکھائی دیا جو اندرونی تمازت سے گرم تھا۔ ساری صورتحال کی وضاحت ہوگئی۔ کم از کم دل نے یہی وضاحت پیش کی۔ "یہ ضرور کسی تنہائی پسند مرد درویش کا ٹھکانہ ہے" محمد میر بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ راہ سلوک کے مسافر اسے "ترک و تجرید" کا نام دیتے ہیں یعنی مکروہات

زمانہ سے نجات حاصل کر کے گوشہ تنہائی میں پوری یکسوئی سے 'یاد الٰہی میں مصروف ہو جانا۔ واضح ہو جوگ سنیاس اور ترک و تجرید بظاہر ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں مگر ان میں واضح فرق ہوتا ہے۔ ترک و تجرید جو بالاپیر کا طریقہ کار رہا' زمانے سے نہیں مکروہات زمانہ سے قطع تعلق کا نام ہے ورنہ خلق خدا کو جتنا فیض حضرت میاں میرؒ نے پہنچایا اس سے ایک زمانہ آشنا ہے۔

''اس مرد قلندر سے ملاقات ہونی چاہئے یہ سوچ کر محمد میر اس تنور کے قریب بیٹھ گئے۔ غبار شام اترا شب سیاہی نے ہر چیز کو ڈھانپ لیا۔ سطح سمندر سے بلندی کے سبب خنکی' شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ دل میں خیال آیا تنور کی تمازت سے راحت حاصل کی جائے' مگر مرد قلندر کی جگہ بیٹھنا سوئے ادب کے زمرے میں آتا ہے' یہی سوچ کر تنور کے اندر بیٹھنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ خیال تو خیال راہ عشق کے مسافر تو بے ادب دل کو سینے سے نکال باہر کرتے ہیں۔ سینہ عشاق تو مثل مدینہ ہوتا ہے اور مدینے میں بے ادبوں کا کیا کام؟

کل شب آوارہ کو سینے سے نکالا
یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا

رات تنور سے باہر' سردی میں ٹھٹھرتے گزاری' طلوع آفتاب کے بعد سردی سے تو نجات مل گئی مگر بھوک ستانے لگی۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی' معلوم ہوا آج کا رزق ابھی تک نہیں اترا' سجدہ شکر ادا کیا گیا۔ اچانک پھل دار درختوں پر نگاہ پڑی۔ قدم قریب ترین درخت کی جانب اٹھے اور بے اختیار ہاتھ پھل کی طرف بڑھا' مگر اچانک محمد میر نے ''دست دراز'' کو روک لیا۔ ''یہ اشجار ممکن ہے کسی کی ملکیت ہوں۔ مالک کی اجازت بغیر پھل توڑنا اور آتش شکم بجھانا گویا لقمہ حرام نگلنا ہوا'' یہ سوچ کر راہ سلوک کا مسافر پھر اپنی جگہ آن بیٹھا۔ سارا دن اسی انتظار میں گزر گیا پھر ہر چیز نے شب سیاہی کی چادر اوڑھ لی مرد درویش کو آنا تھا نہ آیا مگر محمد میر پوری استقامت سے محو انتظار رہے۔ انتظار طول شب فراق سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ تین راتیں اور تین دن اسی آزمائش میں گزر گئے۔ دل کہتا تھا کہ آنے والا ضرور آئے گا اور اچانک آئے گا۔ بھوک پیاس کو شکست فاش دی جا چکی تھی۔ اس فساد کی جڑ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تو اندر کا شور قدرے کم ہوا۔ خدا خدا کر کے مرد قلندر تشریف لائے۔ یہ چوتھے روز کی روداد ہے۔ درویش کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بے تابی دل کو قرار سا آ گیا۔ شاید اسی ''قرار'' کی خاطر اتنے شب و روز دل سپرد اضطراب رہا تھا۔

”السلام علیکم یا حضرت“ محمد میر نے مودبانہ لہجے میں اٹھ کر استقبال کیا۔

”وعلیکم السلام محمد میر کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو“ آنے والے نے نام لے کر سلام کا جواب دیا تو محمد میر کو منزل دو قدم پر دکھائی دینے لگی جیسے تپتے صحرا میں راہ گم کردہ مسافر شاداب نخلستان تک آپہنچے، جیسے تشنہ لب مسافر جھیل کنارے آجائے۔

حضور! بھٹکنے والی بات تو قصہ پارینہ ہوئی اب تو منزل مراد تک رسائی ہوگئی، چنتا، فکر، اندیشے سب پیچھے رہ گئے۔“

”محمد میر زیادہ گفتگو سے اجتناب کیا کرو“ آنے والے نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

”حضور! آپ میری دلی کیفیت سے بخوبی واقف ہیں میری کیفیت امام غزالی والی ہو رہی ہے“ مرد درویش نے چونک کر شاہین صفت لڑکے کو دیکھا جس نے ایک فقرے میں پوری داستان بیان کردی تھی کوزے میں دریا نہیں سمندر بند کردیا تھا۔

ایک بار موسیٰ کلیم اللہ کو سرور کائنات ؐ سے شرف گفتگو ہوا ”آپ فرماتے ہیں کہ آپ کی امت میں ایسے ایسے بلند مرتبت علماء ہونگے جن کا مقام دوسری امتوں کے انبیاء جیسا ہوگا“ کلیم اللہ نے پوچھا ”میں آپ کے کسی ایسے ہی امتی کو دیکھنا چاہتا ہوں“

”سرور کائنات نے روح امام غزالی کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ موسیٰ کلیم اللہ نے بغور امام غزالی کو دیکھا اور فرمایا ”تمہارا نام؟“

”ابو حامد محمد بن محمد الطوسی اور دنیا مجھے امام غزالی کے نام سے جانتی پہچانتی ہے میرا پیشہ...... “امام غزالی تفصیل بیان کئے جا رہے تھے کہ موسیٰ علیہ نے مداخلت کی۔

”میں نے صرف نام پوچھا تھا تم نے لمبی چوڑی غیر ضروری گفتگو شروع کردی “موسیٰ علیہ نے امام غزالی کو روکتے ہوئے فرمایا ”آپ سے اللہ تعالیٰ نے صرف یہ دریافت فرمایا تھا ”موسیٰؑ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ آپ کو صرف اتنا کہہ دینا چاہئے تھا یہ میرا عصا ہے مگر آپ کا جواب تھا۔ ”یہ میرا عصا ہے میں اس پر سہارا لیتا ہوں اور اس سے اپنی بکریاں ہانکتا ہوں بھلا اس گفتگو کی کیا ضرورت تھی؟“

”ابو حامد! حد ادب تم کلیم اللہ سے ہم کلام ہو“ سرور کائنات نے سرزنش کی اور اپنے پائے مبارک سے امام غزالی کی ٹانگ پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔ امام غزالی کا جواب بے شک لاجواب تھا مگر شان پیغمبری میں سوئے ادب کے زمرے میں آتا تھا۔ عالم ارواح میں

سرور کائنات کی رسید کی ہوئی ٹھوکر کی بناء پر امام غزالی ایک ٹانگ سے سے ہلکا سا لنگڑا کر چلا کرتے تھے۔ (موسیٰؑ کی رب کائنات سے مکالمت قرآن میں موجود ہے) مرد درویش کو محمد میر کی گفتگو اتنی پسند آئی کہ بے اختیار آگے بڑھ کر نو عمر لڑکے کو سینے سے لگالیا یہ ایک پائیدار رشتے کا اعلان تھا۔ وہی رشتہ جو راہ سلوک میں مرید و مرشد کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

یہ درویش، ترک و تجرید میں یکتا، متوکلوں کے امام اور سلسلہ قادریہ کے یگانہ آفاق بزرگ حضرت خضر سیوستانیؒ تھے۔ بالا پیران کو غوث وقت کہا کرتے تھے۔ ابدال وقت حضرت خضر سیوستانیؒ سے روحانی سلسلے کے علاوہ بالا پیر، سرور کائنات کے "اویسی" بھی تھے۔

"اویسی" ان بزرگان دین کو کہتے ہیں جن کو ظاہری مرشد و راہبر کی حاجت نہ ہو اور وہ بلاواسطہ حضور اکرمؐ سے فیض یافتہ ہوں۔ تصوف کی بلند پایہ تصنیف **نضحات الانس** "میں شیخ فرید الدین عطار نے اس کی بڑی دلنواز تشریح فرمائی ہے متن پیش خدمت ہے۔

"بعض اولیا اللہ کو مشائخ طریقت "اویسی" کہتے ہیں۔ ان ہستیوں کو رسالت پناہ صلہ بلاواسطہ اپنی عنایت کی حمایت میں پرورش فرماتے ہیں جیسا کہ اویس کرنیؓ کی پرورش فرمائی لہٰذا ان کو کسی دوسرے مرشد و راہبر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی سنت نبویؐ پر عمل پیرا ہو کر بعض اولیاءاللہ نے جو حضورؐ کے تابعین میں سے تھے، اپنے بعض طالبوں کی روحانی تربیت فرمائی۔ وہ بھی "اویسی" کہلاتے ہیں (اس اعتبار سے حضرت میاں میر، رسول اکرمؐ کے اویسی قرار دیئے جاتے ہیں)

"عزیزم! یہاں کب سے محو انتظار ہو" خضر سیوستانی نے گرفتار نو سے پوچھا۔

"حضور! تین روز سے یہاں بیٹھا ہوں، مگر ناامید ہرگز نہ تھا۔"

"مگر میں تو شاید کل رات اسی جگہ موجود تھا" یا شاید نہیں تھا یہ عالم استغراق کی کیفیت تھی۔

"حضور! آپ کو یہاں سے غائب ہوئے تین روز گزر چکے ہیں"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

خضر سیوستانی، توکل کے منفرد مقام پر فائز تھے۔ موسموں کی شدت نظرانداز کرتے ہوئے صرف ایک تہبند، زیب تن ہوتا جو ناف سے زانوؤں تک ستر پوشی کے کام آتا اس کے علاوہ ایک لوٹا اور بوریا، دنیاوی ساز و سامان تھا۔ لوگ اسے بے سرو سامانی قرار دیتے مگر

کچھ خوف احتساب نہ سود و زیاں کا ڈر

یہ فائدہ تو بے سرو سامانیوں کا ہے

کے مصدق آپ کی نگاہ دنیاوی ساز و سامان کے سود و زیاں پر تھی۔ طہارت کا خاص اہتمام ہوتا اس کے لئے لوٹا بے حد ضروری تھا۔ ترک و تجرید پر سختی سے کاربند تھے۔ آبادی سے دور پہاڑی مقام پر بسیرا ہوتا۔ کبھی کبھی آبادی کا رخ کرتے اور حقوق العباد کی ادائیگی کے بعد اپنے ٹھکانے کو لوٹ جاتے۔ موسم کی خنکی اگر شدت اختیار کر جاتی تو تنور دہکا کر اس میں بیٹھ جاتے جب خالق کائنات سے محو راز و نیاز ہوتے تو گرمی سردی کا احساس مٹ جاتا۔ یہی وہ تنور تھا جس پر بالا پیر کی نگاہ پڑی تھی۔ اس دور میں خضر سیوستانی مقام ”استغنا“ کو بہت پیچھے چھوڑ چکے تھے جب حاکم سیوستان ملاقات کو حاضر ہوا۔ درویش دھوپ میں بیٹھا تھا حاکم وقت سامنے آ کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

”یہاں تشریف لانے کا سبب؟“ درویش نے حاکم وقت کے لباس فاخرہ کو ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میری تمنا ہے کہ آپ کسی خواہش کا اظہار فرمائیں اور میں تعمیل ارشاد میں خدمت بجا لاؤں“

”جہالت، کدورت، گمرہی کے علاوہ تم مجھے کیا عطا کر سکتے ہو کیونکہ یہی اشیاء بافراط تمہاری ملکیت میں ہیں“ فقیر بے ریا نے بے باکی سے جواب دیا۔

”حضور، پھر بھی خدمت کا موقع تو عطا فرمائیں۔“

”اگر کچھ دینا ہی چاہتے ہو تو سورج کی آنے والی کرنوں کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ یہ بڑا لمبا سفر طے کر کے مجھ تک پہنچ رہی ہیں“ درویش نے ناگواری سے کہا حاکم وقت خجل خجل سا ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے خضر سیوستانی کی بے نیازی کے متعلق سن رکھا تھا مگر سننے اور دیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

”حضور! کم از کم مجھے اپنی دعاؤں ہی میں یاد رکھیں۔“

?خدا وہ وقت نہ لائے جب میرے دل میں پل بھر کے لئے بھی ماسوا کا خیال پیدا ہو، اب تم یہاں سے جا سکتے ہو، مجھے اس خسارے کو پورا کرنا ہے جو تم جیسے سگ دنیا سے محو کلام ہو کر اٹھا چکا ہوں۔“

حاکم سیوستان کھسیانہ ہو کر، آستانہ فقیر سے لوٹ آیا۔ جن کو آسمان جیسی وسیع و عریض

چھت' زمین جیسا کشادہ فرش' خدمت کے لئے آفتاب و مہتاب کی کرنیں میسر ہوں ان کو اور کیا چاہئے۔ خضر سیوستانی' بھوک' پیاس مٹانے کے لئے جنگلی پھلوں کو زیر استعمال لاتے۔ اس بلند مرتبہ فنافی الذات کا مزار سکھر ریلوے سٹیشن کے قریب دریائے سندھ کے وسط میں' سعد بیلہ کے مقام پر موجود ہے۔ مزار کے قریب ایک مندر اور ایک گوردوارہ بھی ہوا کرتا تھا۔ (قیام پاکستان تک مندر اور گوردوارے دونوں موجود تھے آج کی خبر خدا جانے) مغل شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں حضرت بالا پیر کے مرشد کا وصال ہوا 994ھ بمطابق 1586ء تاریخ وصال کے لئے مفتی غلام سرور لاہوری کا فارسی مصرع ہے

آفتاب عارفاں' حق بگو 994ھ

سیوستان کی پہاڑیوں میں بالا پیر کی تربیت کا اعلیٰ دور شروع ہوا۔ خضر سیوستانی نے دل کھول کر عطا کیا۔ ادھر طلب کی شدت بھی انتہا کی تھی۔ عمروں میں طے ہونے والی منازل دنوں' مہینوں میں طے ہونے لگیں۔ راہوار سرپٹ دوڑا تو زمان و مکاں کی گویا طنابیں کھینچ لی گئیں۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا ایک تو میاں جیو' اویسی تھے دوسرے مرشدی سلسلہ تذکرہ الفقرا کے حوالے سے غوث الثقلین تک جا پہنچتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

حضرت میاں میر مرید شاہ خضر ابدال سیوستانیؒ مرید شاہ سکندرؒ قادری کیتھلی مرید۔ کبیر الاولیا خواجہ شاہ کمال مرید سید علی قادری' مرید حضرت شاہ جمال مجرد و مرید' حضرت لال شہباز قلندر' مرید حضرت ابو اسحاق ابراہیمؒ مرید شیخ مرتضیٰ سبحانی مرید شیخ احمد بن مبارک' مرید شیخ عبدالقادر جیلانیؒ غوث الثقلین ان روحانی روابط کے علاوہ جو سلسلہ ہر مکتبہ فکر کے بزرگان مستند قرار دیتے ہیں وہ ختمی مرتبتؐ تک بڑے دل نواز طریقے سے پہنچتا ہے اس کی ہر کڑی عظمت بے کراں کا مظہر ہے۔ یہ مقام یہ مرتبہ کمایا نہیں جا سکتا۔ قادر مطلق کی خاص کرم نوازی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ چشم بصیرت وا کر کے ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت میاں میر قادری خلیفہ خضر ابدال سیستانی' خلیفہ سید احمد ولی' سید عابد کبیر قادری' شیخ ابوالقاسم قادری' شیخ موسیٰ حلبی' شیخ ابوبکر مقبول' شیخ داؤد کریمؒ شیخ سلیمان قادری' شیخ حفص ابوبکرؒ خلیفہ شیخ حسن علی قرشی' قطب الافاق شیخ' عبدالرزاق جیلانی خلیفہ' محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی' خلیفہ ابوسعید مخزومی' شیخ ابوالحسن ہنکاریؒ' ابوالفرح طرطوسیؒ شیخ عبدالواحد تمیمیؒ' شیخ ابوبکر شبلیؒ شیخ ابوالقاسم جنید بغدادیؒ' خلیفہ حضرت سری سقطی' حضرت

معروف کرخی، حضرت داؤد طائی، حضرت حبیبؒ، حضرت حسن بصری، خلیفہ اسد اللہ الغاطب علی کرم اللہ وجہ، خلیفہ مولائے کائنات فخر موجودات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم

"بیٹا جی، پرسکون بہتے دریا میں سیلاب آجائے تو کیا کرنا چاہیے؟" ایک روز خضر سیستانی نے اپنے مرید باصفا سے کہا۔

"دریا کی گزرگاہ کو گہرا کردینا چاہیے" محمد میر نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

"اگر یہ ممکن نہ رہے تو؟ مرشد نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"دریا کی روانی کو متبادل راستہ بھی فراہم کردینا چاہیے تاکہ سیلاب کا زور ٹوٹ جائے اور خلق خدا اس سے مستفید ہوسکے" بالا پیر نے بصد احترام جواب دیا۔ مرشد کا مفہوم سمجھ کر ان کا دل دھڑکنے لگا۔

عزیزم تم نے سچ کہا، جدائی کی گھڑی سر پر آچکی ہے، اب تم مدینتہ الاولیا لاہور کی طرف کوچ کر جاؤ۔ یہی لوح محفوظ پر لکھا ہے لہٰذا رضائے الٰہی کے آگے ہمیں سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔"

1575ء میں حضرت میاں میر نے سرزمین لاہور پر قدم رنجا فرمایا۔ یہ جلال الدین محمد اکبر مغل شہنشاہ کا دور حکومت تھا۔ نصیرالدین ہمایوں سفر آخرت اختیار کرچکا تھا۔ واضح ہو مغل شہنشاہ اکبر 1585ء سے 1598ء تک بغاوتوں کو کچلنے اور شورشوں کو رفع کرنے کی غرض سے لاہور میں قیام پذیر رہا۔ اس دور خرابی میں مسلمان نسبتاً" کمزور اور اقلیت میں تھے۔ ہندومت نے اسی دور میں پر پرزے نکالے، بھگتی تحریک کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ یہ ایک خالص ہندو تحریک تھی جو مسلمانوں کے انہدام اور اسلام کے ہندومت میں ادغام کے لئے معرض وجود میں آئی۔ ہندوؤں نے حاکم وقت کی سیاسی اغراض کا بغور مطالعہ کیا اور اسے غرضوں کے رنگین بستر فراہم کئے۔ یہ سیدھا سادہ سیاسی ضروریات کا مسئلہ تھا جس کی بناء پر اکبر اعظم ہندومت کی گود میں جا بیٹھا۔ ہندوؤں نے اسے مہابلی بنادیا اور مہابلی نے رشتے داروں سے ان کی وفاداریاں خرید لیں اور روح اسلام کے زخموں کو نظرانداز کردیا۔

علمائے سو اور درشتی ریاکار صوفیا کا گروہ سرکار دربار سے منسلک ہوگیا، ان پر انعام و اکرام کی بارش ہوئی اور اہل دل حضرات پس دیوار زنداں، عتاب کی چکی میں پسنے لگے۔ دنیا کے عشاق و طلب گار اکبر کے جھنڈے تلے جمع ہو کر اپنی اپنی ڈفلیاں بجانے لگے۔ اسی رقص

ابلیس کی روشنی میں جسے اندھیرا کہنا زیادہ مناسب ہے' اکبر نے وحدت ادیان کے نام پر دین الٰہی کی بنیاد رکھی۔ یہ ایک ایسی عمارت تھی جس کی بنیاد میں زلزلے قیام پذیر تھے۔ اس کا زمیں بوس ہونا تو یقینی امر تھا مگر وقتی طور پر اہل دنیا کو اس نے مرعوب ضرور کیا۔ جہاں تک دل والوں کا تعلق ہے تو وہ زبان حال سے پکار پکار کر کہنے لگے۔

جہاں بھونچال بنیاد فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

علمائے حق اور مشائخ سروں پہ کفن باندھ کر اس طوفان بدتمیزی کے سامنے ڈٹ گئے۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی' حضرت باقی باللہ اور دیگر سلسلہ قادریہ کے بزرگان نے مل کر "جرگہ مدان اسلام" قائم کیا اور خیر و شر میں نبرد آزمائی کا آغاز ہوا۔

حضرت میاں میرؒ نے اپنے منفرد انداز میں اس کا مقابلہ کیا۔ احیائے ملت کا یہ انداز اتنا دلفریب تھا کہ بلاامتیاز مذہب و ملت' عوام الناس ان سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرنے لگے۔ درویش کے قیام لاہور پر روشنی ڈالنے سے پیشتر اس عقیدت و احترام کی صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سکھ مت کے پانچویں گرو' ارجن دیو' حضرت میاں میر کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ کرنل بھولا ناتھ نے تاریخ لاہور میں ان کو بالا پیر کا متر یعنی دوست لکھا ہے۔ 1588ء میں گرو ارجن دیو کو سکھوں کی مقدس ترین عبادت گاہ دربار صاحب (ہرمندر) کی تعمیر کا خیال آیا تو اس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے غور و خوض ہوا "بنیادی پتھر اس دور کی عظیم ترین ہستی کے دست مبارک سے رکھوایا جائے گا" گوروارجن نے اعلان کیا چنانچہ حضرت میاں میر سے درخواست کی گئی۔ اس رسم کی ادائیگی کے وقت ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ مقدس تالاب بنوانے کے بعد گوروارجن دیو اپنے دھرم کی مقتدر شخصیات کے ساتھ دربار صاحب کا سنگ بنیاد رکھے جانے کے منتظر تھے۔ حضرت میاں میر نے اپنے دست مبارک سے پہلی اینٹ رکھی تو وہ اتفاقاً "الٹی رکھی گئی۔ (یہ محض اتفاق تھا یا عمداً ایسا کیا گیا' اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا) معمار اپنے تجربے کے زعم میں تھا اس نے جھٹ اسے سیدھا کردیا۔ ظاہر ہے اینٹ کو سیدھا کرنے کے لئے اصل جگہ سے ایک بار اکھیڑنا پڑا۔ گوروارجن دیو تڑپ کر آگے بڑھے مگر ہونی ہو چکی تھی۔ اینٹ اپنے مقام سے اکھیڑ کر دوبارہ اسی جگہ رکھی جاچکی تھی۔

ارجن دیو کا رنگ فق ہو گیا رفتہ رفتہ ان کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

”ظالم انسان! یہ تو نے کیا غضب ڈھایا' مقدس ہاتھوں کی رکھی ہوئی اینٹ کو الٹ کے رکھ دیا۔ “گورو ارجن خلاؤں میں گھور رہے تھے۔ ”اب کوئی شکتی اس مقدس عمارت کو تباہ و برباد ہونے سے نہیں بچا سکے گی۔ یہ برباد ہو کر پھر آباد ہو گی یہی اس کا مقدر ہے' میرا امرتسر سے لاہور کا سفر رائیگاں گیا“ گورو ارجن دیو نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

کیا یہ محض اتفاق تھا کہ 1761ء میں یعنی ایک سو تہتر برس بعد' احمد شاہ ابدالی نے اس مقدس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ”ہرمندر“ تباہ و برباد ہوا اور ارجن دیو کی پیشین گوئی کے عین مطابق' چار برس بعد از سر نو آباد ہوا۔ سکھوں نے یہ سارے واقعات اپنی اتہاس (تاریخ) میں محفوظ کر لئے۔ جون 1984ء بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کے حکم سے ”آپریشن بلیوسٹار“ کے ذریعے ایک بار پھر دربار صاحب امرتسر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ چونکہ اس بار آتشیں اسلحہ کا استعمال بڑی بے رحمی سے ہوا تھا لہٰذا اس تباہی کی مثال نہیں ملتی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عمارت جس کا سنگ بنیاد بالا پیر نے اپنے مقدس ہاتھوں سے رکھا تھا اور کتنی بار تباہی کا سامنا کرے گی؟ ہیں گورو ارجن دیو کی پیش گوئی کا مفہوم یہ تو نہیں تھا کہ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا؟

دربار صاحب کے سنگ بنیاد والا واقعہ گورو ارجن دیو اور حضرت میاں میر کے تعلقات کی وضاحت کر دیتا ہے۔ قدیم گرنتھ بابا گورو نانک میں تو یہاں تک مرقوم تھا کہ ”ہرمندر“ امرتسر کا سنگ بنیاد اس دور کا بہترین انسان رکھے گا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ کام حضرت بالا پیر کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ دربار صاحب کے صدر دروازے کے قریب ”مقام میاں میر تھا جہاں شاجیو' بابا فرید گنج شکرؒ اور دوسرے بزرگان دین کے تبرکات محفوظ تھے۔ (بعد میں یہ مقام رہانہ تبرکات) 1979ء تک دربار صاحب آرٹ گیلری میں حضرت میاں میرؒ کی تصویر بھی آویزاں تھی جو سوبھا سنگھ مصور کی کاوش کا نتیجہ تھی اس کے بعد کی ہمیں خبر نہیں۔

واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کی خاطر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قصے کے مزید حالات بھی بیان کر دیئے جائیں۔ عہد جہانگیر میں ہندو نژاد دیوان چندو مل کا دربار جہانگیری میں اثر و رسوخ تھا۔ یہ شخص بوجوہ گورو ارجن دیو کا جانی دشمن بھی تھا۔ اس کی ریشہ دوانیاں رنگ

لائیں اور ارجن دیو کو پابند سلاسل ہونا پڑا۔ گورنر لاہور کے علاوہ شہنشاہ جہانگیر کو یقین دلادیا گیا کہ گورو ارجن دیو کی آزادی' سلطنت مغلیہ کے مفاد میں نہیں بلکہ آتش فساد کا باعث بن سکتی ہے۔ مطلق العنان شہنشاہ کی جبیں شکن آلود ہوئی' گورو ارجن دیو کی زندگی کا چراغ گل کردینے کا فیصلہ ہوا۔ بالا پیر کو گورو موصوف کی بے گناہی کا یقین تھا لہٰذا مداخلت ناگزیر تھی۔ درویش کو دربار جہانگیر تک جانا پڑا۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ جہانگیر خود ورطہ حیرت میں ڈوب گیا۔ جلال بادشاہی' نگہہ درویش کا سامنا نہ کرسکا۔

"حضور! خیریت باشد؟" جہانگیر نے مؤدب لہجے میں استفسار کیا۔

"تمہارے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنا مقصود تھا' اس لئے فقیر کو دربار میں حاضر ہونا پڑا" بالا پیر نے سنجیدگی سے فرمایا۔

"حکم کیجئے' تعمیل ارشاد ہوگی۔"

"ارجن دیو بے گناہ ہے اس کے خون ناحق سے باز رہو" شہنشاہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ایک طرف ملکی استحکام کا تقاضا اور سیاست' دوسری طرف حکم درویش نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن' عجیب صورت ہوگئی۔

"اس بات کی ضمانت میں دیتا ہوں کہ ارجن دیو سلطنت مغلیہ کا دشمن نہیں" درویش نے حاکم وقت کی مشکل آسان کردی۔

"پیرو مرشد' تعمیل ارشاد ہوگی" جہانگیر نے ارجن دیو کے قتل کا حکم واپس لے لیا لیکن بات یہیں ختم نہ ہوئی۔ چندو مل اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہ آیا اور موقع میسر آتے ہی وار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ گورو ارجن دیو کو ایک بار پھر پس دیوار زنداں ہونا پڑا۔ چنانچہ ان کا انتقال بندی خانے میں ہوا۔ اس انتقال کے پیچھے بھی ایک داستان ہے۔

اس زمانے میں دریائے راوی قلعہ لاہور کے نیچے سے بہتا تھا یعنی گزرگاہ فصیل کے ساتھ تھی۔ گورو ارجن دیو کو اسی قلعہ اکبری میں مقید کیا گیا تھا۔ ایک بار انہوں نے اشنان کی خواہش کا اظہار کیا۔ پانی میں قدم رکھا تو دریا برد ہوگئے۔ بپھری ہوئی موجیں ان کو بہا کر جانے کہاں لے گئیں۔ عہد رنجیت سنگھ میں عین اس جگہ ان کا گورودوارہ تعمیر ہوا۔ بہرحال دریا برد ہوئے یا طبعی موت تھی۔ سفر آخرت قید خانے میں اختیار کیا۔

گورو ارجن کے بعد ان کا فرزند ہرگوبند گدی نشین ہوا۔ حضرت میاں میر کی معاونت

سے یہ مقدمہ پھر دربار شاہی میں پیش ہوا۔ اس بار انداز قلندر کچھ اور قسم کا تھا۔ "تمہاری ضمانت کی تمہاری نظروں سے کیا حیثیت تھی۔" فقیر نے صرف ایک سوال کیا۔ دربار جہانگیری سے تحقیق کا حکم صادر ہوا تو چندو مل مجرم ثابت ہوا۔ جہانگیر آتش زیرپا ہو گیا۔ ایک طرف قہر درویش دوسری طرف چندو مل کی مکاری۔ جہانگیر بھرے دربار میں گرجنے لگا چندو مل کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد ضبط کی جاتی ہے" شاہی اعلان فضا میں گونجنے لگا۔

اس کی جاگیر ہرگوبند کی دی گئی اور اس کے بعد فیصلے کا آخری حصہ تاریخ میں محفوظ ہے کسی کو انکار کی جرات نہیں۔ "چندو مل مجرم کو ہرگوبند کے حوالے کیا جائے وہ جو سلوک چاہے اس ناہنجار سے کرے" اس طرح گورو ہرگوبند کی اشک شوئی کی گئی۔ انہوں نے اپنے باپ کے "قاتل" کو قتل کر کے اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کیا۔

جلال الدین محمد اکبر کو تخت نشین ہوئے انیسواں برس تھا جب بالا پیر لاہور تشریف لائے۔ استقبال کو مساجد کے دروازے کھلے تھے اور یہی درویش بے ریا کی پسندیدہ قیام گاہیں تھیں۔ لاہور کی مختلف مساجد میں قیام پذیر ہوئے۔ عوام کچھ عرصہ اس حقیقت سے بے خبر رہے کہ کس مقام و مرتبے کی شخصیت وارد شہر ہو چکی ہے۔ بے شک موصوف اس زمانے میں ایسے مقام پر فائز ہو چکے تھے جہاں ایک سجدہ سارے شہر کو عذاب الٰہی سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ دنیا کی لاعلمی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ حضرت اخفائے راز کی جی جان سے کوشش اس لئے بھی فرماتے کہ علوم ظاہری کا اکتساب مقصود تھا۔ یہ بات واقعی حیران کن ہے کہ حضرت میاں میرؒ بحر حقیقت میں غوطہ زن پہلے ہوئے اور علوم ظاہری کا حصول بعد میں ہوا۔

لاہور میں مولانا سعد اللہ کی درسگاہ مینار نور کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی جگہ سے شاہ حسین نے بھی فیض حاصل کیا۔ مگر وہ راہ دگر کے مسافر بنے...... محمد میر بڑی سختی سے شریعت کی پابندی کرنے والے تھے پابند صوم و صلوٰۃ' زاہد شب زندہ دار۔ تھوڑے ہی عرصے بعد "علوم معقول" میں مہارت تامہ حاصل ہوئی۔ مولانا سعد اللہ کے علاوہ ان کے شاگرد رشید مولانا نعمت اللہ لاہوری سے بھی فیض حاصل کیا۔ بعد میں مولانا موصوف اظہار حیرت کیا کرتے تھے۔ "میاجیئو نے ایک عرصہ تک ہمارے درس میں شرکت کی ہم نے سب کچھ ان کو تعلیم کر دیا مگر اس تمام عرصے کے دوران ان کے مقام سے بے خبر رہے۔"

مولانا سعد اللہ لاہوری کی درسگاہ (جب حضرت میاں میرؒ نے اس میں شرکت فرمائی)

علاقہ نخاص (محلہ داراشکوہ لنڈا بازار) میں تھی۔ مولانا موصوف "منتخب التواریخ" کے مطابق مقام ولایت پر فائز تھے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے والد بزرگوار عالم **متجو** مولانا فتح اللہ دانشمند سے حاصل کی مگر سند فضیلت' دیپالپور کی مشہور زمانہ درسگاہ بایزید سے ملی۔ اسی دوران شیخ اسحاق کاکوؒ کے دست حق پرست پر بیعت کر چکے تھے جو حضرت شاہ کاکو چشتیؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ مولانا موصوف پر بعض اوقات درس دیتے دیتے حالت استغراق طاری ہوجاتی اس کیفیت میں دنیا و مافیہا سے بیگانے ہوجاتے دو دو تین تین روز تک تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ خورد و نوش کیا' نمازیں تک فوت ہوجاتیں۔ حالت "صحو" میں آتے تو خدام سے پوچھ کر قضا نمازیں ادا کی جاتیں۔ اکبر نے دین الٰہی کی تائید حاصل کرنے کے لئے رنگین جال پھینکا مگر سچائی کی خوشبو کو کون زیر دام لا سکتا ہے

ہوا کی مست خرامی تہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم

مولانا اس آزمائش میں ثابت قدم رہے اور بادشاہ کو لاجواب کر کے لوٹے۔ اکبر بے اختیار پکار اٹھا اس مرد حق سے سلف الصالحین کی مہک آتی ہے"

امام غزالیؒ کی شہرہ آفاق تصنیف "جواہر القرآن" کی شرح لکھنے کا اعزاز بھی آپ ہی کو حاصل ہے۔ لاہور کی ایک اور شخصیت جن کے آگے محمد میر نے زانوئے تلمذ تہ کیا وہ مولانا عبدالسلام لاہوری ہیں۔ عظیم الشان درسگاہ "وراثت" میں ملی اور مولانا موصوف نے وراثت کا حق ادا کردیا۔ لشکر اکبری میں مفتی تعینات تھے۔ اس عہدہ جلیلہ کو خیرباد کہہ کر درس و تدریس کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہوئے۔ مسجد مفتیاں اندرون موچی دروازہ حویلی میاں خاں کے خطیب بھی تھے پورے پچاس برس علم کی روشنی تقسیم کرتے رہے۔ اکبر کے دین الٰہی پر ضرب کاری مارنے والوں میں مولانا پیش پیش تھے۔ رعب و جلال کا یہ عالم کہ کسی ابلیسی قوت کو ٹکرانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ زندگی بھر علم دین ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے رہے توشۂ آخرت بھی یہی روشنی تھی۔

لاہور میں درویش نے مستقل قیام کے لئے محلہ باغ باناں کا انتخاب کیا جو بعد میں خانی پورہ (محلہ خانی جہاں اب انار کلی بازار ہے) پورہ کہلایا اور زندگی کے آخری لمحات تک اسی جگہ قیام پذیر رہے۔ اسی حجرے میں کم و بیش ساٹھ برس تک احباب و اصحاب رونق افروز

ہوتے رہے' مقدس محافل کا انعقاد ہوا اور اسی جگہ شاہان وقت دست بستہ حاضری دیتے رہے۔ نورالدین جہانگیر' شہاب الدین شہزادہ داراشکوہ نواب وزیر خاں کیسے کیسے صاحبان جلال و جمال ناصیہ فرسائی کا اعزاز حاصل کرتے رہے۔ کتب قدیم کی ورق گردانی شاہد ہے کہ یہ حجرہ دو منزلہ تھا جس کا بالاخانہ بھی تھا۔ اس حجرے کا موجودہ محل وقوع' ہر اہل دل کو سپرد اضطراب کردیتا ہے۔ خصوصاً اس کی "کیفیت" بڑی ہی دکھ دینے والی ہے۔ عجائبات دنیا' شاہی محلات وغیرہا کے نام و نشان مٹ جائیں تو اداسی کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر آفتاب عالم تاب جیسا آستانہ درویش جہاں سے دولت اطمینان تقسیم ہوتی رہی' اس کی ویرانی دیکھنے کے لئے پتھر کا دل اور فولاد کا جگر درکار ہوتا ہے۔ راقم جب اس حجرے کی تلاش میں نکلا جہاں شاہ گدا' دین و دنیا سنوارنے حاضر ہوا کرتے تھے تو اس کے "آثار" دیکھ کر غم و اندوہ کی اتھا گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ جو کچھ ان گناہ گار آنکھوں نے دیکھا من و عن پیش خدمت ہے۔

بازار نئی انارکلی کے آغاز سے پہلے' پرانی انارکلی کی جانب' بائبل سوسائٹی کے متصل فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں اور رسائل کی دکانیں ہیں۔ آخری دکان سے دو قدم کے فاصلے پر جوتوں کی دکان "ڈلہوزی شوز" کے نام سے مرکز نگاہ بنتی ہے اوپر کسی گمنام ہستی کی رہائش ہے۔ ڈلہوزی شوز اور سنی شوز کے درمیان والا سارا علاقہ کسی زمانے میں آستانہ حضرت میاں میرؒ بالا پیر ہوا کرتا تھا۔ جوتوں کی ان دو دکانوں کے درمیان بھی "پاپوش فروشی" کے مراکز ہیں یعنی ونر شوز' یونی شوز' ریلے شوز اور جولی شوز اور ان دکانوں کے اوپر' زیب و زینت سے مبرا' ننگی اینٹوں والا "بالاخانہ" خاموشی سے کھڑا محو نوحہ خوانی ہے۔ ان دکانوں کے عقب میں غیر مسلم خاندان آباد ہیں۔ سلیم مسیح اپنی تیسری پشت سے رہائش پذیر ہے۔ اس کے پردادا کا لگایا ہوا بڑ کا چھتناور درخت ان کوارٹروں پر سایہ فگن ہے۔ کچھ سایہ ڈائریکٹر ایجوکیشن کے دفتر پر بھی پڑتا ہے جو ایک عرصے سے سرخ اینٹوں والی عمارت میں قائم کیا ہے۔ شجر سایہ دار' بلاامتیاز مذہب و ملت ہر شخص کو راحت فراہم کر رہا ہے' بالکل اسی انداز میں جیسے "بالا پیر" فراہم کیا کرتے تھے۔

ان پاپوش فروشوں کے ہاں خریداروں کا ہجوم ایک عام سی بات ہے۔ عین ممکن ہے جس جگہ کوئی خریدار تشریف فرما ہو' وہاں کسی زمانے میں شہنشاہ جہانگیر' شاہ جہان یا دارا شکوہ دربار قلندر میں کھڑا رہ چکا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ پر بیٹھ کر حضرت میاں میرؒ

ارشادات عالیہ سے نواز چکے ہوں۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔ یہ بات البتہ ذہن میں رہے کہ اسی حجرے میں آپ کا وصال ہوا اور جنازہ بھی اسی مقام سے اٹھا۔ خلق خدا کا ہجوم اس دور میں بھی ہوا کرتا تھا آج بھی اس جگہ خلق خدا کا ہجوم ہوتا ہے مگر ہجوم' ہجوم میں فرق ضرور ہے' صرف اہل بصیرت کے لئے

جس زمانے میں بالا پیر لاہور میں قیام پذیر تھے مغل شہنشاہ اکبر بھی تیرہ چودہ برس لاہور میں رہا۔ دین الٰہی کے خلاف مشائخ لاہور نے بھرپور کردار ادا کیا۔ بالا پیر ان میں پیش پیش تھے۔ اس مخالفت کی پاداش میں لاہوری علماء کو ملک بدر بھی کیا گیا۔ کئی ایک زیر عتاب آکر پابند سلاسل ہوئے مگر بالا پیر اور ان کے ہم نواؤں کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل شہنشاہ کے زیر تسلط ہندوستان کے بائیس صوبوں میں اس دین کو اختیار کرنے والوں کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز نہ کر سکی۔ ان میں ایک سو آٹھ درباری تھے اور باقی اکبر کے دوست' احباب جو مروت میں مارے گئے یا سیم و زر کی چمک سے اندھے ہو گئے۔

1605ء میں جلال الدین اکبر اپنے تمام تر تزک و احتشام اور دینی الٰہی کے ساتھ پیوند خاک ہوا اور نور الدین جہانگیر کے عہد کا آغاز ہوا۔ جہانگیر' صوفیا و مشائخ کے خلاف بغض و عناد رکھنے میں اپنے پیش رو سے دو قدم آگے تھا۔ ان کے درپے آزار رہنا اور حیلے' بہانے سے گزند پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ امام ربانی مجدد الف ثانی کو قلعہ گوالیار میں قید کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی' مرزا حسام الدین مرید مجدد الف ثانی کی ملک بدری کے احکام جاری کئے۔ حضرت میاں میرؒ کی شہرت جہانگیر تک پہنچی تو خلاف عادت و دستور ملاقات کا تمنائی ہوا۔ اکبر آباد (آگرہ) سے بطور خاص خدمت درویش میں ایک ایلچی روانہ کیا۔ خط کی عبارت بھی مزاج جہانگیر کے برعکس مؤدبانہ و فدویانہ تھی۔

"حضور والہ! قیام لاہور کے دوران اگر آپ کا اسم گرامی سن پاتا تو ضرور حاضر خدمت ہوتا اب چونکہ لاہور سے آگرہ آچکا ہوں اور فی الحال سفر لاہور ممکن نہیں' آپ کی نوازش ہوگی اگر یہاں تشریف لا کر ممنون فرمائیں۔"

درویش نے دعوت جہانگیر قبول فرمالی۔ عام نقادوں اور قلم کاروں کا یہی خیال ہے کہ درویش نے یہ دعوت' حضور اکرمؐ کی حدیث مبارکہ کی روشنی میں قبول کی یعنی جو دعوت دے

اسے مایوس مت کرو" لیکن بنظر غور دیکھا جائے تو اس دعوت کو شرف قبولیت بخشنے کی ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ تھی جلال بادشاہی کے کس بل نکالنا۔ جہانگیر کا رویہ حضرت میاں میرؒ کے سامنے تھا۔ ملاقات کے دوران جو کچھ پیش آیا وہ ہمارے خیال کی تائید کا بین ثبوت ہے۔ حاکم وقت نے عزت واحترام سے استقبال کیا دوران گفتگو حضرت میاں میرؒ نے اپنے منفرد دلکش انداز میں پند و نصائح سے نوازا۔ شہنشاہ کے جلال کی فلک بوس عمارت مختصر سے وقت میں مسمار ہو گئی۔

"جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کی مصاحبت اختیار کرلوں اور بقیہ عمر آپ کے زیر سایہ' یاد الٰہی میں گزار دوں" جہانگیر اپنی سابقہ زندگی پر حبت سا ہو گیا۔

"سچے درویش کی نگاہ میں سیم و زر اور سنگ و خشت میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا" حضرت نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "اب چونکہ تم مال و متاع دنیا کو ترک کردینے پر تیار ہو تو گویا تمہاری نظروں میں اس سرو سامانی کی حقیقت' سنگ و خشت کے برابر ہے لہٰذا تم درویش ہو۔ درویش کامل کی پہلی شرط پر پورے جو اتر رہے ہو۔"

"اب آپ دلائل دے کر مجھ گناہ گار سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں" جہانگیر نے اداس لہجے میں کہا۔ "تمہیں رعایا کی پاسبانی اور خلق خدا کی حفاظت کا فرض سونپا گیا ہے' تمہارے عدل و انصاف کے نتیجے میں' درویش' قلندر اور زہاد پوری یکسوئی سے اپنے وظائف میں مشغول رہتے ہیں یہی تمہاری فقیری اور یہی درویشی ہے لہٰذا اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہو اور راہ سلوک کا خیال دل سے نکال دو۔"

"حضور! پھر بھی آپ توجہ تو فرمائیں" بادشاہ اس نگاہ کا طلبگار تھا جو کایا پلٹ کے رکھ دیتی ہے حضرت نے بڑی رسان سے دیکھا۔

"ٹھیک ہے، تم اپنے جیسا کوئی اور خلق خدا کا محافظ فراہم کر دو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہوں" حضرت نے شرط عائد کر دی۔ بادشاہ لاجواب ہو گیا۔ اور سر جھکا کر سوچنے لگا "شاید خوش نصیبی میرے در پر دستک دیتے دیتے رہ گئی" اس نے زیر لب کہا اور نگاہ اٹھا کر بڑے عجیب انداز میں فقیر کو دیکھا۔

"میری دلی تمنا ہے کہ آپ کسی خواہش کا اظہار فرمائیں اور میں اسے پورا کروں" بادشاہ اپنے مزاج مطابق لب کشا ہوا۔

"جو کچھ طلب کروں گا وہ دلی رغبت سے دو گے؟" درویش نے اپنے مزاج کے مطابق کہا۔

"آپ حکم کر کے تو دیکھیں، اپنی بساط سے بڑھ کر پیش نہ کروں تو کہئے گا"

"مجھے صرف جانے کی اجازت دے دو"

فقیر کے ایک ہی وار سے شہنشاہ وقت چاروں شانے چت ہو گیا، لیکن حسب وعدہ آپ کو عزت و احترام سے رخصت کرنے پر وہ مجبور تھا۔ جہانگیر نے دو خطوط حضرت میاں میر کی خدمت میں ارسال کئے، دونوں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں ایک ملاقات سے پیشتر اور ایک بعد میں پہلے خط کے الفاظ من و عن پیش خدمت ہو۔

ترجمہ "بندہ مخلص اسلام و نیاز کے بعد اپنا خلوص پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے اور تمنائی ہے کہ آپ کی ملاقات نصیب ہو"

"نوشتہ جہانگیر اکبر بادشاہ حضرت پیر دستگیر شیخ میرؒ کے نام"

دوسرا خط درجہ بالا ملاقات کے بعد جہانگیر نے اس وقت لکھا جب والی ایران نے قندھار پر حملے کا ارادہ کیا یا حملہ کر دیا۔ خط کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"حضرت پیر دستگیر کی خدمت عالیہ میں، بارگاہ الٰہی کے نیاز مند جہانگیر کی طرف سے سلام نیاز کے بعد عرض ہے کہ گاہے بگاہے بندے کو اپنے دعاؤں میں یاد فرما لیا کریں۔ ایک اور گزارش ہے کہ بندگان خدا کو ظالم کے ہاتھوں سے نجات دلا دیں امید کامل ہے کہ بد عہد شخص قہر الٰہی کا سزاوار ہو گا۔ آمین"

اس خط کا سیاسی پس منظر زیر بحث لانا موضوع سے ناانصافی والی بات ہے کیوں کہ اس کا "داستان میرؒ" سے کوئی تعلق نہیں۔ توزک جہانگیری میں البتہ جس انداز میں جہانگیر نے آپ

کو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے......

جہانگیر نے سفر آخرت اختیار کیا تو 1628ء میں شاہ جہان تخت ہند پر جلوہ افروز ہوا۔ حضرت میاں میر عہد شاہ جہان میں سات برس تک بقید حیات رہے۔ اس دوران کم از کم دو یا تین مرتبہ شہنشاہ ہند' زیارت درویش سے فیض یاب ہوا۔ اور ہر ملاقات کے وقت دارا شکوہ ساتھ تھا۔ رموز و نیاز کی باتیں جو دین و دنیا کے بادشاہوں کے درمیان ہوئیں' لطافت کلام اور پند و نصائح کا دلنواز مرقع تھیں۔ شاہ دنیا کے کان ایسی رسیلی گفتگو سے نا آشنا تھے۔ شہاب الدین کو محسوس ہوا جیسے پاگلوں کے شور کی جگہ کانوں میں الوہی نغمات کا رس ٹپکایا جا رہا ہو۔

بادشاہ چار افراد کے ہمراہ حجرہ درویش میں داخل ہوا۔ درویش نے آنے والوں کا زیر لب مسکراہٹ سے استقبال کیا۔ آنے والے مودب اور لب بستہ کھڑے ہو گئے۔ در و دیوار سے ایسا ہی جلال ٹپک رہا تھا۔ جبین ناز پر مسکراہٹ رقصاں ہوئی تو زائرین کو حوصلہ ہوا گویا حضوری کو شرف قبولیت بخشا گیا۔

"خلق خدا کی خوشحالی' مملکت اور رعایا کی پاسبانی' عادل بادشاہ کا طرہ امتیاز ہونا چاہیے" درویش نے گفتگو کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔ "گڈریا اگر ریوڑ کی حفاظت نہ کر سکے تو اسے اپنے مقام سے از خود دست بردار ہو جانا چاہیے۔ گڈریئے کی نگاہ اگر بھیڑ اور بھیڑیئے میں امتیاز نہ کر سکے تو وہ کور نظر کہلائے گا" رعیت کی خوشحالی حاکم وقت کے اپنے مفاد میں ہوتی ہے۔ اس سے لشکر آسودہ حال اور خزانہ معمور ہوتا ہے اور جہانداری کے لئے یہ دو وسیلے بے حد ضروری ہوتے ہیں"

شاہ اور اس کے حواریوں کو بیٹھنے کا اذان حاصل ہوا۔ وہی فرش زمین جہاں درویش تشریف فرما تھا' لباس فاخرہ زیب تن کئے ہوئے حاضرین اسی جگہ مودب بیٹھ گئے۔ بعد میں شاہ جہان کے دل کی بات ہونٹوں تک آ ہی گئی۔ ترک و تجرید' بے نیازی اور دانش مندی کا دلنواز خلاصہ حضرت میاں میر ولیؒ وقت سے بڑھ کر میری نظروں سے نہیں گذرا" یہی اس نے حجرے سے نکل کر کہا ایک بار دارا شکوہ سخت علیل ہو گیا کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا تھا سب کوششیں رائیگاں ہوئیں تو شاہجہان اپنے لخت جگر کو لے کر آستانہ فقیر پر حاضر ہوا اور شہزادے کو درویش کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ دل و جان سے آپ کا معتقد ہے آپ کی توجہ ہی اس کے دکھوں کا مداوا ہو گی' اس سے زیادہ بندہ ناچیز کیا عرض کرے"

"یہ عقیدت مند تو ہمیں بھی دل و جان سے عزیز ہے" حضرت نے شہزادے کے زرد چہرے پر نگہہ التفات ڈالی۔ "کوزہ گر کر کاریگری کا کمال ہے مٹی ذرا روگی ہو چکی ہے' خیر علاج بھی مٹی ہی سے ہونا چاہئے" پھر اپنے زیر استعمال مٹی کا پیالہ آب خنک سے لبالب بھر کر شہزادے کو پیش کیا۔ "عزیزم! فصیل جاں میں درد لادوا مت پالا کرو' جرعہ جرعہ یہ پیالی پی جاؤ اور قادر مطلق کا شکر بجا لاؤ"

شہزادے کو آب سادہ پینے سے پہلے ہی اپنی صحت مندی کا یقین آ گیا' بقیہ کارروائی رسمی سی تھی۔ اس پانی نے وہ کام کیا جو حکماء کے تیر بہ ہدف نسخے اور مروارید و جواہر ملی دوائیں نہ کر سکیں۔ یہ سادہ پانی کب تھا فقیر کی دعا بھی تو اسمیں شامل تھی۔ شہزادہ رو بصحت ہوا اور تا عمر اسی آستانے کا غلام بن گیا۔

9 اپریل 1634ء والے دن ایک بار پھر شاہجہان کو لذت ملاقات آستانہ درویش تک کھینچ لائی۔ یہ ملاقات نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھی بے تکلفی کی جانب پیش رفت ہو چکی تھی فقیر بھی پہلے سے زیادہ مائل بہ کرم تھا۔

"حضور! دعا فرمائیں' مکروہات زمانہ کو تج کر آپ کے نقش قدم پر روانہ ہو جاؤ" بادشاہ ترک دنیا کی باتیں کرنے لگا۔

"جب آپ ملت اسلامیہ کے مفاد میں کوئی کام کریں تو اس گھڑی تقرب الٰہی میں لاثانی ہوں گے اور وہی قبولیت کے لمحات ہوں گے۔ اس گھڑی خود دست دعا بلند کریں۔ اس کے سوا اور کوئی شے طلب نہ کریں انشاء اللہ دعا قبول ہو گی" درویش نے طریقہ کار کی وضاحت فرما دی مگر چشم بصیرت اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ شہنشاہ جذبات کی رو میں ان خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔ آپ نے زیر لب مسکرا کر یہ شعر پڑھا۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

(ہم خدا اور دنیا کو بیک وقت طلب کرتے ہیں۔ یہ خیال خام دشوار ہے' حد جنوں تک) اسی ملاقات میں شاہجہان نے خدمت فقیر میں ایک قیمتی دستار اور تسبیح پیش کی۔ دستار تو حضرت نے معذرت کے ساتھ واپس کر دی' تسبیح کو البتہ شرف قبولیت بخشا وہی تسبیح بعد میں دارا شکوہ کو عطا کر دی گئی۔ یہ ملاقات اس بالا خانے میں ہوئی جس کا تذکرہ' پچھلے صفحات میں کیا جا چکا

ہے اس ملاقات میں ایک اور واقعہ پیش آیا تھا جو شہزادے کی عقیدت کا منہ بولتا ثبوت بن گیا۔

ملاقاتی جب بالا خانے کی طرف چلے تو دارا شکوہ جوتے اتار کر برہنہ پا ہو گیا۔ بادشاہ سے ملاقات کے دوران حضرت میاں میرؒ لونگ چبا چبا کر پھینکتے جاتے تھے۔ شاہ جہان اور دوسرے زائرین کی طبع نازک پر یہ بات ناگوار سی گزری مگر دارا شکوہ اس "پھوگ" کو احترام کے ساتھ اکٹھا کر کے کھاتا جاتا تھا۔ اس طرح لونگ کا پھوگ نوش جاں کرنے کا شرف خواجہ بہاری اور میاں محمد مراد قادری کو بھی حاصل ہوا۔

بادشاہ نے تقرب درویش کی خاطر آگرہ، منتقل ہو جانے کی درخواست بھی پیش کی مگر فقیر کو مدینتہ الاولیا سے جدائی گوارا نہ تھی۔

حکیم الالت علامہ اقبالؒ نے بھی "اسرار خودی" میں شاہجہان کی بالا پیر سے ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کی مہمات درپیش ہوئیں تو حاکم وقت، فتح و نصرت کی دعا کے لئے آستانہ فقیر پر حاضر ہوا۔ بادشاہ حرف مدعا زبان پر لایا تو حضرت خاموش رہے، اتنے میں ایک مفلس و قلاش حاضر خدمت ہوا۔ آستانہ، بلا امتیاز شاہ و گدا، مرجع خلائق تھا ہر شخص ہر پل حاضر ہو سکتا تھا۔

"حضور! یہ میری رزق حلال کی کمائی ہے، قبول فرمائیے" مفلوک الحال شخص نے چاندی کا ایک سکہ بطور نذرانہ پیش کیا۔

"آپ کے خیال میں کیا میں اس کا مستحق ہوں؟" فقیر بے ریا نے بڑی رسان سے کہا "عزیزم! اس رزاق نے مجھے مال و زر کی حاجت سے بے نیاز کر رکھا ہے البتہ یہ سکہ تم اس بادشاہ کی نذر کر سکتے ہو آج کل یہ بہت زیادہ حاجت مند ہے۔ سارے ہندوستان کے خزانے اس کی ملکیت میں ہیں "ہوس زر" پوری ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی اب گولکنڈہ اور بیجاپور میں کشت و خون کا بازار گرم کرنے والا ہے۔ کاندھوں سے کٹ کٹ کر سر گریں گے، خلق خدا اس کی ہوس پر قربان ہو گی"

شاہجہان دعائے فتح و نصرت کے لئے آیا تھا۔ اپنا سا منہ لے کر چل دیا۔ حضرت میاں میرؒ کی شاہان مغلیہ سے ملاقاتوں کا مفصل حال اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ آج یہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ شاید ہم سب اپنے گریبانوں میں ایک پل جھانک سکیں اور برے بھلے میں تمیز

کے قابل ہو جائیں۔

شاہ میر بالا پیرؒ کو لاہور میں قیام پذیر ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ مولانا سعد اللہ اور عبدالسلام لاہوری کی درس گاہوں سے اسناد فضیلت حاصل کرنے کے بعد فیض عام جاری ہو چکا تھا۔ اطراف و اکناف میں آپ کے زہد و تقویٰ کی دھوم مچ چکی تھی۔ آسمان تصوف کے کیسے کیسے درخشندہ ستارے، مہتاب تاباں کے گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ حاجی نعمت اللہ قادری سرہندی، ملا ابراہیم روحی، سید اشرف، میاں ننھا المعروف بہ **ننھے** شاہ، حضرت بہار لنگ، شیخ احمد سنامیؒ، ملا شاہ بدخشانیؒ ایک طویل فہرست ہے جو کئی اقساط کا تقاضا کرتی ہے۔

حضرت اپنے احباب کے ساتھ لاہور شہر کے نواح میں کسی سرسبز و شاداب مقام پر نکل جاتے، سب حضرات اپنی اپنی پسند کا گوشہ تنہائی منتخب کرتے اور خالق کائنات سے محو راز و نیاز ہو جاتے۔ نماز کا وقت ہوتا تو تمام حضرات یکجا ہو کر نماز باجماعت ادا کرتے پھر غروب آفتاب تک اپنے اپنے کنج تنہائی میں جا بیٹھتے۔ یہی درویشوں کا معمول تھا۔ شب و روز اسی طرح گذر رہے تھے کہ ایک روز دل بے تاب سپرد اضطراب ہو گیا۔ آپ نے فوراً" قرآنی آیت "**سیرو فی الارض**" پر عمل پیرا ہونے کا ارادہ کر لیا اور سرہند شریف کی طرف کوچ کر گئے...... اس سفر کے اختیار کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ سرزمین لاہور میں خلق خدا اُمڈی چلی آتی تھی۔ انتہا یہ ہوئی کہ آپ کی عبادت و ریاضت میں خلل واقع ہونے لگا۔ آپ نے یہی مناسب خیال فرمایا کہ کچھ عرصے کے لئے مقام دگر پر توجہ مبذول کی جائے۔

سرہند پہنچے تو گھٹنوں میں شدید درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ٹانگوں نے فصیل جاں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔ چند روز بعد دوسرے عوارض نے بھی آ گھیرا۔ یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی دوست احباب کے جھرمٹ تھے نہ وہ رونقیں۔ مصیبت کا احوال، مونس و غم خواروں سے کہنا، ناگوارا خاطر تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ طہارت تک کرنا ممکن نہ رہا۔ حاجی نعمت اللہ سرہندی کو کسمپرسی کی خبر ہوئی تو پروانہ وار بھاگا چلا آیا یہ مرید باصفا خلوص کا پتلا تھا۔ تن من سے خدمت گزاری میں مصروف ہو گیا اور ایسی خدمت بجا لایا کہ غلامی کا حق ادا کر دیا۔ بول و براز تک کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتا۔

"نعمت اللہ، تو واقعی رب العزت کی عطا کردہ نعمت بلکہ نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا ہے" درویش نے ایک روز دلی جذبات کا اظہار کیا "ایسی خدمت تو عزیز و اقربا بھی بجا نہیں لاتے"

“حضور! وہ رشتے دار ہوتے ہیں غلام نہیں‘ جب طوق غلامی پہن کر اعلان اسیری کر دیا تو باقی کیا رہا؟” حاجی صاحب نے لاجواب‘ جواب دیا

ایک روز جب شاہ میرؒ کی طبیعت حد سے زیادہ ناساز ہو گی تو حاجی نعمت نے کہا “حضور! ناگوار خاطر نہ ہو تو کچھ عرض کروں”

“حقیقی غم گساروں کو مدعا بیان کرنے کے لئے نہ اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ان کی کوئی بات ناگوارا گزرتی ہے”

“آپ اپنی صحت کے لئے دست دعا بلند کیوں نہیں فرماتے؟”

“نعمت اللہ‘ میرے عزیز! ہمیں دوست سے حیا آتی ہے۔ برسوں صحت مند رہے‘ اب چند روز ابتلا کے آئے ہیں تو حرف شکایت زبان پر لانا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔”

“حضور! شکایت کیسی؟ آپ “ضد” کریں رب العزت‘ ضرور آپ کے ناز اٹھائیں گے”

“حاجی صاحب! آپ تو بڑے دانش مند ہوتے جا رہے ہیں” میاں جیو نے مسکرا کر کہا۔

“حضور! گل کی قربت سے گل بھی مہک اٹھتی ہے بندہ ناچیز تو پھر بھی حیوان ناطق ہے”

اس رات حضرت شاہ میرؒ نے اپنی صحت یابی کے لئے دعا فرمائی۔ دعا ایسی قبول ہوئی کہ آپکو اپنی علالت پہ رشک آنے لگا۔ غوث الثقلین اور خضر علیہ بیمار پرسی کو تشریف لائے۔ پھر شم عبد القادر جیلانیؒ نے اپنا دست مبارک آپ کے جسم پر پھیرا اور مشروب خوش ذائقہ سے لبالب بھرا پیالہ عطا فرمایا “فرزند! اسے پی لو‘ ساری بیماریاں رخصت ہو جائیں گی”

مشروب کا حلق سے اترنا تھا کہ آپ گویا ہوا کے دوش پر اڑنے لگے۔ “کیفیت” کے گزرتے ہی بیماری کا نام و نشان تک نہ رہا۔ صبح حاجی نعمت اللہ بھی حیران رہ گئے۔

“عزیزم! ہمارے پاس دنیاوی سروسامان تو نہیں ہے کہ تم کو عطا کر دیں” بالا پیر اپنے مرید باصفا سے مخاطب ہوئے “جس انداز سے نے ہماری خدمت کی ہے اس کا تقاضا ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے اس میں تمہیں بھی شریک کر لیا جائے”

“پیرو مرشد! دنیاوی سامان بھی کوئی اترانے والی چیز ہے؟ جو کچھ آپ کی ملکیت میں ہے‘ اس کا تو ایک ذرہ بھی ہفت اقلیم کی دولت سے بڑھ کر ہے”

اس طرح حضرت میاں میر نے حاجی نعمت اللہ کو اپنی خاص توجہ سے نوازا اور چند روز میں ذرے کو آفتاب بنا دیا۔ یہ بالا پیر کا پہلا باقاعدہ مرید تھا۔

حاجی صاحب پہلے بھی لاہور میں قیام کر چکے تھے مگر گوشہ گمنامی میں رہے مگر اس بار لاہور آئے تو کچھ اور ہی عالم تھا۔ آپ سے پہلے آپ کی شہرت کوچہ و بازار میں پہنچ چکی تھی۔ اسی دوران حاجی موصوف پر عالم ملکوت منکشف ہوا۔ جو چیز بہ آسانی میسر آ جائے نگاہ میں اس کی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ حاجی صاحب نے ایک درویش کو شریک راز کیا اور یہ تک کہہ دیا "مجھ پر ایک ایسے عالم کا انکشاف ہوتا ہے جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ نفرت سے ہونے لگی ہے"

"جو کیفیت آپ نے بیان کی ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم ملکوت نہیں بلکہ عالم جنات ہے یہ تو بڑی نقصان دہ چیز ہے" شریک راز درویش نے اپنی دانش مطابق تبصرہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی صاحب کا اعتقاد ہی اٹھ گیا۔ مرشد کا تعلیم کیا ہوا عمل بھی ترک کر دیا ساری لذت جاتی رہی دل سپرد اضطراب ہوا آخر حج بیت اللہ کے ارادے سے آستانہ مرشد پر حاضر ہوئے اور اجازت طلب کی۔

"حاجی صاحب خیریت باشد؟" حضرت میاں میر نے پہلی نظر میں "خرابی" کو پہچان لیا مگر اظہار سے گریز فرمایا۔ حاجی صاحب نے ساری کیفیت بیان کی تو شاہ میر زیر لب مسکرانے لگے۔

"حضرت! مجاہدے کے بغیر حاصل شدہ چیز کی کون قدر کرتا ہے" میاں میر اب کشا ہوئے "وہ عالم ملکوت ہی تھا آپ کو ورغلایا گیا ہے"

"پیرو مرشد! اب تو اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہو جائے"۔

"اگر آپ کو اسی جگہ حج کرا دیا جائے تو کیسا رہے؟"

"حضور! پھر تو بس مزہ ہی آ جائے" حاجی صاحب نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو آج شب یہ "اسم" پڑھنا۔ حضرت میاں میر نے جگہ مقام کا تعین بھی فرما دیا۔ دوسرے روز حاجی صاحب دیوانہ وار مرشد کے قدموں سے لپٹ گئے۔

"عزیزم' حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی؟"

"پیرو مرشد ایک ایک منزل طے ہوئی' سارے مناسک ادا کئے"۔

مشائخ فرماتے ہیں "مرید کے لئے اکیلا رہنا' آفت میں مبتلا ہونے والی بات ہے"۔

حضرت میاں میر عام سا لباس زیب تن فرماتے۔ خرقہ و گودڑی وغیرہ کو عمر بھر ہاتھ تک نہیں لگایا۔ گنبد سر کی زینت' کم قیمت کپڑے کی دستار' موٹے کپڑے کا کرتہ اور اسی قبیل کا

تہبند باندھ لیتے۔ سرسری نظر سے درویش کے مقام و مرتبے کو پہچاننا تقریباً" ناممکن تھا۔ یہی ان کا مقصد ہوا کرتا تھا "فقیری کی تشہیر کرنے والا فقیر نہیں بہروپیا ہوتا ہے" حضرت میاں میر اکثر فرماتے۔ گودڑی کو "پابند رسوم" حضرات کا لباس قرار دیا۔ طاقیہ اور خرقہ سے بھی اجتناب فرمایا "اگر اندر روشن ہو تو ہر "قبا" ہی "عبا" ہے ورنہ گودڑی بدبختی کی نشانی ہے"۔ یہ خیالات حضرت علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش کے ہیں۔

حضرت میاں میر کے احباب میں سے "حاجی محمد" بڑا بے تکلف لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا "مرشد کی توجہ سے جب میں صاحب حال ہو گیا تو گودڑی پہن لی جو وقت کے ساتھ بوسیدہ ہو گئی۔ ایک روز سربازار میں تماشہ بن گیا۔ لوگوں کا ہجوم میرے گردوپیش تھا کہ اچانک حضرت میاں میر تشریف لے آئے"۔

"یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے؟" شاہ میر نے مجھے ناپسندیدگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"حضور! یہ میرے اختیار میں نہیں"۔ میں نے عرض کی۔

"اس پہناوے کو اتارنا تو بس میں ہے" حضرت نے سرزنش کی "سادہ لباس پہنو تاکہ خلق خدا پہچان ہی نہ سکے"۔

"بس اس روز سے میں نے گودڑی کو خیرباد کہا اور سادہ لباس پہن لیا۔

لباس کے علاوہ شاہ میر کی ہر چیز سے سادگی کا اظہار ہوتا۔ حجرے کا فرش پرانے بوریئے پر مشتمل تھا۔ فقراء کو اہل ثروت پر ہمیشہ ترجیح دی۔ ایک بار تو یہاں تک فرمایا "شیخ بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کس قسم کے فقیر تھے؟ بہتر ہوتا کہ دنیا میں دوبارہ واپس آکر مجھ سے آداب فقیری سیکھتے"۔

"فقر بہتر ہے یا غنا؟" مشائخ کی اس کے متعلق مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ **مثلاً**" ابن عطارؒ فرماتے ہیں "تونگری، مفلسی سے بہتر ہے کیونکہ یوم حشر میں دولت مند لوگ، حساب دیں گے اور بوقت احتساب، بے وسیلہ کلام ہو گا اور روبرو کلام سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے"۔

اس کے جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا "تونگروں سے حساب لیا جائے گا تو فقراء سے "عذر" کیا جائے گا (یعنی مفلسی کا جواز فراہم کیا جائے گا) اس طرح "عذر" حساب کی نسبت بدرجہا بہتر ہے"۔

بہر حال ان مشائخ کا پلہ بھاری ہے جو "فقر" کو بہتر قرار دیتے ہیں کیوں کہ آں حضرتؐ کا ارشاد ہے "میری امت کے فقراء دولت مندوں سے پانچ سو سال پہلے بہشت میں داخل ہوں گے" اس دلیل کے بعد لب کشائی کی ہرگز گنجائش نہیں رہتی۔

"تونگر، صاحب صدقہ ہوتے ہیں ایک شخص نے حضرت میاں میر سے کہا۔

"اور فقراء صاحب صدق" آپ نے لاجواب، جواب دیا۔ "صدق، صدقہ سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے"۔

یہ بات بھی مستند ہے کہ شاہ میرؒ تسبیح کو بھی دکھاوا کہا کرتے تھے چنانچہ آپ اور آپ کے احباب نے کبھی بھی ہاتھ میں تسبیح نہ لی۔ آپ نے تو شاہجہان کی پیش کی ہوئی تسبیح بھی داراشکوہ کو بخش دی تھی۔ محفل سماع کے متعلق بھی آپ کا رویہ معتدل تھا۔ راگ راگنیوں سے مکمل واقفیت تھی۔ سماع کو پسند بھی فرماتے مگر اس کا باقاعدہ اہتمام کرنا یا محو رقص ہونا، ناپسند تھا۔ البتہ محفل سماع منعقد ہوتی تو پروقار طریقے سے شرکت فرماتے۔ پر تاثیر کلام پر ریش مبارک کا ایک ایک بال کھڑا ہو جاتا اور چہرہ دہکتے شعلے کی طرح چمکنے لگتا۔

ملت اسلامیہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ وقت کے امام المحدثین تھے۔ حضرت میاں میرؒ کے مقام سے کماحقہ، شناسائی، موصوف کا طرہ امتیاز مانا جاتا ہے۔ عہد جہانگیری میں ہند کی اصل حکمرانی ملکہ ہند نور جہاں کے زیر تسلط تھی۔ اس بات سے بھی انکار کی گنجائش نہیں۔ عمر عزیز کے آخری دور میں شیخ موصوف اور ملکہ نور جہاں میں اختلاف کی گہری جھیل حائل ہو گئی یہ فکری تضاد کا شاخسانہ تھا جسے اہل ہوس نے کسی اور ہی رنگ میں جہانگیر کے گوش گزار کیا۔ جبین شاہ، شکن آلود ہوئی تو تعلقات کی فلک بوس عمارت زمین بوس ہو گئی۔ جہانگیر اس زمانے میں اپنی محبوبہ دلنواز کے ہمراہ کشمیر میں مقیم تھا۔ امام المحدثین کی ملک بدری کے احکام صادر ہو گئے۔ شیخ موصوف کے لخت جگر شیخ نور الحق بھی اس حکم کی لپیٹ میں آ گئے۔ چنانچہ حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق دہلی سے کابل روانگی ٹھہری۔ باپ بیٹا لاہور پہنچے تو آستانہ درویش پر حاضری دی۔

"شیخ صاحب اس تفکر کا سبب" حضرت شاہ میر نے اپنے عقیدت مند کو پریشان حال دیکھا تو خود بھی پریشان ہو گئے۔

"آپ تو نور محمدی سے ظلمت کدے کو روشن کرنے والے انسان ہیں۔ یہ فکر کیسی؟"

"حضور اس عالم پیری میں سفر کی صعوبت اور وہ بھی عتاب شاہی کے نتیجے میں" پھر شیخ صاحب نے داستان الم' بالا پیر کے گوش گزار کی۔ "اصل وجہ ملکہ نور جہاں سے فکری تضاد ہے" عبدالحق محدث دہلوی نے وضاحت پیش کی۔ "اب آپ ہی انصاف فرمائیں' میں مضطرب نہ ہوں تو کیا خوشی کے شادیانے بجاؤں؟"۔

شیخ موصوف کے قابل صد افتخار فرزند بھی اس محفل میں لب بستہ بیٹھے تھے۔ درویش کی جبیں پر بھی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اب یہ معاملہ شیخ و شاہ کا نہ رہا' فقیر اور شہنشاہ کا ٹکراؤ ہو گیا۔

"جورو کے اس غلام کو بھی دیکھ لیں گے" حضرت شاہ میرؒ نے زیر لب مسکرا کر کہا "شیخ صاحب! کابل جانے کی کوئی ضرورت نہیں' اسی جگہ درویش کی کوٹھڑی میں قیام فرمائیے"۔

اب گویا امام المحدثین' حضرت میاں میر کی پناہ میں تھے۔ دنیا کے بادشاہوں نے طاقت و دولت کا سہارا لے کر کیسی کیسی حماقتیں فرمائی ہیں۔ کبھی فلک بوس اہرام تعمیر کئے تاکہ مرنے کے بعد بھی سربلند رہیں' کبھی کاندھوں سے سر قلم کرائے لیکن وہ ایک بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ خلق خدا وقتی طور پر غلط فیصلہ صادر کر سکتی ہے' دوام اس فیصلے کو حاصل ہوتا ہے جو بغیر جبر و اکراہ کے صادر ہو اور وہ ہمیشہ "مبنی بر حقیقت" ہوا کرتا ہے۔ سچائی کے رخ روشن کو ہمیشہ کے لئے زیر نقاب نہیں رکھا جا سکتا اور نہ آفتاب عالم کی کرنوں کو ہتھیلیوں کی اوٹ سے تا دیر روکا جا سکتا ہے۔ شیخ موصوف اطمینان قلب کے ساتھ لاہور میں قیام پذیر رہے اور چند روز بعد اطلاع آ گئی "نور الدین جہانگیر' سلطان ابن سلطان دنیا سے کوچ کر گئے اور جسد خاکی تزک و احتشام سے لاہور لایا جا رہا ہے"۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ حکم جہانگیری کے مقابلے میں ایک حکم درویش نے بھی صادر فرما دیا ہو جس نے شاہی حکم پر خط تنسیخ کھینچ دیا اور اس کی تعمیل' بادشاہ کے بے روح خاکی جسم کو کرنا پڑی (یہ محض راقم کا قیاس ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں مگر ایسا ہوا ضرور) جب حکم دینے والا ہی چل بسا تو ملک بدر کون ہوتا۔ جہانگیر کی مشت خاک تو خود پیوند زمین ہونے لاہور تشریف لا رہی تھی۔

حضرت شاہ میر نے تو یہاں تک فرما دیا تھا "شیخ صاحب! خاطر جمع رکھیں' یہ ذمہ داری اب اس فقیر پر تقصیر کی ہے۔ بادشاہ نے آپ کو طلب فرمایا ہے مگر یہ ملاقات ناممکنات میں سے

ہے۔ آپ وطن عزیز میں اپنے اہل و عیال میں رہیں گے"۔

درویش اس سے زیادہ اور کیا کہتا یا کرتا؟ بر سبیل تذکرہ نور جہاں اور شیخ صاحب میں "**چپقلش**" کا آغاز اس طرح ہوا کہ ملکہ نے **امام المحدثین** کو اپنے حضور طلب فرمایا۔ شیخ موصوف نے جواب دیا "فقیر کا شاہوں اور خصوصاً" ان کی بیگمات سے کیا تعلق؟ کار لائقہ سے مطلع فرمائیں، اسے سر انجام دینے کی حتی المقدور کوشش کی جائے گی" یہ واقعہ **1627**ء کو پیش آیا۔ خیر جہانگیر رزق زمین ہوا تو تخت ہند تک رسائی کے لئے اس کی اولاد میں "کشمکش" کا آغاز ہو گیا۔ ہم صرف وہ واقعات زیر بحث لائیں گے جن کا تعلق داستان شاہ میر سے ہے ورنہ موضوع سے ناانصافی ہو گی۔

شہزادہ شہریار نے جو نور جہاں کا داماد بھی تھا، لاہور میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شہریار لاڈلی بیگم سے رشتہ ازدواج میں منسلک تھا جو نور جہاں کے سابقہ شوہر، **علی قلی استجلو** المعروف شیر افگن کے صلب سے تھی۔ تخت شاہی پر متمکن ہونے کے بعد اس نے اپنا ایلچی درویش کی خدمت میں بھیجا اور ملاقات کے لئے شاہ میر کو دربار میں طلب کیا۔

"میرا اس فساد سے کوئی تعلق نہیں، اپنے شاہ سے کہنا کہ فقیر کو بادشاہ سے ملاقات کی کوئی حاجت نہیں" حضرت میاں میر نے ایلچی کو واپس لوٹا دیا۔ شہریار شاید مزاج درویش سے ناآشنا تھا۔ پہلے تو وہ حیران ہوا پھر غیظ و غضب میں بھڑک اٹھا مگر حقیقی خیر خواہوں نے نااہل شہزادے کو احمقانہ اقدام سے باز رکھا۔

"درویش سے مخاصمت جناب کو تباہ و برباد کر دے گی۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں" بہی خواہوں کی بات شہزادے کی اوندھی کھوپڑی میں آ گئی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ سر کے بل چلتا دربار فقیر میں حاضر ہوتا مگر وہ دھونس دھاندلی سے درویش کی خوشنودی حاصل کرنے لگا۔

"بادشاہ کا فرمان ہے کہ اگر آپ دربار میں تشریف لانے سے معذور ہیں تو خیر و برکت کے لئے اپنی دستار مبارک ہمارے حوالے کر دیں" شاہی فرستادے نے شہریار کی احمقانہ خواہش، فقیر کے گوش گزار کی۔ حضرت میاں میر کو غصہ آ گیا۔ تاریخ انسانی میں ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے احمقامہ واقعات سے اوراق سیاہ ہیں۔ اہل دل کے زیر استعمال اشیا میں خیر و برکت والی بات سے انکار کی گنجائش نہیں مگر یہ "من مانے" کا سودا بھی تو ہے۔ اس میں سینہ زوری کا

کیا کام۔ شہزادہ شہریار رضائے درویش کے بغیر دستار فقیر کا طلب گار تھا۔ یعنی ذات کا انکار اور صفات کا اقرار یہ مخبوط الحواسی کی کتنی شاندار مثال ہے۔

حضرت میاں میر نے سر سے دستار اتاری اور عالم طیش میں فرستادے کے منہ پر دے ماری۔ کہتے ہیں دستار کا کچھ حصہ خاک آلود بھی ہو گیا "عزیزم! یہ دستار اٹھاؤ اور میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور غریب خانے پر دوبارہ تشریف نہ لانا" درویش عالم غیظ و غضب میں بھی مناسب الفاظ کا استعمال کر رہا تھا۔ ایسے میں "واہی تباہی" سے گریز، واقعی اہل دل حضرات ہی کا کام ہے۔ فرستادہ شہریار، دستار لے کر کامیاب و کامران دربار میں حاضر ہوا، نااہل شہزادے نے گویا میدان مار لیا مگر اسی غلط فہمی میں مارا گیا۔

المختصر! ملکہ ہند کے سگے بھائی آصف خاں نے، اپنے داماد شاہجہان کی خیر خواہی میں تلوار بے نیام کی۔ شہریار کو شکست ہوئی اور قلعہ لاہور میں اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہ 1628ء کے خونی واقعات ہیں۔ آصف خان نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس نے اپنے داماد کی راہ میں حائل ہونے والا ہر کانٹا جلا کر راکھ کر دیا۔ جن شہزادگان کی لاشیں دہلی روانہ ہوئیں ان میں شہزادہ شہریار، داور بخش پسر شہزادہ خسرو، شہزادہ گشتاسپ بن خسرو شہزادہ طہورث بن دانیال اور ہوشنگ بن دانیال شامل ہیں۔ آصف خاں نے گویا کام پائیدار کیا تھا۔

عقیدت و احترام کے نتیجے میں، تقرب میاں میرؒ کے اعتبار سے جو مقام شہزادہ دارا شکوہ کو حاصل ہوا وہ مغلیہ خاندان میں کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ مناقب مشائخ کی کتب میں تو دارا شکوہ کو باقاعدہ "قادری" لکھا جاتا ہے اور یہ نسبت بذات خود اس کے بلند مرتبے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

زیارت میر کے بعد جب شاہجہان حجرہ درویش سے باہر نکلا تو دارا شکوہ، تنہائی میں ملاقات کا اشتیاق لے کر دیوانہ وار حجرے میں داخل ہوا اور سر نیاز فقیر کے قدموں میں رکھ دیا..... شہزادے کا برہنہ پا آنا اور پھر یہ ادا، بالا پیر کو قائل و گھائل کر گئی۔ فقراء کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے عاجزی و انکساری ایک موثر ہتھیار ہے۔ یہ ہتھیار ہر "مقام ادب" پر کارگر ثابت ہوتا ہے درویش نے دست مبارک اس کے سر پر رکھا گویا دامن عافیت میں پناہ دے دی۔ تعلقات کی پہلی اینٹ سیدھی رکھی گئی تو عمارت کیوں نہ من پسند انداز میں استوار ہوتی۔

"عزیزم! اب اٹھ جاؤ در فقیر سے مایوس نہیں لوٹو گے۔" شاہ میر کے الفاظ داراشکوہ کے لئے ہفت اقلیم کی دولت سے کم نہ تھے۔ رفتہ رفتہ نوازشات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملا صالح، شفیع احمد اور حاجی محمد بنیانیؒ تشریف فرما تھے خود حضرت میاں میر نے فرمایا۔ "داراشکوہ ہماری خصوصی توجہ کا حقدار قرار پایا ہے، تم لوگ بھی اس کا خاص خیال رکھو۔" کرم نوازی کی انتہا ملاحظہ ہو کہ داراشکوہ کا ملازم خدمت فقیر میں حاضر ہوا تو شاہ میر نے قربت خاص سے نواز اور مسکرا کر ارشاد فرمایا۔

"اے گل بتوخ سندم تو بوئے کسے داری"

("اے پھول، تجھے دیکھ کر دل خوش ہوا کہ تو کسی کی خوشبو لئے ہوئے تھے)

ایک روز خلاف معمول حضرت نے ہاتھ میں تسبیح لے رکھی تھی۔ خواجہ بہاری جو دن رات حاضر خدمت رہتے، حیرت پر قابو نہ رکھ سکے۔

"حضور! آپ کے ہاتھ میں یہ تسبیح پہلی دفعہ نظر آ رہی ہے بات سمجھ میں آنے والی نہیں"

"یہ داراشکوہ کے لئے پڑھ رہا ہوں" شاہ میر نے زیر لب مسکرا کر فرمایا۔ "کیوں کہ یہ جانم ہمارا نور بصر ہے" اس خوش نصیب شہزادے پر فقیر کی کرم نوازی عالم رویا میں بھی جاری رہی اور بعد از وصال بھی عالم خواب میں ایک بار دونوں کی ملاقات ہوئی۔ (داراشکوہ نے دست بستہ سلام نیاز مندی پیش کیا تو آپ نے تبسم فرما کر کہا۔ "عزیزم میرے قریب آؤ۔" پھر اس کا سینہ برہنہ کیا اور اسے سینے سے لگا لیا دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے دل درویش سے انوار کا شورید سر دریا رواں ہو کر "قلب مطلوب" کی جانب بہنے لگا۔ بقول داراشکوہ "میں جی بھر کے سیراب ہوا حتی کہ مجھے تنگی داماں کا احساس ہونے لگا۔ آنکھ کھلی تو میری کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ عالم عرفان و آگہی کا سمندر میرے سینے میں موجزن تھا۔"

1642ء میں وصال درویش کے سات برس بعد حضرت میر کی توجہ اور ان کے تصرف بعد از وصال کے فیض سے شہزادہ موصوف کو لیلتہ القدر کی نظارگی بھی نصیب ہوئی۔ ماہ رمضان، رات کے پچھلے پہر وہ قبلہ رو بیٹھا مشغول وظائف تھا کہ کمرے میں نور کا سیلاب آ گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کے سامنے ایک دل کش منظر تھا۔ وسیع و عریض سر سبز شاداب میدا میں ایک عالی شان عمارت تھی "یہ تو حضرت میر کا روضہ اطہر ہے" اس کے دل

نے گواہی دی۔ وہ دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا۔ بالا پیر مزار سے باہر نکلے اور ایک زر و جواہر سے مزین کرسی پر بیٹھ گئے۔ شہزادے نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور بصد احترام آنکھوں سے لگالیا۔ شاہ میر نے شیرینی عطا کی اور چند وظائف تعلیم کیئے۔ **سکینتہ الاولیا** میں داراشکوہ نے یہ واقعہ دل کش انداز میں رقم کیا ہے۔

شاہ میرؒ کا وصال ہوا تو شہزادہ موصوف اکبر آباد میں تھا (جس کا اسے زندگی بھر قلق رہا) عالم خواب میں زیارت درویش ہوئی اور انہوں نے عجیب و غریب خواہش کا اظہار فرمایا۔ ”عزیزم! اٹھو اور ہماری نماز جنازہ ادا کرو“ پھر درویش کے اصرار پر شہزادے نے ان کی نماز جنازہ ادا کی۔ کیفیت اضطراب ناقابل برداشت ہو گی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا..... چند روز بعد لاہور سے اطلاع وصول ہوئی کہ عین اسی روز اور اسی پل جب شہزادے نے خواب دیکھا تھا' حضرت میاں میر سفر آخرت اختیار کر گئے تھے۔

ممتاز محل کے بطن سے تولد ہونے والا شاہجہان کا پہلا فرزند جس کا نام ”داراشکوہ“ اس کے دادا جہانگیر نے تجویز کیا' ابتدا ہی سے تصوف کی طرف مائل تھا۔ **سکینتہ الاولیاء** کی تدوین اس کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ قرار دیا جاتا ہے **سفینتہ الاولیاء** بھی شہزادہ موصوف ہی کی قلمی کاوش ہے لیکن جس عرق ریز
سے اس نے **سکینتہ الاولیاء** تصنیف کی اس کی جتنی
تعریف کی جائے وہ کم
احادیث' مختلف تفاسیر (جن کی تعداد بیس کے قریب
بنتی ہے)۔
والہ جات سے اپنی تصنیف کو مزین کیا پھر سینکڑوں
یا“ پچاس بزرگان دین کے اقوال و فرمودات
وش واقعی ایک کارنامے سے کم نہیں۔ اس
ضرت میاں میرؒ کے اس عاشق زار اور
انجام کی بدولت دشمنان اسلام اور
”فکر اسلام“ **بحیثیت مجموعی** زد پر
ست' متعصب تنگ ظرف و

الناوقت کی اہم ضرورت
شد ضروری ہے......

کا اشتیاق
شہزادے کا برہنہ پا
کرنے کے لیے عاجزی و انکسا
ثابت ہوتا ہے درویش نے دست مبارک
دی۔ تعلقات کی پہلی اینٹ سیدھی رکھی گئی تو م
ہوتی۔

ان داستان طرازوں سے متاثر ہو کر ہمارے قلم کار بھی ایسی ایسی بے پر کی ہانک جاتے ہیں کہ بس سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے لہٰذا قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ اس تحریر کو تعصب کی عینک اتار کر پڑھیں نتیجہ اخذ کرنے میں ہر شخص کو آزادی ہے اور ہونی چاہیئے۔

حضرت میاں میرؒ کا وصال **1045**ھ بمطابق **1635**ء ہوا۔ ٹھیک پانچ برس بعد شہزادہ موصوف نے ملا شاہ قادریؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی **1049**ھ یعنی وصال میرؒ کے چار برس بعد **سفینۃ الاولیاء** منصہ شہود پر آئی۔ یہ کتب تصوف میں گراں قدر اضافہ تھا۔ تین برس بعد یعنی **1052**ھ میں **سکینۃ الاولیاء** منظر عام پر آئی تو گویا تہلکہ مچ گیا۔ صورتحال بڑی خوشگوار اور ایمان افروز تھی پھر چند برس بعد شہزادہ گویا پٹڑی سے اتر گیا اور بدقسمتی سے بنارس کے پنڈت، یوگی اور ہندو دانش ور اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان سے تبادلہ خیالات ہوا تو شہزادہ موصوف ہندو مذہب کی ”رنگینی“ کا شکار ہو گیا۔ کشادہ دلی اور وسعت ظرف کی آڑ میں کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ وصال میاں میرؒ کے ٹھیک بیس برس بعد **1955**ء (**1065**ھ) میں اس نے ”مجمع البحرین“ تصنیف کی۔ اس کا موضوع نام ہی سے ظاہر ہے۔ دو دریاؤں یا سمندروں کا ملاپ، اسلام اور ہندومت کو (جو کوئی مت ہی نہیں) ایک وحدت ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش میں وہ حد سے تجاوز کر گیا۔ یہ وصال شاہجہان سے تین برس پہلے کا ذکر ہے۔ اہل ہنود نے خوشیوں کے شادیانے بجائے۔ شاہجہان کا فرزند اکبر ہونے کی رو سے تخت دہلی کا وہی وارث تھا۔ پکے ہوئے پھل کی طرح وہ ہنود کی جھولی میں آ گرا تو وہ گھی کے چراغ کیوں نہ جلاتے۔ یہ بات کوئی راز نہیں کہ ہنود دارا شکوہ کو تخت دہلی پر متمکن دیکھنا چاہتے تھے انہوں نے تو نئی ”جودھا بائی“ (زوجہ اکبر اعظم) کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔

دو برس بعد دارا شکوہ نے ایک اور دھماکہ کیا اور ”سر اکبر“ لکھی پہلے تو اسلام اور ہندومت کو ایک شجر کی دو شاخیں ثابت کیا گیا تھا مگر ”سر اکبر“ میں اس نے اس سے بھی بڑی جسارت کر ڈالی۔ اس نے مختلف دلائل سے ثابت یہ کیا کہ قرآن حکیم کی سورہ واقعہ میں ”کتاب مکنون“ سے مراد لوح محفوظ نہیں بلکہ ہندوؤں کے **اپنشد** ہیں (تلفظ، ا۔ پ۔ ن۔ ش۔ د)۔ یہ ہندوؤں کی وہ مقدس کتب ہیں جن میں ویدوں کا خلاصہ یا انتخاب درج ہے۔ یہ بڑی المناک صورتحال تھی۔

پہلے جلال الدین اکبر کے دین الٰہی سے طوفان بدتمیزی بپا ہوا، اب یہ ایک نئی مصیبت در

پہ دستک دے رہی تھی۔ مجدد الف ثانی جنہوں نے دین الٰہی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور اسے اکبر کے محل تک محدود کر دیا تھا' سفر آخرت اختیار کر چکے تھے مگر ان کے فرزند اور جانشین خواجہ محمد معصومؒ زندہ سلامت موجود تھے۔ دار اشکوہ کی اس جسارت سے بحر الم میں ڈوب گئے۔ خواجہ معصومؒ کا عالم پیری آڑے آ رہا تھا مگر کچھ نہ کچھ کرنا بھی ضروری تھا۔ اسی عالم پیری میں انہوں نے حضور اکرمؐ کے روضہ اطہر پر حاضری کا فیصلہ کیا۔

ہر شخص اپنی اپنی دانش کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے خواجہ معصوم نے یہ مقدمہ “عدالت عالیہ” میں پیش کر دیا۔ “روضہ القیومیہ” میں کمال الدین محمد احسان رقم طراز ہیں کہ خواجہ معصومؒ مراقبے میں گئے اور دار اشکوہ کی ہندو نواز جسارتوں کی روداد' حضور اکرمؐ کی خدمت اقدس میں پیش کی۔ اس بات کا بطور خاص ذکر کیا کہ دار اشکوہ کفر کا احیاء چاہتا ہے اور سلسلہ مجددیہ کا سخت مخالف ہے۔ روضہ القیومیہ کے علاوہ “خزینتہ الاصفیا” میں بھی مرقوم ہے کہ “ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم شمشیر بدست نمودار ہوئے اور فرمایا' جو شخص تمہارا دشمن وہ ہمارا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے یہ شمشیر' قہر الٰہی ثابت ہو گی”

خواجہ معصومؒ مراقبے سے باہر تشریف لائے تو بے اختیار پکار اٹھے “خس کم جہاں پاک' دار اشکوہ ہندوستان میں کیفر کردار کو پہنچا......”

ہمارا مقصد سیاسی تاریخ بیان کرنا نہیں مختصراً" عرض ہے کہ ساموگڑھ میں شکست فاش کے بعد داراشکوہ قندھار کی طرف بھاگا۔ درہ بولان کے نواح میں داور کے مقام پر ملک جیون نے اسے گرفتار کر لیا اور افواج اورنگ زیب کے سپرد کر دیا۔ دہلی پہنچنے پر "مجمع البحرین" تصنیف کرنے کی بنا پر مقدمہ چلا اور اسے واجب القتل قرار دیا گیا۔ اس طرح **سفینتہ الاولیاء** اور **مکینتہ الاولیاء** جیسی کتب کا مصنف ایک قادری شہزادہ "مجمع البحرین" اور سر اکبر جیسی دل دکھانے والی کتب لکھنے کی پاداش میں الم نام انجام کو پہنچا...... اورنگ زیب عالمگیر کن ذرائع سے تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوا؟ اپنی اپنی دانش کے مطابق اس پر متضاد تبصرے ہوئے اور ہوتے رہیں گے اس بحث میں الجھنا نامناسب ہے لیکن اس سلسلے میں ایک معتبر گواہی پیش خدمت کرنے کی جسارت ہم ضرور کریں گے۔

دور میاں میرؒ برصغیر میں سلسلہ قادریہ کے عروج کا دور ہے ان کی عمر عزیز کے آخری دور میں اسی سلسلے کے ایک شہباز طریقت، سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ ہوئے ہیں (1039ھ تا 1102ھ) یہ اورنگ زیب کا عہد حکومت تھا۔ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان کشمکش ان کے سامنے کا واقعہ ہے وہ اپنی تصنیف "نور الھدیٰ خورد" میں اورنگ زیب کو "خلائق پناہ محی الدین" غازی، عادل، زاہد، واقف اسرار ربانی اور آگاہ علم سبحانی" قرار دیتے ہیں۔ اپنے رسالہ "قرب دیدار" کے آغاز میں انہوں نے یہ شعر لکھا

عمل شاہی عبیداللہ الہ است
کہ اورنگ زیب غازی بادشاہ است

اس کے علاوہ سلطان العارفین نے اپنی دوسری تصانیف میں بھی اورنگ زیب کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سلطان باہوؒ جیسا بے خضر رہ سلوک کا شاہسوار، کیا واقعی داراشکوہ اور حضرت میاں میر کے روابط سے ناآشنا تھا؟ عقل اسے ہرگز تسلیم نہیں کرتی اس کا ایک ہی مفہوم ہے کہ وہ اورنگ زیب کو واقعی حق پر اور داراشکوہ کو قابل گردن زدنی سمجھتے تھے...... ان تمام شواہد کی موجودگی میں ہم آپ لب کشائی کی جسارت کیسے کر سکتے ہیں؟

عشق رسولؐ حضرت میاں میرؒ کا اوڑھنا بچھونا قرار دیا جائے تو ہرگز مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ عمر بھر کوئی ایسا کام نہ کیا جو اسوہ حسنہ کے عین مطابق نہ تھا۔ نشست و برخاست سے لے کر

خلق خدا سے حسن سلوک تک نقش پائے رسولؐ کا اتباع ہر پل ہر گھڑی کیا۔ جہاں تک معرفت الٰہی کا تعلق ہے تو شاہ میرؒ نے اس کے تین طریقے تعلیم کیئے انہیں درجات و مقامات کہنا زیادہ مناسب ہے۔ آپ نے فرمایا احکام "شریعت کی پابندی سالک کے لئے اہم ترین شے ہے اس میں کامل ہونے کے بعد "طریقت" کا راستہ دکھائی دیتا ہے نفس کی اصلاح کا آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے۔ طریقت کے جملہ لوازمات بطریق احسن پورے ہوں تو راز حقیقت عیاں ہوتا ہے۔ بری خصلتوں سے نجات اور اندر کی پاکیزگی اس کے نتائج ہوتے ہیں۔ تب جا کر دل کی آنکھ سے بشریت کے پردے اٹھتے ہیں اور "مکمل انسان" معرض وجود میں آتا ہے۔"

شاہ میر "ترک و تجرید" کا بہترین نمونہ تھے اس کے باوجود مریدان باصفا کو عام زندگی گزارنے کی تلقین فرماتے "اس خارزار کی سیاحی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔" پہلا درس یہی ہوتا۔ اگر کوئی صاحب ظرف مل جاتا جس میں "مشغول حق" ہونے کی جملہ صفات موجود ہوتیں تو اس کی حوصلہ افزائی فرماتے۔

شیخ حامد گوجر آپ کے ایک صاحب شرف و ظرف مرید تھے۔ ایک عرصہ تک ترک و تجرید کی ضد کرتے رہے آخر کار عمر عزیز کے آخری دور میں ان کو "مشغول ذکر" کر دیا گیا۔ ان کی بیوی نے شیخ داؤدؒ سے عرض کی۔ "آپ کی رسائی دربار میرؒ تک ہے' میرے شوہر نے زندگی ہی میں مجھے بیوہ بنا دیا ہے گھر کے در و دیوار سے ویرانی ٹپکنے لگی ہے ذرا مناسب الفاظ میں شاہ میرؒ کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں تاکہ اس گھر کی رونقیں بحال ہو جائیں۔"

حضرت میاں میر تک یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا "حامد گوجر نے زندگی کا بیشتر حصہ مکروہات زمانہ میں بسر کر دیا۔ اس کا اپنا بھی' اس پر کوئی حق ہے اب وہ بہت دور جا چکا ہے لہٰذا وہ اہل و عیال کے کام کا نہیں رہا"...... دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر" کے مصداق آپ عام انسانوں کو ترک و تجرید سے دور رکھتے۔

محفل احباب و اصحاب رنگ پر تھی ارشادات عالیہ سے محفل لطف اندوز ہو رہی تھی اچانک ملا سعد اللہ نے مسئلہ رویت چھیڑ دیا۔ (رویت بمعنی مشاہدہ حق ننگی آنکھ سے ذات باری تعالیٰ کو دیکھ سکنا) "ہم تو صرف جسمانی صورت کو "مکان" خاص پر ہو تو دیکھ سکتے ہیں ذات باری تعالیٰ لامکانی ہے تو ایسی صورت میں جلوگی کا نظارہ کیسے ممکن ہے؟"

"آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ اہل بہشت کی پنڈلیوں کا گودا، ستر کپڑوں کی تہ تلے سے بھی دکھائی دے گا" حضرت میاں میرؒ نے تشریح کا آغاز کیا۔ "گویا اس جسد خاکی کی ہر شے "نور" کا درجہ اختیار کر جائے گی گویا بصارت بصیرت میں تبدیل ہو جائے گی دوسرے الفاظ میں ہمارا جسم کثیف، لطیف بن جائے گا اور لطیف، لطیف کا مشاہدہ کر سکتا ہے (صفات باری تعالیٰ میں لطیف خبیر اہم صفات ہیں)

حضور اکرمؐ نے ذات باری تعالیٰ کا دیدار کل گیارہ مرتبہ کیا۔ دو مرتبہ کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے اور نو مرتبہ کا احادیث سے شب معراج رکعتوں کی تخفیف کے سلسلے میں آنحضرتؐ نو بار "مقام عروج" میں تشریف لے گئے اور واپس آئے۔ اس آمدورفت میں دیدار الٰہی سے فیض یاب ہوتے رہے واضح ہو یہ نظارگی کیفیت اعتدال کی تھی"

ایک روز شاہ میرؒ نے عجیب و غریب بات کہہ دی۔ "غفلت، کفر سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہے" احباب نے تشریح طلب نگاہوںں سے دیکھا تو آپ نے فرمایا۔ "کفر کا علاج کلمہ پڑھنے سے ہو جاتا ہے لیکن اہل دل کے ہاں غفلت لاعلاج مرض ہے۔"

فرمودات میرؒ کے مطابق مردان حق کا "تصرف" زندگی اور موت کے بعد بھی ایک جیسا رہتا ہے بلکہ موت کے بعد چوں کہ تمام پردے اٹھ جاتے ہیں لہٰذا "تصرف" کا دائرہ وسیع ہو کر صاحب تصرف کے لئے آسانی کا باعث بن جاتا ہے۔

ایک بار علمائے شہر نے استفسار کیا کہ "آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ عالم پیری میں بندے کی حرص بڑھ جاتی ہے تو کیا اس کلیئے کا اطلاق انبیاء علیہ پر بھی ہوتا ہے؟؟"

آپ نے اس کا ایسا شاندار جواب ارشاد فرمایا جو تا قیامت مشعل راہ رہے گا۔ "بے شک اس کا اطلاق انبیاء علیہ پر بھی ہوتا ہے مگر اس کی تشریح کچھ اس طرح سے ہے، مکروہات زمانہ میں گرفتار ایک عام آدمی کو دنیاوی ساز و سامان کی حرص ہوتی جو عالم پیری میں بدرجہا بڑھ جاتی ہے مگر انبیاء علیہ اور مردان حق زندگی بھر خلق خدا کو راہ راست پر لانے کی حرص میں مبتلا رہتے ہیں اور عمر عزیز میں اضافے کے ساتھ اسی نوعیت کی "حرص" میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے ان کے پیش نظر صرف یہ بات ہوتی ہے کہ وقت کم رہ گیا ہے اور کام بہت زیادہ ہے اس لئے ان کو "حریص" کہا جاتا ہے لیکن حرص، حرص میں امتیاز ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ انبیاء علیہ پر عام حرص کا گمان پرلے درجے کی گمراہی اور باعث ہلاکت ہوتا

ہے۔"

نمود و نمائش اور شہرت کی خاطر آپ کسی کو مرید نہیں بناتے تھے۔ ملاقات کی تمنا لے کر آنے والے کی دلجوئی فرماتے، لیکن طلب حق کے خواہش مند کو آزمائش میں ضرور ڈالتے۔ ملا شاہ بدخشانی کی طرف پورے تین برس تک ملتفت نہ ہوئے۔

جاہ پسندی کو ترک کرنے کی سختی سے تلقین کرنا شاہ میرؒ کی عادت تھی ان کے نزدیک درویشی کو تباہ و برباد کرنے میں جاہ پسندی سرفہرست تھی۔ ایک بار خواجہ ملا بہاری اپنے احباب کے ساتھ حجرے میں تشریف فرما تھے۔ اچانک انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا اور احباب کے حجرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ "چھت گرنے والی ہے فورا" باہر تشریف لے جائیں" اصحاب تعمیل ارشاد میں باہر دوڑے مگر ملا موصوف اسی جگہ بیٹھے رہے۔ چھت گرنے کے آثار دکھائی دیئے تو آپ بہ آواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔ دھڑام سے چھت نیچے آگری مگر دو مضبوط کڑیاں آپ پر گویا سایہ فگن ہو گئیں۔ آپ ان کڑیوں کے نیچے محفوظ رہے۔ حضرت میاں میرؒ کو اس حادثے کی خبر ہوئی تو بے اختیار پکار اٹھے "ہائے جاہ، وائے جاہ" اس نامراد جاہ پسندی کا خیال دم آخر بھی جان نہیں چھوڑتا۔ ملا بہاری کو کلمہ طیبہ بہ آواز بلند نہیں پڑھنا چاہئے تھا۔ یہ تو درویشی کی دھاک بٹھانے والی بات ہوئی۔"

اس حقیقت سے تو ایک زمانہ آشنا ہے کہ سلسلہ قادریہ میں خرقہ "میر شاہی" حضرت میاں میرؒ سے منسوب ہے..... آپ کا حلیہ مبارک کتب مشائخ کے مطابق، رنگ گندمی، پیشانی کشادہ ابرو ایک دوسرے سے پیوستہ، آنکھیں درمیانی، اعضاء متناسب ریش مبارک مٹھی برابر اور قد درمیانہ تھا گویا "**خبرالامور اوسطھا**" کی منہ بولتی تصویر تھے۔ گفتگو مدلل اور کم سے کم الفاظ پر مشتمل ہوتی۔ طرز استدلال کی بہترین مثال پیش خدمت ہے....

جہانگیر کے عہد حکومت میں وزارت اعظمیٰ کا قلمدان نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کے پاس تھا۔ جہانگیر کے دل پر حکمرانی بھی ملکہ ہند کی تھی۔ دونوں شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے اس طرح سرزمین ایران سے مجتہد حضرات کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ دربار پر تسلط بھی اہل تشیعی کا تھا۔ ملکہ ہند کا والد اعتماد والدولہ، مرزا غیاث بیگ نواب آصف جاہ، نواب صادق خاں طہرانی، نواب جعفر خان وغیرہا یہی حضرات کلیدی عہدوں پر فائز تھے لاہوری علما نے اس طرف خصوصی توجہ مبذول فرمائی لیکن جو کارنامہ حضرت میاں میر نے سرانجام دیا وہ منفرد

قرار دیا جا سکتا ہے۔

نواب آصف جاہ کی دختر ممتاز محل شاہجہان کی چہیتی بیوی تھی۔ دونوں کے ایما پر ایران سے ایک ذہین و فطین مجتہد کو مدعو کیا گیا تاکہ سنی علماء سے مناظرے کا بازار گرم کیا جائے۔ مجتہد موصوف لاہور تشریف لائے تو حضرت میاں میر سے بطور خاص ان کی ملاقات کروائی گئی۔ آپ نے بر سبیل تذکرہ پوچھا "کیا آپ کربلائے معلی کی زیارت سے فیض یاب ہوئے ہیں؟"

"الحمد اللہ! بارہا اس سعادت سے مستفیض ہو چکا ہوں" مجتہد نے جواب دیا۔

"اس سرزمین کے فضائل سے فقیر کی تشنگی دور فرمایئے" شاہ میر نے بصد احترام کہا۔

"اس سرزمین کی ادنے فضیلت یہ ہے کہ اس کے نواح میں سات سات کوس تک مدفون حضرات روزہ محشر بغیر حساب داخل جنت ہونگے"

کیا یہ فضیلت انبیائے کرام کی آرام گاہوں کو بھی حاصل ہے؟" حضرت میاں میر نے پوچھا۔

"ہر نبی کے مرقد کے گرد دس دس کوس میں مدفون حضرات بھی بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے" ایرانی مجتہد نے بے ساختہ جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنحضرتؐ کے پہلو میں مدفون دو بزرگوں کی بخشش بھی عین ممکن ہے"

ایرانی مجتہد کی تسلی ہو گئی اور برصغیر میں شیعہ سنی مناظروں کا بازار گرم ہوتے ہوتے رہ گیا کیوں کہ ایرانی عالم واپس لوٹ گیا...... اس طرح شاہ میر نے مومنانہ فراست سے حالات پر قابو پالیا۔ (خدا ملت اسلامیہ کو جاہ پسند لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے خواہ ان کا تعلق کسی مسلک سے ہو)

"خوارق عادات و کرامات" ان واقعات کا ظہور اولیائے کرام کا خاصہ رہا ہے مگر شاہ میر اس سلسلے میں حد سے زیادہ محتاط تھے اور گریز کی حد تک اجتناب فرماتے اور اکثر یہ مصرع زیر لب دہراتے

کرامت اولیا را اضطراب است

(اولیاء کے لئے کرامات باعث اضطراب ہوتی ہیں) ان کے بقول اس نوعیت کے

واقعات دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ اختیاری اور اضطراری۔ اسمائے الٰہی کے ورد کے نتیجے میں اختیاری کرامات کا ظہور ہوتا ہے تاکہ منزل مراد کا حصول آسان ہو جائے۔ حصول مراد بذات خود ایک کرامت ہے کہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

اضطراری کرامات من جانب اللہ ہوتی ہیں۔ ان کا ظہور اس مقام پر ہوتا ہے جہاں بندے کے اعمال، رب العزت کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں۔ یہ تقریب الٰہی کا بلند ترین مقام ہوتا ہے اور "ایں سعادت بزور بازو نیست"

دارا شکوہ کے استاد مکرم اخوند میرک شیخ نے ایک روز زیارت میرؒ کی خواہش کا اظہار کیا۔ دارا شکوہ نے اپنی طرف سے تعارفی خط استاد مکرم کی خدمت میں پیش کیا جو شیخ موصوف نے اپنی دستار میں رکھ لیا۔ درویش نے بصد احترام اخوند میرک کا استقبال کیا کمال مہربانی سے پیش آئے بڑی رسان سے احوال دریافت فرمایا۔ دوران ملاقات شیخ کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ "بالا پیر کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا مگر یہ تو عام سے انسان ہیں کشف و کرامات والی کوئی بات ہی نظر نہیں آ رہی" ادھر ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال ابھر رہا تھا ادھر درویش نے چونک کر مہمان کو دیکھا ہونٹوں پہ تبسم رقصاں ہوا اور آپ نے ہاتھ بڑھا کر وہ تعارفی خط جسے شیخ صاحب پیش کرنا یکسر بھول چکے تھے، اچک لیا...... اور شہزادے کا خط بغور پڑھنے لگے۔ واضح ہو اس زمانے میں عالم پیری کی بناء پر بصارت حد سے زیادہ کمزور ہو چکی تھی مگر بصیرت یقیناً "اوج ثریا" سے بھی اونچے مقام پر فائز تھی۔ شیخ اخوند نے شدت خجالت سے سر جھکا لیا۔

دریائے راوی کنارے باغ مرزا کامران میں حضرت میاں میرؒ اکثر تشریف لے جاتے۔ سنت نبویؐ کی اتباع میں سرسبز مقامات سے آپ کو عمر بھر رغبت رہی اسی باغ میں ایک روز لیٹے ہوئے تھے۔ شیخ عبد الواحد بنیانی پاؤں دبا رہے تھے۔ اچانک تھوڑے فاصلے پر ایک ناگ پھن پھیلائے کھڑا نظر آیا۔ شیخ صاحب کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ درویش نے عقیدت مند کو گھبرائے ہوئے دیکھا تو چونک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ ناگ اس وقت شاید اشتعال میں تھا وہ پھنکارنے لگا......

"حضور اب کیا ہو گا؟" شیخ موصوف نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا مگر یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ بالا پیر ناگ کو قریب آنے کا اشارہ فرما رہے ہیں۔ ناگ قریب آیا تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ناگ نے باقاعدہ ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھا پھر قریب ہی اپنے منفرد انداز میں بے حس و

حرکت کھڑا ہو گیا..... سب کچھ شیخ عبدالواحد بنیانی کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا مگر دل‘ آنکھوں کی معتبر گواہی کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ شیخ صاحب کو محسوس ہوا جیسے ناگ آپ سے محو کلام ہو۔ حیرت کی انتہا اس وقت ہوئی جب حضرت میاں میرؒ نے مسکرا کر کہا ”اچھا! تو پھر یونہی سہی....“ گویا سانپ کی کسی بات سے آپ متفق ہو گئے۔ ناگ پھن سمیٹ کر تھوڑی دیر بیٹھ رہا پھر بڑے اطمینان سے آپ کے گرد چکر لگانے لگا۔ انداز طواف کرنے کا سا تھا۔ شیخ عبدالواحد کے خوف پر حیرت غالب آچکی تھی ناگ نے تین طواف کئے اور اطمینان سے اپنی راہ ہو لیا۔

”حضور! یہ کیا راز تھا“ ناگ غائب ہوا تو شیخ صاحب اپنے تجسّس پر قابو نہ رکھ سکے۔

عزیزم! سانپ نے مجھ سے کہا ”ایک عرصے سے میں آپ کی زیارت کا مشتاق تھا اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلی ملاقات پر آپ کے گرد طواف کروں گا۔ آج مجھے اس سعادت سے محروم نہ رکھیں“

”اور میں نے اس کی اجازت دے دی“ یہ کہہ کر شاہ میر پھر فرش زمین پر لیٹ گئے....

ایسا ہی ایک واقعہ باغ زین خاں میں پیش آیا اس روز بھی شیخ عبدالواحد آپ کے ہمراہ تھے۔ ایک شجر سایہ دار پر معصوم فاختہ اپنے انداز میں نغمہ سرا تھی۔ آپ نے پسندیدگی کی نگاہ سے اس فاختہ کو دیکھا اور کہا ”سبحان اللہ! کس خوش الحانی اور کیسی رغبت سے رب العزت کی تسبیح کر رہی ہے؟“ اس وقت آپ کے چہرے سے دلی مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اچانک کہیں سے ایک پتھر آ کر فاختہ کو لگا اور وہ شاخ سے گر کر تڑپنے لگی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک شخص نظر آیا جس کے ہاتھ میں غلیل تھی۔ صورتحال کی وضاحت ہو گئی۔ یہ کارروائی شکاری کی تھی۔ آپ بڑے کبیدہ خاطر ہوئے اور بڑے دکھ سے فرمایا ”اتنا تھوڑا سا فائدہ اور اتنا خسارہ؟“

”عزیزم! اس جاں سوختہ کو اٹھا لاؤ“ آپ نے شیخ عبدالواحد سے کہا۔

مردہ فاختہ بالا پیر کے سامنے پڑی تھی اور آپ بڑے پیار سے اس کے بال و پر چھو رہے تھے اور زیر لب کچھ پڑھتے بھی جا رہے تھے۔ اچانک فاختہ کے تن مردہ میں زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ درویش کے ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فاختہ پھڑپھڑا کر اڑ گئی اور شاخ شجر پر بیٹھ کر حسب سابق اپنے وظیفے میں مشغول ہو گئی..... اتنے میں،

شکاری اپنی غلیل سمیت پھر آ گیا اور فاختہ کو زد پر لے آیا۔

"عبدالواحد! اس غافل انسان کو روکو' فاختہ بالکل بے قصور ہے" آپ نے اپنے عقیدت مند سے کہا...... وہ شکاری یقیناً "مقام درویش سے بے خبر تھا اس نے شیخ موصوف کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور ہدف پر کھینچ کر پتھر مارا۔ کیوں اور کس طرح ہوا؟ اس کے متعلق تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر کیا ہوا؟ یہ سب کے سامنے تھا۔ غلہ اس کے اپنے ہاتھ پر لگا اور شکاری کی چیخ نکل گئی۔ اسی پر بس نہیں وہ شکاری باقاعدہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ یہ بھی ایک ناقابل فہم سی بات تھی۔ غلیل سے نکلنے والا غلہ اتنا طاقتور کیسے ہو گیا کہ ایک تنومند نوجوان ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جائے خیر! شکاری کے حواس بجا ہوئے تو اس کے بازو میں درد کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قریب ترین جائے پناہ کی طرف بھاگا۔ جس فقیر کو اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا تھا اسی سے درد لازوال کی دوا کا تمنائی ہوا..... اس طرح اسے زیارت میرؒ کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔

"فاختہ نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو آپ اس کے درپے آزار ہوئے۔" شاہ میر نے شکاری سے پوچھا.....

"جناب ٹھوکر لگنے ہی سے آنکھ کھلتی ہے" شکاری بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ "اپنی سزا میں تخفیف کی طرف درخواست ہی کر سکتا ہوں ظاہر ہے مجھ میں مقابلے کی تاب ہے نہ مجال"

"درتوبہ میں داخل ہوتے ہی "تاب و مجال" کا حصول ہو جاتا ہے" بالا پیر نے بڑے میٹھے لہجے میں فرمایا۔

"جناب اس درد کے طوفان سے تو نجات دلائیں توبہ تو میں کب کا کر چکا" شکاری نے ہتھیار ڈال دیئے۔ بالا پیر نے کمال مہربانی سے دردیلے بازو پر ہاتھ رکھ دیا شکاری کے دل کو قرار آ گیا.....

لاہور میں طاعون کی وبا پھیلی تو خلق خدا کو خدا یاد آ گیا۔ ہر بستی سے آہ و فغاں بلند ہوئی۔ موت کا رقص عام ہوا۔ اس وبا کی تباہی کا دورانیہ کافی طویل تھا۔ شیخ پیر میرٹھی' خدمت درویش میں حاضر ہوئے اور وبا کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ آپ نے فرمایا "عزیزم! "اٹل قضا میں دعا سے گریز کرنا چاہیے"

پیر میرٹھی کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس رات گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر خود مشغول دعا

ہوئے۔ دست دعا بلند کرتے ہی ہوش حواس سے بیگانے ہو گئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے اندھے کنوئیں میں گرے جا رہے ہیں۔ یہ کیفیت تین دن تک رہی.... ان ایام میں نمازیں تک قضا ہو گئیں۔ چوتھے روز حواس ٹھکانے آئے تو بھاگم بھاگ خدمت درویش میں حاضر ہوئے۔ آپ نے دیکھتے ہی تبسم فرمایا "حضرت! اتنی بے باکی نامناسب ہوتی ہے' وہ تو اتفاقاً" فقیر کو خیال آ گیا تھا ورنہ اس اندھے کنوئیں سے کون سلامت واپس آتا ہے" بات اشارے کنائے سے کی گئی مگر پیر میرٹھی سمجھ چکے تھے۔

بالا پیر کسی مجذوب کو برہنہ حالت میں دیکھ لیتے تو کبید خاطر ہو اٹھتے اور ستر پوشی کا حکم دیتے۔ ایسا ہی ایک مجذوب سر بازار نظر آیا تو آپ نے ستر پوشی کی تلقین کی مگر مجذوب تو مجذوب ہوتا ہے کہتے ہیں اس پر شریعت کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔

"درویش! ہوش میں آؤ ستر پوشی فرائض کے زمرے میں آتی ہے" بالا پیر نے سرزنش کی مگر برہنہ مجذوب مسکرانے لگا۔ آپ نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا مسکراہٹ برہنہ شخص کے ہونٹوں پر منجمد ہو گئی۔ عجیب صورتحال تھی وہ فقیر بس مسکرائے ہی جا رہا تھا۔ جیسے کوئی سنگتراش کسی بت کے چہرے پر مسکراہٹ "نقش" کر دے..... مجذوب ادھر ادھر دیکھنے لگا ایک شخص نے چادر پیش کی مجذوب نے فوراً" ستر پوشی کی اور حالت "اعتدال" میں آ گیا.....

"جتنا ظرف ہو اتنی ہی پینی چاہئے" بالا پیر نے مجذوب کو تلقین کی۔

باغ نولکھا میں مشغول راز و نیاز تھے کہ آپ نے اپنے ایک مرید کو طلب فرمایا۔ "جاؤ' اس سامنے والے درخت سے" ورد "کا سلیقہ سیکھو اور واپس آ کر بتاؤ وہ کیا وظیفہ کر رہا ہے" مرید حیران و ششدر شجر سایہ دار کے قریب گیا۔ واپس آیا تو حیرت دو چند ہو چکی تھی "حضور! درخت نے کہا "یا نافع" کا ورد کر رہا ہوں"

یہ درخت سرس کا تھا اور عہد اورنگ زیب تک باغ نولکھا میں قائم و دائم تھا۔ لوگ اسے دیکھتے تو حضرت میاں میرؒ کی یاد تازہ ہو جاتی...... ایک روز آپ نے محفل احباب و اصحاب کو ایک عجیب و غریب حکایت بیان فرمائی اس کے راوی میاں حاجی محمد بنیانیؒ ہیں۔

"سیوستان کے پہاڑی علاقے میں چار درویش سفر کر رہے تھے۔ مسلسل تین روز تک کوئی حلال شے کھانے کو میسر نہ آ سکی۔ بھوک سے بے تاب ہوئے تو ذکر و فکر میں خلل کا اندیشہ

ہوا....."

"آپ حضرات اجازت دیں تو میں تنہا آگے جا کر کھانے پینے کا کوئی بندوبست کروں" ان میں سے ایک نے تجویز پیش کی۔ بھوک سے سب کا برا حال تھا ان کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس طرح اجازت کا طلب گار فقیر ان سے جدا ہو گیا.... تھوڑی دیر بعد پیچھے رہ جانے والوں کو ایک ایسا درخت نظر آیا جس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی تھیں۔ پھل ایسا خوش رنگ اور جاذب نظر تھا کہ سب کے دل باغ باغ ہو گئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی شجر ثمربار کے قریب ہی ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ بھی پھوٹ رہا تھا۔ تینوں فقراء نے خوب سیر ہو کر پھل کھایا اور ٹھنڈے پانی سے تشنگی دور کی۔ آتش شکم ٹھنڈی ہوئی تو ان کو اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی کی یاد آئی۔

"اس کے لئے بھی تھوڑا پھل رکھ لینا چاہئے" ایک نے اپنی رائے کا اظہار کیا "ویسے بھی یہ پھل اس زمین کا دکھائی نہیں دیتا' جنت کا میوہ معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا ساتھی اس نعمت سے کیوں محروم رہے؟"

تھوڑی دور چلے تو چوتھے درویش سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے وہ پھل پیش کیا مگر درویش نے مناسب الفاظ میں پھل کھانے سے معذوری کا اظہار کیا.....

"یا حضرت! کیا وہ فقیر بھوک سے بے تاب نہیں تھا؟" حاجی محمد بنیانی نے پوچھا۔

"وہ شجر ثمربار' وہ چشمہ' خود فقیر ہی تو تھا" بالا پیر نے دھیمے لہجے میں کہا پھر جیسے بیتے دنوں کی یاد میں کھو گئے..... بقول حاجی محمد بنیانیؒ وہ فقیر دراصل خود حضرت میاں میرؒ ہی تھے.....

سیوستان اور بھکر کے بلوچوں میں ایک رسم تھی کہ جب تک کسی خاندان کے پاس زر و مال کے علاوہ مویشیوں کا غلہ نہ ہوتا کوئی ان سے لڑکی کا رشتہ طلب نہ کرتا۔ ایک علاقے کا سردار سفر آخرت اختیار کر گیا تو پس ماندگان مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ بیوہ کا سامان دنیا صرف چندے آفتاب چندے مہتاب ایک لڑکی تھی مگر مفلسی نے گھر میں قدم رکھا تو عزیز و اقربا دور ہو گئے...... سردار کی زندگی میں درجنوں اس رشتے کے خواستگار تھے مگر اب کوئی پرسان حال نہ تھا..... اسی بستی میں ایک فقیر مقیم تھا جانے کہاں سے آیا تھا اور کہاں اسے جانا تھا۔ بس روزانہ اس مفلس و قلاش گھرانے کی گویا خبر لینے آ جاتا۔ لڑکی کو ایک نظر دیکھتا اور کچھ کہے سنے بغیر چل دیتا۔

"اماں! اگر مناسب سمجھو تو اس درویش سے معاونت کی درخواست کی جائے" ایک روز لڑکی نے اپنی دل گیر ماں سے کہا۔

"بیٹی جو خود فقیر ہے وہ کسی کو کیا عطا کر سکتا ہے؟ البتہ اس سے مفلسی طلب کی جا سکتی ہے۔ اس کی ہمارے پاس پہلے ہی کمی نہیں" ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

"مگر میں نے اس درویش کو کسی کے آگے جھولی پھیلاتے نہیں دیکھا، جن شفقت بھری نظروں سے وہ مجھے دیکھتا ہے مجھے تو بس ابو کی یاد تازہ ہو جاتی ہے" دوشیزہ نے اپنے نکتہ نظر کی وضاحت کی...... دوسرے روز جب فقیر آیا تو اس مفلس بیوہ نے اپنی دکھ بھری داستان درویش کے گوش گزار کی۔

"تم لوگوں کو کس قسم کی مدد درکار ہے" درویش نے داستان الم سننے کے بعد پوچھا۔

بس رسم و رواج کے مطابق بچی کے ہاتھ پیلے ہو جائیں مجھے اور لوبھ لالچ تو ہے نہیں، عزت و آبرو سے اس فرض کی ادائیگی چاہتی ہوں....."

"تو چلو میرے ساتھ رب العزت بہتر صورت حال پیدا کرے گا"

درویش اس بیوہ کو لے کر ایک اجنبی بستی میں آیا اور ایک تاجر کی دوکان کی طرف اشارہ کیا۔ "جس شے کی ضرورت ہو اس سے طلب کر لینا مگر دیکھو، بغیر ضرورت کے کوئی چیز حاصل نہ کرنا یہ ذخیرہ اندوزی، ایمان ناقص کو ظاہر کرتی ہے"

بیوہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے فقیر اپنی راہ ہو لیا۔ بیوہ نے تاجر کی دوکان دیکھی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں.... ایسی ایسی نادر الوجود اشیاء وہاں موجود تھیں جن کے نام تک وہ بھول چکی تھی...... اپنے اچھے دن یاد آ گئے جو قصہ پارینہ ہو چکے تھے۔ بیوہ نے ضرورت کا سامان حاصل کیا۔ مویشیوں کے لئے رقم بھی طلب کی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ تاجر اس کی مطلوبہ شے سن کر تھوڑی دیر سوچتا اور پھر خاموشی سے اس کی مطلوبہ شے فراہم کر دیتا..... گھر میں اشیاء کی فراوانی ہوئی تو عزیز و اقربا کو بھی بھولے ہوئے روابط یاد آ گئے۔ عام خیال یہی تھا کہ مرحوم خاوند کا مدفون خزانہ بیوہ کے ہاتھ آ گیا ہے۔ دوشیزہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

ایک روز بیوہ کے دل میں خیال آیا "سال بھر کا اناج اور ضروریات کی دیگر اشیاء ایک ہی دفعہ حاصل کر لینی چاہیں کون روز روز چکر لگاتا پھرے۔" تاجر سے ملاقات ہوئی تو اس نے

مطلوبہ اشیاء فراہم تو کر دیں مگر زیر لب مسکرانے لگا۔ وقت گزرتا رہا بیوہ ایک روز کسی غرض سے اسی دیکھی بھالی دوکان پر پہنچی تو حیران رہ گئی...... بستی تو یقیناً" وہی تھی مگر دوکان کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا بے نیل و مرام واپس لوٹ آئی......

ایک روز اسی فقیر نے پھر دروازے پر آ دستک دی...... بیوہ نے ساری صورتحال اس کے گوش گزار کی تو درویش مسکرانے لگا۔ "خاتون غلاظت پر مکھیا بھنبھناتی ہی ہیں" تمہارے عزیز و اقربا کا تمہاری طرف راغب ہونا سمجھ میں آنے والی بات ہے مگر تمہیں ذخیرہ اندوزی کا خیال کیوں کر آیا؟"

"مگر وہ نیک دل تاجر کون تھا اور کہاں غائب ہو گیا؟" بیوہ نے کف افسوس ملتے ہوئے پوچھا۔

"خاتون..... وہ تاجر وہ دوکان اور سارا سازو سامان تو تمہارے سامنے کھڑا ہے"

یہ کہہ کر درویش یکلخت آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ **خوش نصیبی** نے بیوہ کے در پر دستک دی مگر اس نے طلب کیا کیا؟ بے حقیقت پتھر؟

درجہ بالا واقعہ بھی حضرت میاں میرؒ نے محفل احباب و اصحاب میں بیان فرمایا۔ حاجی محمد بنیانی نے استفسار کیا۔ "پیرو مرشد! وہ درویش کون تھا؟"

"جو کوئی بھی تھا تمہیں اس سے کیا غرض؟ خبردار اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا" شاہ میر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ فقراء کے نیاز مند بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ حاجی صاحب نے ایک روز شاہ میرؒ سے کہلوا کر دم لیا..... "وہ درویش یہی فقیر پر تقصیر تھا"

"مگر حضور اس پردہ داری کی ضرورت کیا گھی؟" نیاز مند نے پیش رفت جاری رکھی۔

"سنت **صیرفی**" درویش نے ناقابل فہم سا فقرہ ادا کیا

"حضور! ناچیز کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا یہ "**صیرفی**" کون ذات شریف ہیں؟"

حاجی صاحب کے سوال پر حضرت میاں میر نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان فرمایا متن پیش خدمت ہے۔" میرا بھائی ایک روز کافی عرصہ بعد اچانک مجھے ملنے لاہور آ پہنچا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی مگر فکر بھی دامن گیر ہوئی، مہمان نوازی کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔"

"میرے حجرے میں بیٹھو، میں تمہارے خورد و نوش کا اہتمام کرتا ہوں" میں نے اپنے بھائی سے کہا اور خود باغ میں کشادہ جگہ پر آیا۔ طہارت کے بعد دو رکعت نماز ادا کی اور اپنا مقدمہ

کائنات کی سب سے بڑی عدالت میں پیش کردیا۔ "رب العزت! گھر میرا مہمان آیا ہے اور میں سامان دنیا سے بالکل تہی دامن ہوں۔ بس تیرے سہارے اسے کمرے میں بٹھا آیا ہوں کیوں کہ تیرے سوا کسی کے آگے دامن دراز کرنا میرے لئے ناممکن ہے" میں نے ابھی دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ ندائے غیب سنائی دی "دعا سے پہلے ہی تیری آرزو ہم نے پوری کردی ہے"

"اس دوران میرا بھائی، قریب آکر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا" آپ کے باہر نکلتے ہی ایک شخص انواع واقسام کے کھانے لے کر حجرے میں داخل ہوا، اب وہ آپ کا منتظر ہے **چلیئے** اس سے ملاقات کرلیجئے۔"

"میں کمرے میں داخل ہوا تو ایک اجنبی خوبصورت نوجوان کی محو انتظار پایا۔ وہ سلام کے بعد بڑے دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ "اللہ تعالیٰ نے اپنی کرم نوازی سے یہ طعام خاص اور کچھ نقدی بھیجی ہے اور فرمایا ہے کہ بعد ازیں جو خواہش ہو ہم سے طلب کرلینا ہم قبول فرمائیں گے"

"آپ اپنا تعارف تو کرا دیجئے کہ کون ہیں؟" میں نے اجنبی سے کہا۔

"میں اللہ کا ایک بندہ ہوں جس کے ذمے ایسے ہی کام ہوتے ہیں" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا

"ہم نے دلی رغبت سے کھانا کھایا کیوں کہ اس کی لذت ہی کسی اور قسم کی تھی۔ اجنبی نے برتن سمیٹے اور سلام کر کے رخصت ہوگیا...... اجنبی کے بارے میں میرے دل میں تجسّس پیدا ہوا آخر مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ "**صیرفی**" تھا۔"

بہجت الاسرار میں "**صیرفی**" کے متعلق غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی زبانی مرقوم ہے، کہ "**صیرنی**" ایک فرشتہ ہے جو اولیائے کرام کے قرض چکانے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مامور ہے۔

حضرت میاں **جیو** تین چیزوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ کم سونا کم بولنا اور کم کھانا۔

نور محمد خادم خاص نے شاہ میرؒ کے متعلق ایک حیران کن واقعہ بیان کیا۔ "عالم پیری میں آپ نے جنگلوں بیابانوں میں جا کر محو راز و نیاز ہونا ترک کردیا تھا۔ بالا خانے ہی میں مصروف عبادت رہتے۔ موسم گرما میں چھت پر تشریف لے جاتے ایک بار مجھے حکم ہوا۔ "پانی کا کوزہ پنکھا اور جوتے چھت پر رکھ آؤ اور جا کر سو جاؤ" اتفاق سے میں پانی کا کوزہ رکھنا بھول گیا۔ نصف شب گذری تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں پانی کا کوزہ لے کر چھت پر پہنچا تو آپ

وہاں موجود نہ تھے..... میں نے ہر ممکن جگہ تلاش کیا مگر حضرت مجھے کہیں دکھائی نہ دیئے۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ میری رات اسی پریشانی میں گذری۔ الصباح حضرت نے مجھے آواز دی "نور محمد پانی کا کوزہ لاؤ" میں مسواک اور وضو کا پانی لے کر حاضر ہوا۔ بار بار دل کی بات زبان پر آتی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حرف مدعا کا آغاز کیسے کروں۔

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو" شاہ میرؒ نے میری مشکل آسان فرما دی۔

"حضور! آپ رات کو کہاں غائب ہو گئے تھے میں نے چراغ لے کر آپ کو تلاش کیا مگر......"

"عزیزم! میں تو ادھر ہی موجود تھا تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہو گا"

"حضور! یہ خواب نہیں عالم بے داری کا قصہ ہے" میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ بار بار اصرار کیا تو آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ "اگر تم رازداری کا وعدہ کرو تو بتائے دیتا ہوں۔"

میں نے اخفائے راز کا وعدہ کیا تو آپ نے کہا "کل شب میں "غار حرا" میں تھا۔ جو سکون طمانیت اور کشائیش وہاں ایک پل میں میسر آ جاتی ہے کسی دوسرے مقام پر چالیس برس کے ذکر فکر سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔"

ملا سنگین اوستاقیؒ درویش کا عاشق زار اور مرید باوفا تھا۔ ایک طویل مدت خدمت فقیر میں قیام پذیر رہا۔ ایک روز اچانک میاں جیئو نے فرمایا۔ "ملا وطن لوٹ جاؤ اور لواحقین کی خبر لو"

"حضور! اب اس در کو چھوڑ کر کون جائے' اب تو اسی آستانے سے سفر آخرت اختیار ہو گا" عاشق زار نے عرض کی۔

"عزیزم تمہارا اوستاق جانا اشد ضروری ہے بلکہ ابھی روانہ ہو جاؤ" درویش کے لہجے میں اضطراب سا تھا دوسرے یہ مشورہ نہیں حکم تھا لہٰذا ملا سنگین فی الفور بدخشاں کی جانب روانہ ہو گئے۔ (اوستاق' بدخشاں کا ایک قصبہ تھا) غروب آفتاب کے بعد ملا موصوف اپنی بستی میں پہنچے ایک عرصے بعد' آشنا در و دیوار اور دیکھے بھالے کوچہ و بازار نے استقبال کیا۔ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو بڑی رونق اور چہل پہل دکھائی دی۔ خلق خدا کا ہجوم' روشن شمعیں "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟" ملا صاحب نے ایک شخص سے دریافت کیا۔

"اس حویلی میں ملا سنگین رہا کرتا تھا جو عرصہ آٹھ برس سے بلاد ہند کوچ کر گیا۔ پچھلے دنوں اس کی وفات کی تصدیق ہو گئی۔ آج اس کی فاتح خوانی ہے اور......"

یہ کہہ کر وہ شخص زیر لب مسکرانے لگا۔

"اور کیا بھائی' بات تو مکمل کرو" ملا سنگین اپنی وفات کی خبر سن کر ورطہ حیرت میں ڈوب گیا

"اور یہ کہ آج ہی اس کی بیوہ شادی کر رہی ہے" اس شخص نے گویا دھماکہ کیا

"شادی؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" مرشد کا اضطراب ملا کی سمجھ میں آ گیا۔

"ممکن کیوں نہیں' بیوہ کی شادی میں کیا قباحت ہے؟"

ملا سنگین اوستاقی نے فوراً" اپنا آپ ظاہر کر دیا اور انہونی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ چند برس اپنے وطن میں گذار کر ملا سنگین پھر لاہور اپنے مرشد کی قدموں میں آ گئے اور ساری روداد من و عن بیان کرنے کے بعد کہا "حضور! اگر میں ایک روز تاخیر سے پہنچتا تو یقیناً" تباہ و برباد ہو جاتا"

حضرت شاہ میرؒ انسانوں ہی میں نہیں جنات میں بھی یکساں مقبولیت کے حامل تھے۔

سلطان علی نامی ایک عقیدت مند کے بیٹے پر ایک جن کی نظر التفات تھی ویسے تو لڑکا لکھنے پڑھنے سے معذور تھا مگر جن کی موجودگی میں فہم و فراست کی ایسی ایسی باتیں کرتا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ بسا اوقات مشہور معروف کتب میں درج شدہ مضامین کی بڑے عالمانہ طریقے پر تشریح کر کے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیتا۔ ایک روز ان پڑھ لڑکے نے مثنوی مولانا روم پڑھنی شروع کی اور اتنی گہری وضاحت کی کہ سامعین عش عش کر اٹھے۔ اگرچہ وہ جن لڑکے کو گزند نہیں پہنچاتا تھا پھر بھی ناری اور خاکی مخلوق کا رشتہ کوئی مناسب بات نہ تھی علاوہ ازیں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی کہ ناری مخلوق کا رویہ ہمیشہ سود مند رہے گا.....

سلطان علی بچے کو "سیانوں" کے پاس لے جا' لے جا کر عاجز آ گیا آخر تھک ہار کر وہ آستانہ فقیر پر آیا اور اپنی پیتا بیان کرنے کے بعد نظر کرم کا طلب گار ہوا۔ حضرت چند پل مراقبے میں گئے اور زیر لب مسکرانے لگے۔

"عجیب پڑھا لکھا مسخرہ جن ہے بہرحال ناجائز شے کا مطالبہ نہیں کر رہا۔ آپ لوگ دو چپڑی ہوئی روٹیاں کسی بھوکے شخص کو کھلا دیں"

سلطان علی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا "صرف دو روٹیاں؟ یہ بھی کوئی علاج ہے؟" اس نے اس علاج کی طرف توجہ ہی نہ دی' اور لڑکا بدستور جن کے زیر تسلط رہا' رفتہ رفتہ اس کی صحت گرنے لگی اب تو سلطان علی بڑا فکر مند ہوا۔ وہ پھر میاں جیئو سے نظر کرم

کا متمنی ہوا.... " آپ نے داستان الم سن کر فرمایا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ اس نالائق جن کا مطالبہ پورا ہو گیا تھا تو پھر وہ گیا کیوں نہیں؟"

حضور! یہی تو غلطی سرزد ہوئی ہم نے روٹیوں والا مطالبہ پورا ہی نہیں کیا' اب کیئے دیتے ہیں"

"جناب! میں چاہتا تو ان بے خبروں کو تباہ و برباد کر دیتا۔" اچانک لڑکا گرجنے لگا "آپ کے مقام و مرتبے کا پاس کرتے ہوئے میں نے صرف دو روٹیوں کا سوال کیا تھا۔ یہ دو روٹیاں کسی کو کھلا دیتے میں اسی روز رخصت ہو جاتا۔"

"ٹھیک ہے عزیزم! اب تشریف لے جاؤ تمہاری فرمائش پوری کر دی جائے گی" شاہ میر نے سنجیدگی سے کہا۔

سلطان علی نے حسب ارشاد بھوکے کو کھانا کھلا دیا اور لڑکے کو نجات مل گئی۔

ایک شخص کے گھر سے اس کی کنیز' امانت میں رکھی ہوئی قیمتی اشیاء چرا کر لے گئی۔ وہ بھاگم بھاگ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ "حضور! میں تباہ و برباد ہو گیا میں لٹ گیا" وہ واویلا مچانے لگا۔ آپ نے اس کی آہ و فغاں کی جانب مطلق توجہ نہ دی یہ البتہ خلاف معمول بات تھی۔ تھوڑی دیر تو وہ شخص خاموش رہا پھر از سر نو شور مچانے لگا "جناب! میری درخواست پر غور تو فرمائیں" لیکن آپ نے پھر کوئی توجہ نہ دی' حاضرین مجلس نے بھی اس بات کو محسوس کیا..... تیسری بار وہ شخص لب کشا ہونے لگا تو آپ نے اس کے بولنے سے پہلے ہی فرما دیا "تمہاری کنیز گھر پہنچ چکی ہے' جتنی محبت تم لوگ دنیاوی ساز و سامان سے کرتے ہو کاش اس کا عشیر عشیر ہی آخرت کے لئے بچا رکھتے' زر و مال کی جدائی ایک پل کے لئے برداشت نہیں کر سکتے"

گھر پہنچ کر اس شخص نے کنیز سے احوال دریافت کیا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔

"میں شیطان کے بہکاوے میں آ کر اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھی۔ شہر سے کافی دور جا چکی تھی کہ کسی نے مجھے بازو سے جکڑ لیا۔ "لڑکی آگ سے دامن بچاؤ ورنہ جل کر راکھ ہو جاؤ گی" یہ الفاظ میرے سینے میں تیر کی طرح ترازو ہو گئے اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو اس گھر کے سامنے پایا میں بھاگ کر اندر داخل ہوئی اس پل سے سپرد اضطراب ہوں"

مالک کی سمجھ میں ساری بات آ گئی' اس نے کنیز کو تسلی دی اور اس کی غلطی کو نظرانداز

کر دیا......

مردان حق کے لئے زمین کی مسافت مختصر ہو جاتی ہے۔ موجودہ دور میں اس کی سائنس توجیہ موجود ہے رفتار اگر نوری بہاؤ کے برابر ہو جائے تو علم حساب کی رو سے فاصلہ ”صفر“ وقت میں طے ہو جانا چاہیئے۔ یہ نظریہ زمان و مکان یعنی “TIME AND SPACE QUANTAM THEORUM” کہلاتا ہے اس کی گہرائی میں اترے بغیر صرف اس قدر عرض ہے کہ بزرگان دین اپنی حسب منشاء فاصلہ طے کر لیا کرتے تھے۔ بغیر سوچے سمجھے اس بات کو رد کر دینا پرلے درجے کی جہالت ہے جس کا کوئی علاج نہیں..... حاجی علی سوی ایک زاہد شب زندہ دار قسم کا انسان، حضرت میاں میرؒ کا شیدائی تھا۔ آپ بھی اس کی دلی کیفیت سے بخوبی واقف تھے۔ پیشے کے اعتبار سے تاجر تھا اور ہر پانچ برس بعد لاہور سے وطن مالوف جاتا مگر دیوانہ وار مکروہات زمانہ سے جان چھڑا کر، آستانہ درویش پر حاضر ہو جاتا۔ حاجی علی سوی کا قافلہ ایک بار اصفہان اور یزد کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ لوگ کھانے وغیرہ کا اہتمام کر رہے تھے کہ دور سے ایک گھوڑ سوار لباس فاخرہ زیب تن کیئے قافلے کی طرف آتا دکھائی دیا.... سوار قریب آیا تو حاجی صاحب اسے پہچان کر حیران رہ گئے..... وہ حضرت میاں میر تھے.....

”حضرت آپ؟“ حاجی علی بھاگ کر استقبال کو پہنچا۔

”عزیزم! تمہارا قافلہ نشیبی علاقے میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور یہ جگہ عنقریب طوفان کی زد میں آنے والی ہے۔ تم لوگوں کے پاس وقت بہت کم ہے قافلے والوں سے کہو کہ وہ اونچی جگہ منتقل ہو جائیں“ حاجی موصوف شش و پنج میں مبتلا ہو گیا اس نے قافلے کی طرف دیکھا پھر بالا پیر کی طرف نگاہ کی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شور مچاتا بھاگتا ہوا قافلے والوں کی طرف آیا اور ان کو نقل مکانی پہ اکسانے لگا۔ اکثر لوگ اپنے سامان وغیرہ کے ساتھ بلند مقامات کی طرف بھاگے..... چند بدنصیب اسی جگہ ٹھہرے رہے اور تباہ و برباد ہو گئے...... یہ حیرت انگیز واقعہ حاجی علی نے میر محمد لاہور کو خود سنایا۔

غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے ایک بار سرعام فرمایا تھا ”تقدیر سے دست و گریباں ہونا شیواء مردانگی ہے“ ایک شخص نے لخت جگر عالم نزع میں تھا وہ پریشان حال گریباں چاک درویش کی خدمت میں حاضر ہوا وہ رنج والم کی مکمل تصویر تھا۔ آپ اس کی آہ و زاری سے

متاثر ہو کر مراقبے میں گئے اور فورا" واپس آ گئے۔ چہرے پر تفکر کے آثار تھے.... اس شخص نے آپ کا چہرہ پڑھا تو ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا آپ پھر مراقبے میں چلے گئے اور کافی دیر بعد واپس آئے۔

"فقیر پر تقصیر سے جو کچھ بن پڑا کر گزرے گا" پھر مٹی کا پیالہ طلب فرمایا' پانی سے بھر کر اس پر دعا پڑھی اور پریشان شخص سے کہا "یہ جا کر لڑکے کو پلا دو اللہ خیر کرے گا" لڑکے کو رب العزت نے صحت کاملہ عطا کی تو آپ بے اختیار پکار اٹھے۔ "قادر مطلق نے فقیر کی لاج رکھ لی" لڑکا سات برس کا ہوا تو وہ شخص اپنے فرزند کو لے کر ایک بار پھر حاضر خدمت ہوا "پیرو مرشد! یہ قوت گویائی سے محروم ہو چکا ہے"

"اسے حافظ قرآن بناؤ تو بات بنے" آپ نے تبسم فرمایا۔

"حضور! یہ بول تو سکتا نہیں حافظ قرآن کیسے بنے گا؟؟"

"برخوردار ذرا ادھر تو آؤ" آپ نے لڑکے کو قریب بٹھا لیا "اب پڑھو' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لڑکے نے آپ کی اتباع میں فرفر پڑھنا شروع کر دیا۔ اہل محفل حیران رہ گئے (وہ جو مزاج فقیر سے آشنا نہیں تھے ورنہ اہل دل تو آئے ان ایسے واقعات کو دیکھتے ہی رہتے تھے)

اس لڑکے نے قرآن حفظ کیا تو اس کا باپ شاداں و فرحاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لڑکے کا تلفظ بس سننے والا تھا۔ حضرت میا میرؒ کو دلی مسرت ہوئی اور آپ نے اپنا وہ رومال جس سے وضو کے بعد چہرہ خشک کیا کرتے تھے لڑکے کے سر پر باندھ دیا

"یہ تو دستار فضیلت ہو گئی" لڑکے کا باپ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا....

"جب بھی اس کی طبیعت ناساز ہو۔ یہ رومال اس کے سر پر' اسی طرح باندھ دینا" شاہ میر نے ہدایت فرمائی۔

طاعون کے آثار نمودار ہوں تو لوگ پیشگی فاتح خوانی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سید محمد جعفرؒ کی عمر پانچ برس کی تھی جب لاہور اس وبا کی زد میں آیا۔ سید جعفرؒ بھی اس وبا کا شکار ہوئے اور کان کے نیچے گلٹی نمودار ہوئی۔ موصوف کے والد بزرگوار شاہ میر کے ارادت مندوں میں سے تھے وہ اپنے لخت جگر کو لے کر در فقیر پر حاضر ہوئے....

"ابراہیم فکر کی چنداں ضرورت نہیں" شاہ میر نے تسلی دی "تمہارا فرزند روشن جبیں ہے خلق خدا نے اس سے فیضیاب ہونا ہے" پھر بسم اللہ پڑھ کر گلٹی پر ہاتھ رکھا کان کی نچلی جگہ

ہموار ہو گئی۔ فصیل جاں سے طاعون کے جراثیم نکل گئے.....

کنوئیں کا کھاری پانی میٹھا ہو جانا ناقابل فہم سی بات ہے۔ میرک حسین خوائیؒ نے اپنی حویلی میں کنواں کھدوایا مگر بدقسمتی سے پانی کھارا نکلا ساری محنت رائیگاں گئی.... وہ کچھ سوچ کر حضرت میاں میر کے پاس آیا اور اپنی محنت برباد جانے کا رونا رونے لگا۔ آپ نے ایک کوزے میں پانی بھرا اور اسمیں اپنی انگشت شہادت ڈبو دی۔ ”عزیزم! یہ کوزہ اس کنوئیں میں انڈیل دینا رب العزت کرم نوازی فرمائے گا وہ کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا“

اس کنوئیں کا پانی ایسا ٹھنڈا میٹھا تھا کہ خلق خدا دور دور سے پیاس بجھانے آتی۔

مغل شہنشاہ شاہجہان جب پہلی بار آستانہ درویش پر حاضری کے لئے محل سے نکلا تو شہزادہ دارا شکوہ سے مخاطب ہوا۔ آج اگر شاہ میرؒ ہمیں انگور کھلائیں تو ان کی بزرگی پر میں ایمان لے آؤں گا۔“ (وہ موسم انگوروں کا نہیں تھا)

”ابا حضور! وہ واقعی خدا کی برگزیدہ ہستی ہیں“ دارا شکوہ نے کہا۔

جب شہنشاہ وقت حجرے میں داخل ہوا تو سامنے تازہ انگوروں سے بھرا ہوا خوان پڑا تھا..... ”فقیر کیا اور فقیر کی بساط کیا“ شاہ میرؒ نے مسکرا کر کہا ”مہمانوں کی خاطر تواضع سنت رسولؐ ہے اور اگر مہمانوں کی خواہش کا احترام کیا جائے تو بڑی خوش نصیبی والی بات ہے، تناول فرمایئے انگور حاضر ہیں“

بادشاہ وقت نے چونک کر شہزادے کی طرف دیکھا اور بسم اللہ پڑھ کر انگور کھانے لگا۔

کرامات میرؒ بے شمار ہیں ہم نے چند ایک کا انتخاب قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا (مشتے از خروارے کے طور پر)

قاضی سائیں دتہ کے گھرانے سے حضرت میاں میرؒ کے نقش قدم پر چل کر مقام ولائت پر فائز ہونے والی دوسری ہستی ان کی ہمشیر بی بی جمال خاتونؒ ہیں۔ آپ کے دوسرے بھائی قاضی بولن، قاضی عثمان قاضی طاہر اور ہمشیرہ بی بی بادی یہ تمام ہستیاں زہد و تقویٰ میں بے مثال تھیں مگر مقام ولائت چیزے دیگر است۔ ابتدا میں ”طریقہ شغل“ کی تعلیم موصوفہ نے اپنی دادی سے حاصل کی مگر اصل بات اس وقت بنی جب حضرت میاں میرؒ متوجہ ہوئے۔ دس برس تک، صوفہ کی ازدواجی زندگی کا ثبوت ملتا ہے جس میں آخری چار برس شوق الٰہی غالب رہا۔ خاوند کی وفات کے بعد ترک و تجرید کی زندگی اپنائی اور بحر معرفت میں غواصی کی مثال

قائم کردی۔ استغراق کا یہ عالم کہ خود حضرت میاں میرؒ فخر و انبساط سے اپنی ہمشیرہ کا ذکر کرتے‘ کشف و کرامات کا بکثرت اظہار ہوا لیکن اس سلسلے میں بھی جمال خاتونؒ نے اپنے بلند مرتبت برادر کا اتباع کیا یعنی اظہار کرامات میں ہر ممکن گریز۔ آپ کی کرامات‘ زیادہ تر اضطراری نوعیت کی ہیں مثلاً" ایک بار گھر میں مچھلی لائی گئی۔ آپ پر حالت استغراق طاری تھی "کیفیت" سے مکمل طور پر باہر تشریف آوری نہیں ہوئی تھی کہ اتفاقاً" مچھلی پر نظر پڑ گئی‘ جو مہر پر تنویر کی طرح چمکنے لگی۔ بعد ازاں آپ نے خود فیصلہ دے دیا "یہ مچھلی متبرک ہو گئی ہے" ایک طویل عرصے تک وہ مچھلی قاضی گھرانے میں موجود رہی اور خلق خدا اس عجیب و غریب مچھلی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ فیوض و برکات کا نزول بھی خوب ہوا۔ حضرت میاں میر نے فرما دیا تھا کہ "میں فلاں دن اور فلاں وقت سفر آخرت اختیار کروں گا‘ مگر تم مجھے اپنے آس پاس موجود جان کا ذکر و فکر میں مشغول رہنا"

حاکم ٹھٹھہ کے ہاں پے در پے لڑکیوں کی پیدائش ہوئی تو وہ اولاد نرینہ کو ترسنے لگا..... وہ بی بی جمال خاتون کی خدمت میں حاضر ہوا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ سگ دنیا ہڈی کا طلب گار تھا مگر "مانگنے" کے طریقے سلیقے سے واقف تھا۔

"بولتا کیوں نہیں یہ بت کی طرح کیوں کھڑا ہے؟" بی بی جمال خاتون نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"ہر بار گھر میں "شمع" روشن ہو جاتی ہے۔ اب "چراغ" کا طلب گار ہوں" حاکم نے کاسئہ گدائی سامنے کر دیا۔ "جب تک اولاد نرینہ کی نوید نہیں ملے گی خدمت میں اسی طرح کھڑا رہوں گا"

"دھمکیاں دے رہا ہے؟" جمال خاتون نے قہر آلود نظروں سے دیکھ کر فرمایا۔

استغفراللہ! ناگوار خاطر الفاظ زبان پر لانے سے پیشتر‘ زیر زمین سونے کو ترجیح دوں گا‘ میں نے سمندر سے صرف ایک قطرے کی تمنا کی ہے" حاکم وقت بدستور سر جھکائے کھڑا رہا۔ جمال خاتون نے سوئے آسمان دیکھا‘ نگاہوں میں کرم نوازی کے آثار پیدا ہوئے تو حاکم وقت کی جان میں جان آئی۔

"جاؤ! جا کر پانچ صد غرباء مساکین کے کھانے کا بندوبست کرو" دربار ولائت سے حکم ہوا

"حکم ہو تو پندرہ صد کا اہتمام کر دوں؟" حاکم وقت بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

"چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ‘ اب تم جا سکتے ہو"

زمانہ گواہ ہے کہ حاکم ٹھٹھہ کے ہاں اوپر تلے پانچ لڑکے پیدا ہوئے۔ پیاسے کو سمندر سے ایک نہیں پانچ قطرے مل گئے۔ بی بی **جیئو** نے جلال خاموشؒ سے بھی فیض باطن حاصل کیا 27 ربیع الاول بروز منگل 1057ھ اس زاہدہ عابدہ نے سفر آخرت اختیار کیا۔

احباب و اصحاب ہوں، مریدان باصفا، یا خلفا اگر کسی ہستی کو حضرت میاں میر کے قریب ترین قرار دیا جائے تو وہ **ننھے** شاہؒ دیوان قادری کی ذات بابرکات ہے۔ میاں **جیئو** ان کو میاں ننھا کہہ کر پکارتے تھے اور قریبی احباب بابا ننھا۔ مرید و مرشد کے روابط سمجھنے کے لئے چشم تصور میں امیر خسرو کو لائیے۔ جو رشتہ امیر خسرو کا شیخ نظام الدین اولیاء سے تھا وہی **ننھے** شاہ کا حضرت میاں میر سے تھا یعنی

سورج تھا وہ تو میں بھی عطارد نصیب تھا
اس کے نظام **شمش** میں سب سے قریب تھا

والی بات تھی۔ ایک معمولی سا فرق البتہ ضرور ہوا کہ شیخ نظام الدین، امیر خسرو سے پہلے رحلت فرما گئے اور مرید و عاشق زار کو سپرد اضطراب کر گئے۔ دل کی ویرانیوں اور فصیل جاں میں اضطراب کی اٹھنے والی لہروں کو امیر خسرو نے صرف ایک شعر میں بند کر دیا جو زبان زد خاص و عام ہوا۔

گوری سوئے سج میں مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

اور اسی آتش عذاب سے جل کر خسرو راکھ ہو گئے۔ ادھر **ننھے** شاہ نے ملک عدم سدھارنے میں پہل کی اور میاں میر کو بصد حسرت و یاس کہنا پڑا ”ہائے میرا ننھا‘ گھر کا فقر بھی ساتھ ہی لے گیا“ اور آنکھوں سے اشک رواں کی نہر جاری تھی۔

میاں موصوف کے اجداد سرہند کے رہنے والے تھے لیکن آپ کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔ بچپن میں آستانہ میر پر حاضر ہوئے اور عمر بھر کا رشتہ استوار ہو گیا۔ علوم ظاہری کے لئے کسی کے آگے زانوے **تلمندتہ** نہ کیا گویا امی تھے مگر علم لدنی یہاں تک حاصل کیا کہ لوح محفوظ کی تحریر تک پڑھ سکتے تھے۔ نباتات و جمادات بھی آپ سے ہم کلام ہوتے حضرت میاں میر کے بعد **ملا محمد مبیال کوٹی** کی ہم جلیسی پسند تھی۔

تعلیم و تربیت کے بعد حضرت میاں میر اپنے مریدوں کو خود سے جدا کر دیا کرتے تھے مگر

شاہ نتھاؒ کو اپنے سے جدا کرنا گوارا نہ تھا۔ شب و روز کی ہم جلیسی کا یہ اثر ہوا کہ میاں موصوف استغراق کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ سکران کی یہ کیفیت کہ بعض اوقات ظاہری واجبات ترک ہو جاتے جنگلوں ویرانوں یا کسی قبر کے سرہانے جا بیٹھتے اور محو راز و نیاز ہو جاتے۔ ایک بار مسلسل تین روز اسی استغراق میں ایک قبرستان کی شکستہ دیوار پر بیٹھے تھے میاں جیئو مراقبے میں گئے اور صورتحال سے آگاہی کے بعد ایک درویش سے کہا ”نتھا فلاں قبرستان کی دیوار پر مسلسل تین روز سے بغیر کچھ کھائے پیئے بیٹھا ہے۔ وہ اس وقت ”عالم حیرت“ میں ہے جاؤ اسے بلا لاؤ“

تاریخ تصوف میں یہ پہلی مثال ہے کہ مرید باصفا کے کارہائے نمایاں مرشد کی زبانی‘ زینت کتب بنے ہوں۔ میاں جیئوؒ نے اپنے طلب گار کا قصہ یوں بیان کیا۔ ”جونپور سے ایک درویش میاں نتھا سے ملاقات کا اشتیاق لے کر آیا“

”تو کون ہے اور حاضری کا سبب؟“ میاں نتھا نے پوچھا۔

”میں جونپور سے کالے کوسوں کی مسافت طے کر کے‘ آپ کی زیارت کرنے حاضر ہوا ہوں“

اچھا! اب زیارت کر لی‘ جاؤ اپنی اور میری مسافرت کھوٹی نہ کرو“

”میں تو جناب کے ”احوال“ دیکھنے کا تمنائی ہوں“ جونپوری درویش نے کہا۔

”احوال یا تماشہ دیکھنے آیا ہے“

”چشم تماشہ کی تسکین بھی مطلوب ہے“ جونپوری فقیر بھی اہل دل تھا۔

”سن میرے بھائی‘ تیری چشم تماشا چندھیا جائے گی اور بصیرت و بصارت ساتھ نہ دے سکیں گی۔ اس لئے کہ رب العزت نے عالم جبروت ‘لاہوت اور عالم ملکوت کی چابیاں اپنے اس عاجز بندے کو عطا کر رکھی ہیں۔ میں اپنی حسب منشاء ہر عالم کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہو سکتا ہوں اگر قوت برداشت رکھتے ہو تو بسم اللہ..... آؤ میرے ساتھ“

”حضرت! یہ تاب یہ مجال‘ مجھ میں کہاں؟“ جونپوری مہمان کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

”اچھا اب زیارت ہو گئی‘ احوال دیکھ سن لیا‘ برائے کرم تشریف لے جائیں“ یہ کہا اور میاں نتھا استغراق میں چلے گئے۔

حضرت میاں میر نے اپنے مرید خاص کی تربیت جس انداز سے فرمائی تھی اس پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ ”بلند پروازی“ ناقابل فہم نہیں رہتی۔ سر محفل ایک بار میاں نتھا نے

مرشد سے پوچھا "ہماری تمام دعائیں مقام قبولیت پر فائز کیوں نہیں ہوتیں؟ جب کہ رب العزت نے خود فرمایا ہے "**ادعونی استجبلکم**" (تم دعا کرو میں قبول کروں گا۔)

"مانگنے کا طریقہ سلیقہ اور اس کی کچھ شرائط ہوتی ہیں" حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ "الفاظ کے وزن اور اثر سے انکار کی گنجائش نہیں۔ کفر تک جیسی بیماری کا علاج کلمہ طیبہ سے ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب بھکاری بھیک طلب کرتا ہے تو الفاظ مناسب ہونے چاہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ دعا کا ہر لفظ صدق دل سے نکلے، دوسری جس زبان سے وہ لفظ ادا ہو وہ لقمہ حرام سے نا آشنا ہونی چاہئے۔ حضور قلب سے مانگی ہوئی دعا جب لقمہ حرام سے نا آشنا زبان تک آتی ہے تو شرف قبولیت ضرور حاصل کرتی ہے حضور قلب سے مراد یہ ہے کہ دعا مانگتے وقت، بھکاری کے دل میں ماسوا کا تصور نہیں ہونا چاہئے۔"

تربیت کے آغاز ہی میں یہ بات، حضرت میاں میر نے میاں ننھا کے ذہن میں اچھی طرح نقش کر دی کہ "جن ہستیوں کے لئے مقام ملکوت کے دروازے وا ہونا ہوتے ہیں، ان کو رب العزت جبیں شناسی کا ملکہ عطا کرتا ہے۔ یہ گویا حرف آغاز ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ لوگوں کی جبینیں پڑھ سکتے ہیں کہ کون خوش بخش اور کون بد بخت ہے۔ ظاہر ہے خوش بختوں کی مجلس کا انتخاب آسان ہو جاتا ہے۔ اصل کہانی کا آغاز اس کے بعد ہوتا ہے۔ پھر عالم ملکوت کے مسافر سے غیر مرئی مخلوق کے علاوہ نباتات و جمادات ہم کلام ہوتے ہیں اور اسے "مختلف ترغیبات" میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان ترغیبات میں آ جانے والے کی منزل آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔"

اس بات کا عملی ثبوت میاں ننھا کو اپنی زندگی ہی میں مل گیا۔ ایک "جن" جو غوث الاعظم کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا ننھے شاہ سے ہم کلام ہوا "میرے پاس اتنا بڑا خزانہ ہے جو روئے زمین پر کسی کے پاس نہ ہو گا۔ اس میں سے جس قدر درکار ہو لے لو"

"یہ خزانہ میرے کس کام کا؟" ننھے شاہ نے منہ توڑ جواب دیا "حضور اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق یہ بس دم آخر تک ساتھ دے گا اور دائمی زندگی کا آغاز تو اس "دم آخر کے بعد سے ہو گا۔ کوئی ایسی شے ہو جو اس زندگی میں میرے کام آ سکے تو پیش کرو بصد شکریہ قبول کروں گا"

پھر ایک باغ میں میاں موصوف ریاضت و عبادت کے لئے پہنچے تو ایک درخت سے آواز آئی "ذرا قریب تو آؤ..... ایک سودمند بات سنتے جاؤ"

"جی فرمائیے کیا حکم ہے؟"

"اس جن کی بات نظرانداز کر کے تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا مجھے حاصل کرو میری ایک شاخ قلعی میں ڈالو گے تو وہ چاندی بن جائے گی ذرا سوچو کتنی فائدے والی بات ہے؟"

"اور روز محشر اس چاندی کا حساب کون دے گا؟" میاں نتھا نے اس کی پیش کش رد کر دی......

قریب ہی ایک اور شجر سایہ دار کھڑا تھا اس نے پکارا اور کہا "مجھے پگھلے ہوئے تانبے میں ملاؤ گے تو وہ خالص سونا بن جائے گا"

میاں نتھے شاہ کو مرشد کی باتیں یاد آ گئیں اور وہ ان ترغیبات سے دامن بچا کر نکل گئے۔

ایک روز ایک گنبد بھی آپ سے ہم کلام ہوا "باہر مت جانا طوفان میں گھر جاؤ گے" پھر ایک ایسا وقت آیا کہ میاں نتھا سے کرامات کا ظہور ہونے لگا مگر مرشد کے حسب ارشاد ان کے اظہار میں احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے۔

ملا محمد سیالکوٹی، میاں نتھے شاہ اور چند دوسرے احباب "محفل میرؒ" میں تشریف فرما تھے یہ مجلس حجرے سے باہر سایہ دیوار تلے منعقد تھی۔ اچانک آسمان پر گھٹائیں چھا گئیں طوفان باد و باراں کا آغاز ہوا تو دل جمعی میں فرق سا آ گیا

"دوستو! اب اندر چلنا چاہئے" شاہ میرؒ نے احباب سے کہا۔

"اجازت ہو تو اس طوفان کو یہاں سے غائب کر دوں، مطلع صاف ہو جائے گا اور ہمیں اندر نہیں جانا پڑے گا" میاں نتھے شاہ نے مرشد سے کہا۔ خیال یہی تھا کہ مرشد اور احباب کو زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

"روئے تیلی کی اولاد! نوبت بہ ایں جا رسید کہ اب تو کرامتیں دکھانے لگا ہے خود نمائی کے بعد خود فروشی کا خیال ہے؟ میاں میرؒ جو اپنے یار غار کے ناز اٹھانے میں مشہور تھے سخت الفاظ میں سرزنش کرنے لگے۔ واضح ہو میاں نتھے شاہ اس دور میں بلند مرتبت درویش تھے اور یہ سرزنش، سرعام ہوئی تھی پھر میاں میرؒ کو خود ہی دل شکنی کا احساس ہوا اور الفاظ میں نرمی آ گئی۔

عزیزم! اگر ہم اٹھ کر حجرے میں چلے جائیں تو حرج ہی کیا ہے؟ اس کارخانہ قدرت کا چلانے والا، قادر مطلق ہے۔ محمود کا ہر فعل "محمود" ہی ہوتا ہے۔ ہم اسے ناپسند کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ قضائے الٰہی پر راضی برضا رہنا ہی عقل مندی ہے اور اسی میں عافیت ہے..... خبردار مداخلت بے جا کا ارتکاب مت کرنا"

بات حاضرین کی سمجھ میں آ گئی یہ اظہار کرامات میں احتیاط کی بہترین مثال تھی۔ جہانگیر کا عہد حکومت تھا 1027ھ بمطابق 1618ء ان دنوں لاہور کا صوبیدار نواب قاسم خان تھا۔ میاں نتھاؒ کی طبیعت قدرے علیل تھی حجرے کے اندر حالت استغراق میں تھے اچانک میاں میرؒ نے ایک درویش سے فرمایا۔ ”ذرا اندر جا کر دیکھو میاں نتھا موجود ہیں؟“

”حضور! وہ اندر موجود ہیں میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں“

”اس بار ذرا غور سے دیکھو“

درویش اندر پہنچا‘ ٹٹول کر دیکھا تو میاں **نتھے** شاہ کا جسد خاکی تو موجود تھا مگر اندر کا چہچہانے والا پنچھی پرواز کر چکا تھا اور پنجرہ خالی رہ گیا تھا۔ دوران تدفین میاں **جیئو** آبدیدہ تھے یہی میاں **نتھے** شاہ ہیں جن کی قربت میں حضرت میاں میرؒ نے اپنی آخری آرام گاہ کی وصیت کی تھی۔

حیات میاں میرؒ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ روشن پہلو جو کھل کر سامنے آتے ہیں ان کا متن پیش خدمت ہے۔

خشیت الٰہی‘ ہر خیال پر مقدم تھی۔ کم از کم ستر بار دعائے مغفرت کرتے ذکر و فکر کے لئے جنگلوں بیابانوں اور باغوں کا انتخاب کرتے‘ عبادت اوڑھنا بچھونا رہی۔

عشق رسولؐ میں ایسے غوطہ زن ہوئے کہ تا عمر ابھرنے کا خیال تک نہ آیا‘ اتباع سنت کی سختی سے پابندی اسی عشق کا نتیجہ تھی.... نماز با جماعت کی ادائیگی تہجد کا اہتمام اور روزوں کا بطور خاص اہتمام زندگی کا اصول رہا۔

غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایسے عاشق زار کہ بغیر وضو ان کا نام زبان پر نہیں لاتے تھے۔

نذرانہ قبول کرنے سے اجتناب فرماتے اس میں مقام و مرتبے کی کوئی قید نہ تھی۔ رزق حلال‘ کم خوری‘ کم خوابی اور کم گوئی کو ہر پل ملحوظ خاطر رکھتے۔

خلق عظیم کے مالک تھے۔ خرقہ گودڑی پہننے سے گریز کرتے اور ترک و تجرید‘ پسندیدہ تھے۔ قناعت کا یہ عالم کہ سنگ خشت اور زر و جواہر کی حیثیت نگہ درویش میں ایک جیسی تھی۔

لباس میں سادگی مگر پاکیزگی کا خاص خیال رکھتے۔ تکیہ کلام تھا ”صوفی وہ ہے جو ہو بھی‘ تو نہ

خلفائے میاں میرؒ کا "فرداً فرداً" ذکر تو واقعی امر محال ہے (اور ان میں سے چند ایک کا انتخاب دشوار تر) میاں نتھے شاہ کے علاوہ ہم صرف ایک خلیفہ میاں میر کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام اندازہ کر سکیں کہ یہ کنج تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والے بوریا نشین علم و آگہی کے کس مقام پر فائز تھے۔

ملا خواجہ بہاری کا شمار میاں میرؒ کے جلیل القدر خلفاء میں ہوتا ہے۔ حاجی پورہ پٹنہ صوبہ بہار کے باشندے تھے۔ علوم ظاہر کی تکمیل ہوئی تو تشنگی مزید بڑھ گئی پٹنہ ہی کے چھوٹے سے قصبے گودھ پور میں شیخ جلال الدین اولیاء کی درس گاہ، علم و آگہی کا مینار نور تھی۔ خواجہ صاحب نے اسی درس گاہ میں شرکت فرمائی مگر شدت طلب میں کمی واقع نہ ہوئی۔ آفتاب میاں میر طلوع ہو چکا تھا لہٰذا لاہور تشریف لے آئے اور پھر اسی در کے ہو رہے۔ مرشد سے دلی لگاؤ کا یہ عالم کہ جب یہ پان یا لونگ وغیرہ چبا کر پھینک دیتے تو خواجہ بہاری اسے اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔ وصال مرشد کے بعد اپنے اس عمل کی تشریح کی "اسی پان کے پھوگ کی برکت سے میری یاداشت غضب کی ہو گئی۔ مثنوی مولانا روم، لحمات لوائح، فصوص الحکم، احادیث اور قرآن پاک کی تفہیم آسان ہوئی، میری مہارت تامہ کا یہ عالم ہو گیا کہ بین السطور مفہوم بھی آشکار ہونے لگے۔

کشف و کرامات کا ظہور خواجہ بہاری سے بکثرت ہونے لگا۔ غازی خاں کے ہاں عرس میں شریک تھے کہ مسئلہ توحید زیر بحث آ گیا۔ آپ خاموشی سے علمی موشگافیاں سنتے رہے۔ سردی جوبن پر تھی صحن میں آگ کا الاؤ جل رہا تھا "آپ حضرات توحید کے سلسلے میں قلیل و قال سے گریز کیا کریں" خواجہ بہاری نے سرسری لہجے میں کہا۔

"خواجہ صاحب! یہ علمی باتیں ہیں آپ ٹھہرے درویش" کسی نے طنز کا تیر چلایا

"محترم! علم ظاہری کی انتہا درویشی کا آغاز ہوتی ہے مگر میں بحث میں الجھنا نامناسب خیال کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے" یہ کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے الاؤ میں جا بیٹھے" وہ "قال" تھا یہ "حال" ہے" سرد الاؤ درویش نے مسکرا کر کہا۔ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے....

لاہور ہی میں آپ اپنے عقیدت مند ملا فاضل کے ہاں مقیم تھے۔ خاتون خانہ سامان خورد و نوش لے کر درویش کے کمرے میں داخل ہوئی تو شور مچاتی باہر نکل آئی۔ "خواجہ صاحب کو کسی نے قتل کر دیا..... ٹکڑے ٹکڑے کر دیا" یہی دو فقرے دوہرائے جا رہی تھی۔ اتفاق سے

خاتون خانہ کے شوہر نامدار تشریف لے آئے۔

"خدا کی بندی ہوش میں آؤ کیا کہہ رہی؟" ملا فاضل نے خاموش ہو جانے کی تلقین کی

اندر خواجہ صاحب کے ٹکڑے پڑے ہیں۔ سر الگ، دھڑ الگ، ایک بازو ادھر ایک بازو ادھر"

ملا فاضل واقف حال تھے۔ وہ اندر داخل ہوتے تو خواجہ بہاری مراقبے میں بیٹھے تھے۔ "اب جا کر دیکھ، خواجہ صاحب کس حال میں ہیں؟" ملا فاضل نے پریشان حال بیوی سے کہا۔ "ان معاملات" کو صبر و تحمل سے دیکھنا چاہئے۔"

1051ھ بمطابق 1642ء شہنشاہ ایران، میرزا صفی نے قندھار پر حملہ کر دیا۔ شہزادہ دارا شکوہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا "حضرت میاں میرؒ کے آپ جانشین ہیں لہٰذا آپ ہی کے پاس آیا ہوں، قندھار پر والئی ایران نے حملہ کر دیا ہے۔"

شہزادے! حد ادب۔ ان خرافات کے لئے غلامان میرؒ ہی کافی ہیں اور اس میرزا ایرانی کی کیا مجال کہ قندھار کا رخ کرے، وہ اپنی خیر منائے"

چند روز بعد خبر آئی کہ قندھار پر حملہ کرنے والا زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا ہے....

ملا خواجہ بہاری نے جب لاہور میں تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا تو چنیوٹ سے ایک طالب علم نواب سعد اللہ خان بھی اس درس گاہ میں شریک ہوا۔ خواجہ موصوف جانے کس حال میں بیٹھے تھے طالب علم کو دیکھتے ہی فرمایا۔ "آیئے نواب سعد اللہ خان وزیر اعظم صاحب" گویا درویش نے سعد اللہ کو وزارت عظمی کا قلم دان سونپ دیا۔ (اصل میں شاہ برہان بخاریؒ نے سعد اللہ خان کو خواجہ صاحب کا دامن تھام لینے کی تلقین کی تھی۔ شاہ برہانؒ کا مزار، لاہور بیرون یکی دروازہ کوچہ پیر برہان، سرکلر روڈ پر واقع ہے)۔

نواب سعد اللہ خان بعد میں، درویش کی پیشین گوئی کے عین مطابق شاہجہان کے وزیر اعظم بنے۔ نواب موصوف کو لاہور سے دلی انس تھا۔ ایک روایت کے مطابق ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نواب سعد اللہ اور امام ربانی مجدد الف ثانی لاہور میں ہم مکتب رہ چکے تھے۔ لاہور اندرون موچی گیٹ نواب نے دو حویلیاں بھی تعمیر کروائی تھیں حویلی میاں خاں اور پتھروالی حویلی۔ زمانہ طالب علمی میں نواب موصوف کی رہائش مسجد وزیر خاں کے قریب ایک حجرے میں تھی اور وزارت عظمی تک رسائی کی داستان بھی بڑی عجیب و غریب ہے۔

تکمیل تعلیم کے بعد سعد اللہ خاں دہلی منتقل ہو گئے اور نواب آصف خاں کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے لگے۔ دربار شاہجہان تک رسائی تو نہ تھی مگر درباری معاملات سے باخبر ضرور رہتے۔ ایک بار دربار کے سارے دانش ور ایک مسئلے کے حل میں بری طرح ناکام ہو گئے مگر خواجہ بہاری کے شاگرد رشید نے وہ مسئلہ بطریق احسن حل کر دیا۔

شاہ ایران نے دربار شاہجہان میں مکتوب ارسال کیا تم صرف ہندوستان کے شہنشاہ ہو اپنے آپ کو شاہ جہان کیوں کہتے ہو کیا ہندوستان، سارے جہان کے برابر ہے؟" نواب آصف خان بھی اس الجھن میں گرفتار تھا...... مزاج شاہی کا کیا اعتبار کب برہم ہو جائے اور کون اس کی زد میں آ جائے۔ نواب سعد اللہ خان کو خبر ہوئی تو اس نے ایک مختصر سا خط اس کے جواب میں لکھا اور مہر شاہی ثبت کر کے ایران روانہ کر دیا.... اس کے جواب میں شاہ ایران نے شاہجہان کے نام ایک طویل مراسلہ تحریر کیا۔ جس میں درج تھا "اپنے خط کا جواب لکھنے والے ہندی دانش ور کو ہم سلطنت ایران کا وزیر اعظم مقرر فرماتے ہیں"

شاہ جہان نے تحقیق کی تو نویسندہ سعد اللہ خان نکلا۔ دربار میں فوری طلبی ہوئی "سارا ماجرا بلا کم و کاست بیان کیا جائے" فرمان شاہی صادر ہوا۔

"ظل سبحانی، شاہ ایران نے لکھا تھا کہ شہنشاہ ہند نے شاہجہان کا لقب کیوں اپنایا؟" سعد اللہ نے موئدب لہجے میں کہا "میں نے جواب دیا کہ لفظ ہند اور جہان کی عددی قیمت مساوی ہوتی ہے (ہ-ن-د-=59 اور ج، ہ، ا، ن ں 59) لہٰذا اگر ہم نے شاہ جہان کا لقب اختیار کر لیا تو ہم حق بجانب ہیں"

اس تشریح سے شاہ جہان گویا پھڑک اٹھا۔ خلعت فاخرہ سے نوازا سلطنت ہند کا صد الصدور متعین کیا پھر قلمدان وزارت عظمےٰ سونپ دیا۔

گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس دانش بھرے چراغ میں روشنی حضرت میاں میرؒ ہی کی تھی۔ خواجہ بہاری کا وصال 1632ء عہد شاہ جہان میں ہو۔ مزار میاں میر اور قصبہ میاں میر کے درمیان، ریلوے لائن کے قریب ایک عظیم الشان گنبد والا مزار ہے جو خلفائے میرؒ کی تربتوں میں سب سے خوبصورت ہے۔ یہی خواجہ بہاری کی آخری آرام گاہ ہے۔ آبادی کے سیلاب کے باوجود مزار کا وقار تا دم تحریر قائم و دائم ہے۔

مدینتہ الاولیاء لاہور میں حضرت میاں میر کو انار کلی والے حجرے میں قیام پذیر ہوئے

ساٹھ برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اسہال کا عارضہ لاحق ہوئے پانچ روز گزر چکے تھے ربیع الاول کی سات تاریخ تھی 1045ھ بمطابق 1635ء شاہ جہان کو تخت دہلی پر متمکن ہوئے سات برس ہو چکے تھے۔ چیدہ چیدہ خلفاء و مریدان باصفا آفتاب عالم تاب کی ضیا پاشیوں کو عارضی طور پر مدھم ہوتے ملاحظہ کر رہے تھے۔ عالم فانی میں غروب ہونے والا سورج عالم جاودانی میں طلوع ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک روز پیشتر یعنی سوموار والے دن حاکم لاہور وزیر خان، ایک حاذق طبیب کے ہمراہ ملاقات کو حاضر ہوا تھا۔

"فقیر لمبے سفر کی تیاری میں مصروف ہے ملاقات کی فرصت ہے نہ ضرورت" درویش نے کچھ اسی قسم کا جواب دیا تھا۔

حضور! وہ صرف زیارت کا خواہش مند ہے۔ "شیخ محمد لاہوری، حاجی محمد بیانی، خادم خاص نور محمد سب نے بیک زباں استدعا کی

"اچھا آ جائے مگر کم سے کم وقت برباد کرے" درویش کو آخری لمحات میں بھی دل شکنی مطلوب نہ تھی۔

وزیر خاں اور حاذق طبیب حاضر ہوئے۔ "اجازت ہو تو حکیم کوئی دوا تجویز کرے؟" وزیر خاں نے بصد احترام پوچھا

"اب طبیب مطلق ہی کافی ہے" یہ کہہ کر حضرت نے سب کو رخصت فرما دیا۔

یوم آخر یعنی منگل والے روز بے تابی دل حد سے تجاوز کر گئی نور محمد نے سبب دریافت کیا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ طائر روح اڑنے کے لئے پر تول رہا ہے اور یہ بیقراری اسی بنا پر ہے۔

"ایک طویل عرصے بعد دیدار یار نصیب ہونے کی گھڑی ہے دل بیقرار نہ ہو تو اور کیا کرے" میاں جیئو نے سب سوالات کا ایک جامع جواب عطا کیا۔ اسی بے قراری میں چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کسی کا استقبال کر رہے ہوں۔ نور محمد نے سہارا دینے کی کوشش کی، آپ نے ہاتھ جھٹک دیا اور فرش زمین پر برہنہ پا ننگے سر بر عاجز و مسکین غلام کی طرح کھڑے ہو گئے "الصلواۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" صاف الفاظ میں دو بار کہا جو سامعین نے بخوبی سنا۔ چشم بصارت نے دیکھا، چشم بصیرت نے سمجھا اور فہم ادراک نے پہچانا۔ پھر چارپائی پر دراز ہو گئے۔ میاں شیخ لاہوری نے بغور دیکھا تو دہن مبارک آہستہ آہستہ جنبش میں تھا۔ شیخ

موصوف نے آخری الفاظ سمجھنے کی کوشش کی دو مرتبہ اللہ ' سنائی دیا پھر سناٹا چھا گیا۔۔۔ سکوت مرگ اسی کا تو نام ہے۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون" سب نے بیک زبان کہا۔

حسب وصیت موجود انار کلی بازار کے آغاز سے جنازہ اٹھایا گیا اور میاں **ننھے** شاہ حاجی سلیمانؒ، شیخ ابوالکلامؒ حاجی **مصطفٰے** کلالؒ وغیرہ کے قریب دفن کر دیا گیا۔ محفل احباب و اصحاب کی رونق قائم رہی۔ لاہور میاں میر چھاؤنی ویسے تو مشہور و معروف مقام ہے مگر ایک اجنبی کے لئے عرض ہے کہ مزار مبارک' دھرم پورہ چوک (لاہور) کے قریب انفنٹری روڈ پر موجود ہے۔ جس کی تعمیر کا آغاز دارا شکوہ نے کیا اور تکمیل اورنگ زیب عالمگیر نے کروائی۔

یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ وصال میاں میرؒ کے بعد دارا شکوہ جیسا عقیدت مند مسکینتہ الاولیاء کا مصنف شہباز تصوف و طریقت ایک طویل عرصے تک زندہ رہا۔ دور شاہجہانی کا عروج تھا اور وہ وارث تاج و تخت کی حیثیت سے لامحدود اختیارات کا مالک بھی تھا۔ پھر اس نے بیش قیمت سازو سامان **مثلاً** "سنگ سرخ' سنگ مرمر آرائش کا چوبی سامان وغیرہ بھی اکٹھے کیئے مگر ایک عظیم الشان خانقاہ کی تعمیر ممکن کیوں نہ ہو سکی۔ جواب سادہ سا ہے "اس میں رضائے درویش کار فرما تھی" حضرت میرؒ نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ "میری تدفین شور زدہ زمین میں ہونی چاہیے تاکہ ہڈیوں کا نام و نشان تک مٹ جائے۔" پھر قبر پرستی کی مذمت میں فرمایا "میری قبر کو بطور دوکان سجا کر نہ بیٹھ جانا اور ہڈیوں کا کاروبار شروع نہ کر دینا....." تاج محل بنا' لال قلعہ و تخت طاؤس تیار ہوئے مقبرہ جہانگیر شالامار کیا کچھ تعمیر نہ ہوا مگر نمود و نمائش کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے والے کا مزار سادگی کی منہ بولتی تصویر ہی رہا۔ شاید اس میں بھی درویش کی رضا شامل ہے کہ آج' تادم تحریر مزار میاں میر پر ایک سنگی کتبہ 'ایک سادہ سی تختی تک نصب یا آویزاں نہیں۔ ایک اجنبی کو پوچھنا پڑتا ہے "کیا یہ واقعی مزار میاں میرؒ ہے؟؟"

موجودہ امام مسجد مولانا ممتاز سے جب راقم نے سنگی کتبے کی عدم موجودگی کے سلسلے استفسار کیا تو انہوں نے مزار مقدس کی لائبریری کے ایک گوشے میں پڑے سنگی کتبے کی طرف اشارہ کیا "کتبہ تو تیار ہے مگر نصب نہیں ہو سکا"

"مگر اس پر تو کچھ بھی تحریر نہیں" راقم نے حیران ہو کر ترشے ہوئے پتھر کو دیکھا۔

"اصل میں حضرت میاں میر کی تاریخ پیدائش کا فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ فیصلہ ہو جائے تو بات

ہے” امام صاحب نے راقم کو لاجواب کر دیا..... ہے نا عجیب بات

شاہجہان کے بعد اورنگ زیب عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس نے عظیم الشان مقبرے کے لئے جمع شدہ سازوسامان بادشاہی مسجد کی تعمیر میں استعمال کروایا۔ مزار کی چار دیواری پہلے ہی مکمل ہو چکی تھی روضہ مبارک خانقاہ مسجد وغیرہ کا نامکمل کام اس کے حکم سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ وصال میاں میرؒ کے بیس بائیس برس بعد تک اگر داراشکوہ کو مجمع البحرین اور سر اکبر” جیسی کتب لکھنے سے فرصت مل جاتی تو شاید عظیم الشان مزار کی تکمیل ہو جائی مگر اصل بات وہی ہے کہ درویش کی رضا نہ تھی۔ ایک لاہوری محقق کا خیال یہ بھی ہے کہ مزار کی تکمیل عہد شاہجہان میں داراشکوہ نے کروا دی تھی اور مزار میاں میر کا سازوسامان شاہی مسجد لاہور کی تعمیر میں استعمال ہونے والا قصہ فرضی ہے (مگر راقم کو اس سے اتفاق نہیں)

اورنگ زیب عالمگیر کے سفر آخرت اختیار کرتے ہی مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا جس کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد جب لاہور ”سکھا شاہی“ کی زد میں آیا تو لاہور کی مساجد، مقابر اور خانقاہوں میں نصب شدہ قیمتی پتھر اکھیڑ لئے گئے دربار صاحب امرتسر، رام باغ امرتسر اور بارہ دری حضوری باغ کی زیب و زینت مقصود تھی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی نگاہ ناز، مزار میاں میرؒ کی جانب اٹھی۔ موصوف اپنی من پسند گھوڑی ”لیلیٰ“ پر سوار ہو کر مزار کی حدود میں داخل ہوئے اور تمام سنگ سرخ و سفید اکھیڑ کر امرتسر پہنچانے کا حکم صادر کیا۔ اس حکم کی تفصیل تک کتب میں محفوظ ہے یعنی فلاں پتھر فلاں جگہ لگایا جائے اور فلاں، فلاں جگہ وغیرہ وغیرہ۔ حکم صادر فرمانے کے بعد اپنی چہتی گھوڑی ”لیلیٰ“ کی جانب متوجہ ہوئے تو اس نے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا۔ لوگ حیران اور رنجیت سنگھ پریشان ہوا۔ گھوڑی پالتو تھی تعلقات پرانے تھے مگر ترک تعلقات والی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دم دلاسے دیئے گئے پچکارا گیا آخر رنجیت سنگھ مہاراج گھوڑی پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے..... اس کے بعد والی داستان ذرا دل خراش قسم کی ہے.1.....

جونہی مہاراجا گھوڑی کی پشت پر بیٹھا وہ سیخ پا ہو کر الف ہوئی، سوار نے سنبھلنے کی بہتیری کوشش کی مگر سب کوششیں رائیگاں گئیں اور وہ پہلو کے بل زمین پر آ رہے..... یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی۔ گھوڑی اور سوار ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ تھے..... اور نہ مہاراجا اناڑی تھے مانے ہوئے شاہسوار تھے...... بہر حال یہ سوئے اتفاق تصور کیا گیا اور راجا موصوف نے

پھر کوشش کی۔ اس بار گھوڑی نے نہ صرف سوار کو دور پٹخ دیا بلکہ ایک عدد دولتی بھی جھاڑ دی۔ ایک تو سوار سر کے بل گرا، رہی سہی کسریوں پوری ہوئی مہاراجا رنجیت سنگھ "وقفہ تسلیم و رضا" میں تشریف لے گئے۔

عالم ہوش میں آئے تو بے اختیار پکار اٹھے۔ "بادشاہوں کے پیر کی توہین مت کرو، مزار کے پتھروں کو ہاتھ مت لگانا، ہمیں کافی سزا مل چکی ہے" چوٹوں کو سہلاتے برہنہ پا مزار پر تشریف لائے ناصیہ فرسائی کے بعد مبلغ پانچ سو روپے سکہ رائج الوقت، حبیب خاص سے نذرانہ پیش کیا۔ توبہ کی، مزار مقدس کی مرمت اور سفیدی کے احکام جاری کیئے۔ خلیفہ نورالدین اپنے درباری کو یہ فرائض سونپے اور لیلیٰ پر سوار ہو کر مزار سے رخصت ہو گئے۔ لیلیٰ بھی اب رام ہو چکی تھی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ جب تک زندہ رہے یہ نذرانہ باقاعدگی سے ادا کرتے رہے ہر سال عرس کے موقع پر مہاراجا کی تقلید میں امراء و وزراء بھی مزار پر حاضری دینے لگے تو مجاوروں کی گویا چاندی ہو گئی.....

راجا موصوف نے مزار میاں میر کو تو بخش دیا (یا منہ کی کھائی) مگر ملا شاہؒ بدخشانی، حضرت خواجہ بہاریؒ اور شہزادی نادرہ بیگم کے مزاروں سے تمام قیمتی پتھر اتروا کر امرتسر روانہ کر دیئے۔

مقبرے کا چبوترہ (26 قدم مربع) سنگ مرمر سے تعمیر شدہ ہے اور آمدورفت کے لیئے جنوبی دروازے کی چوکھٹ سنگ سرخ سے بنائی گئی تھی۔ مقبرے کے اندر والے فرش میں سنگ موسے اور سنگ سیاہ کی گلکاری بڑی دیدہ زیب ہے گنبد کی چھت پر شیشے کا کام سکھا شاہی دور سے بعد کا ہے جو دو فرنگی عقیدت مندوں مسٹر ہیٹل اور مسٹر گبن کا خراج تشکر و ارادت ہے۔

انگریز راج کے زمانے میں مسٹر گبن ایک مشہور و معروف متمول تاجر تھا۔ اور ہیٹل اس کا کارندہ۔ ایک بار ان کے بحری جہاز جو سامان تجارت سے لدے تھے ڈوب گئے یا لاپتہ ہو گئے۔ تاجروں کے لئے یہ نقصان ناقابل برداشت تھا مسٹر ہیٹل آستانہ درویش پر حاضر ہوا اور نہایت عجز و انکسار سے حرف مدعا زبان پر لایا۔ معجزاتی طور پر جہاز بخیر و عافیت کنارے آ لگے۔ اس طرح حضرت شاہ میر کے عقیدت مندوں میں فرنگیوں کا اضافہ ہوا اور یہ آرائش معرض وجود میں آئی۔

راقم نے مزار میاں میرؒ پر‘ بلا امتیاز مذہب و ملت‘ ایسے ایسے عقیدت مندوں کو دیکھا ہے‘ جن کی موجودگی کا‘ کسی دوسرے مزار پر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ”ساون کے پہلے ہفتے میں ہر سال چار سکھ زائرین باقاعدگی سے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ یہ عقیدت مند چبوترے سے تھوڑے فاصلے پر‘ پائنتی کی جانب جھولی پھیلا کر‘ بے حس و حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ کسی سے ہم کلام ہوتے ہیں نہ کسی کے سوال کا جواب دیتے ہیں۔ بس لب بستہ دامن دراز کھڑے رہتے ہیں۔ کبھی چند منٹ کبھی چند گھنٹے۔ پھر جھولی سمیٹ کر خوشی خوشی مزار سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ جھولی سمیٹنے کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے اس میں کچھ آگرا ہو..... جانے کون ہیں اور کیا حاصل کرنے آتے ہیں مگر آتے ضرور ہیں۔

حال ہی میں ایک سرخ و سفید رنگت والا عقیدت مند راقم کو تعویذ کی پائینتی کی جانب بیٹھا نظر آیا۔ یہی کوئی پچاس کے پیٹے میں ہو گا.... جس والہانہ انداز سے وہ محو راز و نیاز تھا راقم کے لئے اچنبھے سے کم نہ تھا۔

”جناب کب سے یہاں تشریف فرما ہیں؟“ میں نے مودب لہجے میں پوچھا؟ مگر وہ اپنے وظیفے میں مشغول رہا۔ میرا اصرار جاری رہا‘ خدا خدا کر کے پتھر میں جونک لگی تو وہ بڑے دھیمے لہجے میں لب کشا ہوا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ ”کوئی پچیّس چھبیس برس پہلے کی بات ہے میں ذات کا بھنگی اور عیسائی مسلک کا‘ بگڑا ہوا نوجوان تھا“ تھوڑی دیر وہ سر جھکا کر بیٹھا رہا پھر زیر لب بڑی نفرت سے بڑبڑانے لگا ”چوہڑا چمار کہیں کا مرنے جوگا“ وہ اپنے آپ کو ہدف ملامت بنا رہا تھا پھر سوئے مزار دیکھ کر خاموش ہو گیا.....

”محترم پچیّس برس پہلے کیا ہوا تھا؟“ میں نے کرید جاری رکھی۔

”میں نے ماں کے پیٹ سے جنم لیا تھا“ اس نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”بڑا کڑیل جوان تھا میں مگر رنگت ہنڈیا کے پیندے سے زیادہ سیاہ تھی میرے نامہ‘ اعمال سے بھی زیادہ سیاہ“

مگر خال روئے یار سے تو زیادہ سیاہ نہ ہو گی“ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا.... اس نے چونک کر مجھے دیکھا انداز تھا ”دوست! شاید اپنا قارورہ مل گیا“ پھر وہ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔

”جو کچھ میرے پاس تھا شراب کباب کی نذر ہو گیا‘ اپنے آبائی پیشے کی طرف آنا‘ ممکن نہ تھا۔‘ ”دارو“ کا نشہ الگ اور روٹی کا الگ کوئی ایک مصیبت تھی؟ بھوکا پیاسا نشے کا مارا ادھر آنکلا یا

شاید نکیل کسی کے ہاتھ میں تھی، چار دیواری کے قریب پہنچا تو خیال آیا کہ یہ تو مسلمانوں کے پیر ہیں، کس رشتے ناتے، کس نسبت سے اندر جاؤں؟ پھر جیسے کسی نے دھکا دے کر اس دروازے کے اندر پھینک دیا" اس نے جنوبی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"میں دیوار کے سائے تلے سر جھکا کر بیٹھ گیا خلق خدا کا ہجوم تھا مگر پرسان حال کوئی نہ تھا میں نے نگاہ اٹھا کر سوئے مزار دیکھا "بابا بھوک لگی ہے روٹی دو" مجھے تو مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا مگر یہ میرے دل کی آواز تھی۔ آواز لرز رہی تھی۔"

کچھ مرے الفاظ کے تھے نا مناسب پیرہن
مدعا کچھ گم ہوا لرزا صدا کی اوٹ میں

بچپن میں اسی انداز سے اپنی ماں سے کھانا طلب کیا کرتا تھا۔ میں پھر سر جھکا کر بیٹھ گیا.....

اتنے میں ایک نورانی چہرے والی ہستی میرے قریب آئی۔ قد درمیانہ، روشن چہرہ کھڑی سی ناک بڑی بھلی لگ رہی تھی ابرو آپس میں پیوست تھے۔ اعضاء متناسب موٹے کپڑے کا کرتہ اور تہبند دستار مبارک بھی سوتی کپڑے کی مگر سارا لباس صاف ستھرا اور معطر سا۔ اس نے کھانے کا تشت میرے آگے رکھ دیا اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ بس ساری چھاپ تلک چھین لی، اپنے در کا کتا بنا لیا۔

"جناب! میں مسلمان نہیں ہوں اتنا ضرور یاد رکھیں" میں نے دو ٹوک بات کی تا کہ کوئی غلط فہمی نہ رہے.....

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ رب العزت تو نجس حیوانوں کو بھی روزی دیتا ہے تم تو اشرف المخلوقات ہو۔ کائنات کے دولہے ہو" انہوں نے بڑی رسان سے کہا

"ہائے وہ طرز تکلم، مگر میں تو بس کھانے پر ٹوٹ پڑا جیسے جنم جنم کا بھوکا کتا بغیر چبائے ہڈی بوٹی نگل جاتا ہے"

"عزیزم! جلدی کا ہے کی ہے آرام سے کھاؤ سب ٹھیک ہو جائے گا" میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کچھ بھی نہ تھا مگر وہ آواز؟ اس کی گونج ابھی تک میری سماعت میں زندہ سلامت موجود تھی۔ میں نے سوچا شاید میرے کان بج رہے ہیں"

مزار پر بیٹھا شخص آپ بیتی سنا رہا تھا مگر راقم کسی اور ہی عالم میں تھا۔ "محترم! آپ جانتے ہیں کسی ہستی کا آپ نے حلیہ بیان فرمایا ہے؟" میں نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکتے

ہوئے کہا۔

"اب اتنا بے خبر بھی نہیں ہوں، ربع صدی سے مالک کے در پر بیٹھا دم ہلا رہا ہوں اتنا شعور تو آ ہی جانا چاہئے...... " سرخ و سپید رنگت والے بزرگ نے مسکرا کر راقم کو دیکھا..... "یہی ہستی، یہی میرے مالک تھے" اس نے مزار کی طرف اشارہ کیا مگر اس زمانے میں تو میں واقعہ خر بے شعور تھا۔ بس میں اسی جگہ سایہ دیوار تلے بیٹھا رہتا۔ اناج اندر گیا تو اندر کے شیطان نے پر پرزے نکالے نشے کی طلب ہوئی چار دیواری سے باہر جانا چاہا تو جا نہ سکا بڑی عجیب صورتحال تھی"

"باہر جانے سے کون روک رہا تھا آپ کو؟" میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا.....

"اب آپ بے خبروں والی باتیں کر رہے ہیں" وہ کہنا "خر بے شعور" چاہتا تھا مگر مروت میں نازیبا الفاظ کا استعمال نہ کر سکا۔

"میں تھک ہار کر اپنی جگہ پر آ بیٹھا میرے سامنے مٹی کا پیالہ پڑا تھا، پانی سے لبالب بھرا ہوا۔ میں نے اٹھا کر وہی ہونٹوں سے لگا لیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن نشے کی طلب ہی جاتی رہی پھر ایک شام میں کھانا کھانے لگا تو وہی کانوں میں رس گھولنے والی آواز سنائی دی۔

"عزیزم! بسم اللہ نہیں پڑھو گئے؟" اب میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا، کون قدم قدم پر حیران ہوتا رہے

"مگر میں تو مسلمان نہیں ہوں" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا مگر اندر سے میں کانپ کر رہ گیا.... میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ناگہاں، کچھ نہ کچھ ہونے کو ہے

"کفر کا علاج کلمہ طیبہ ہے مگر غفلت کا کوئی علاج نہیں تم کافر ہو غافل تو نہیں" کانوں میں رس گھولا گیا۔

"بس جناب میں نے کلمہ طیبہ پڑھا اور اسی دن سے یہاں بیٹھا ہوں" یہ کہہ کر وہ سرخ سپید عقیدت مند درود شریف کا ورد کرنے لگا۔

"بس ایک سوال کا اور جواب دے دیں" راقم نے بے تکلفی سے پوچھا "بقول آپ کے آپکی رنگت خال روئے یار، یا ہنڈیاں کے پیندے جیسی سیاہ تھی مگر آپ تو....."

وہ سیاہی؟ وہ تو اندر کا اندھیرا تھا جس کا اظہار، روسیاہی کی شکل میں ہو رہا تھا.... اب تو اندر روشنی ہی روشنی ہے میرے مالک کی رنگین روشنی....."

"آپ کا پرانا نام کیا تھا؟" راقم نے پیش رفت جاری رکھی۔

"آخری سوال کے بعد بھی کوئی سوال ہوتا ہے" عقیدت مند میرؒ نے مجھے لاجواب کردیا مگر یہ کوئی مشکل کام نہ تھا..... ایک دوسرے عقیدت مند نے مجھے سب کچھ بتادیا۔

"وہ تو استاد محرم علی ہیں، پہلے عیسائی تھے پھر....."

"بس محترم اتنا ہی کافی ہے بقیہ ساری داستان سے میں واقف ہوں" راقم نے دوسرے ارادت مند کا شکریہ ادا کیا۔

راقم مزار سے رخصت ہونے لگا تو استاد محرم علی نے خود اشارے سے اپنے پاس بلایا اور رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔ باؤ صاحب! آپ تو پڑھے لکھے دکھائی دیتے ہیں یاد رکھیں، ساوا گیا تے کالا گیا، دھولا گیا تے رولا گیا" (لفظی ترجمہ سبز گیا، سیاہ گیا، سفید بال گیا تو سارا شور شرابا ختم ہوا یعنی بچپن سے مسیں بھیگیں پھر بال سفید ہوئے، سفید بال اپنے ساتھ زندگی کی رونقیں لے کر جاتے ہیں)

"استاد محرم علی! آپ تو بڑے استاد ہیں مگر میرے ذہن میں اب بھی چند ایک سوال ہیں"

"باؤ جی! بندے کو تھوڑا سا پریشان رہنا چاہیے یہی تو آگے بڑھنے کی چابی ہے" پھر استاد محرم علی نے استادانہ لہجے میں کہا

عقل والا تری محفل سے پریشان گیا
عشق والا تجھے ہر رنگ میں پہچان گیا

عظمت میاں میر بالا پیرؒ کا منہ بولتا ثبوت، استاد محرم علی زندہ سلامت مزار مقدس پر موجود رہتا ہے۔ جو چاہے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ آج کل آنکھوں کی گواہی معتبر گردانی جاتی ہے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

جناب عبدالحلیم شرر کی تاریخی کتب

			ISBN
جویائے حق	عبدالحلیم شرر	300-00	969-38-0074-8
رومتہ الکبریٰ	عبدالحلیم شرر	60-00	969-38-0073-7
ملک العزیز ورجنا	عبدالحلیم شرر	75-00	969-38-0074-5
فردوس بریں	عبدالحلیم شرر	75-00	969-38-0074-5
فلپانا	عبدالحلیم شرر	100-00	969-38-0057-5
مقدس نازنین	عبدالحلیم شرر	75-00	969-38-0056-7
حسن انجلینا	عبدالحلیم شرر	75-00	969-38-0055-9
فلورا فلورنڈا	عبدالحلیم شرر	90-00	969-38-0054-0
منصور موہنا	عبدالحلیم شرر	75-00	969-38-0053-2
فتح اندلس	عبدالحلیم شرر	120-00	969-38-0042-4
ماہ ملک	عبدالحلیم شرر	60-00	969-38-0094-6
زوال بغداد	عبدالحلیم شرر	100-00	969-38-0050-8
ایام عرب	عبدالحلیم شرر	75-00	969-38-0094-4
قیس ولبنیٰ	عبدالحلیم شرر	60-00	969-38-0060-5
مفتوح فاتح	عبدالحلیم شرر	50-00	969-38-0109-1
عزیزہ مصر	عبدالحلیم شرر	90-00	969-38-0059-1
دلکش کامل	عبدالحلیم شرر	100-00	969-38-0184-9
یوسف نجمہ	عبدالحلیم شرر	85-00	969-38-0210-1
شوقین ملکہ	عبدالحلیم شرر	100-00	969-38-00226-8
حسن کا ڈاکو	عبدالحلیم شرر	90-00	969-38-0239-x
بابک خرمی	عبدالحلیم شرر	75-00	

اسلامی کتب

			ISBN
بنام خیر الانام ؐ	قمر اجنالوی	75.00	969-38-0270-5
رسول عربی اور عصر جدید	سید اسمٰعیل صاحب	200-00	969-38-0004-4
غلامان اسلام	پروفیسر مولانا سعید احمد	125.00	969-38-0005-2
مرقع نبوت ؐ	آغا اشرف	175.00	969-38-0006-0
انبیائے قرآن ؑ	آغا اشرف	125-00	969-38-0046-8
عظمت رسول ؐ	نصیر الدین حیدر	250-00	969-38-0007-9
786 حکایات اولیائے کرام ؒ	نصیر الدین حیدر	200-00	969-38-0065-6
اہم اسلامی تاریخی واقعات	نصیر الدین حیدر	100-00	969-38-0272-1
اخلاق نامہ	نصیر الدین حیدر	90-00	
سیرت ابوبکر صدیق ؓ	علامہ عبدالحفیظ عتیقی	75-00	969-38-0045-1
الفاروق ؓ	مولانا شبلی نعمانی	125-00	969-38-0064-8
ام الکتاب	مولانا ابوالکلام آزاد	80-00	969-38-0062-1
مسلمان عورت	مولانا ابوالکلام آزاد	75-00	969-38-0063-5
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد	75-00	969-38-0172-5
حرف نیاز (مجموعہ نعت)	رفیع الدین ذکی قریشی	75-00	969-38-0271-3
ریاض نعت (")	رفیع الدین ذکی قریشی	75-00	969-38-0269-1
موت کا منظر	خواجہ محمد اسلام	80-00	
کرامات الاولیاء ؒ	مولانا ابو نعیم قمر	100-00	969-38-0199-7
سیرت حضرت عثمان غنی ؓ	زیب ملیح آباد	100-00	969-38-0208-x
سیرت حضرت علی ؓ	زیب ملیح آبادی	200-00	969-38-0248-9
تہذیب سیرت ابن ہشام	غلام احمد حریری	100-00	969-38-0202-0
اسلام کے درخشندہ ستارے	نصیر الدین حیدر	275-00	969-38-0263-2
اسلامی جنگیں	کیف زا	100-00	969-38-0127-x

مکتبۃ القریش ۰ قذافی مارکیٹ، اُردو بازار ۰ لاہور

ایک تاریخ ---- ایک ناول

صاحب طرز ادیب جناب اسلم راہی ایم ۔ اے کا شاہکار ناول

ابلیکا

جس میں حضرت آدمؑ سے لیکر حضور نبی کریم ﷺ تک دنیا کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اس کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے۔

قیمت حصہ اول	250-00	ISBN 969-38-0501-9
قیمت حصہ دوم	250-00	ISBN 969-38-0189-X
قیمت حصہ سوم	250-00	ISBN 969-38-0196-6
قیمت حصہ چہارم	300-00	ISBN 969-38-0206-3
قیمت حصہ پنجم	300-00	ISBN 969-38-0247-0
قیمت حصہ ششم	300-00	ISBN 969-38-0266-7
قیمت حصہ ہفتم	300-00	ISBN 969-38-319-1

بڑا سائز، سفید کاغذ، مضبوط جلد، پانچ ہزار سے زائد صفحات۔

آج سے تقریباً" ڈھائی ہزار سال پرانی تاریخ --- دیوتاؤں کے شہر بابل کی کہانی جسے صاحب طرز ادیب جناب قمر اجنالوی نے 35 سال کی طویل ریسرچ کے بعد قلمبند کیا۔

چاہ بابل قمر اجنالوی

دنیا کی سب سے بڑی داستان محبت، جو ایک سراپا جمال عورت اور ایک سراپا عشق نوجوان کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی۔ چاہ بابل تاریخی ناولوں کے ذخیرے میں ایک بہت روشن اور اہم اضافہ ہے۔

بڑا سائز، 800 صفحات، قیمت 400 روپے

ایک عظیم ناول ○ ایک عظیم تاریخ

فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبی

الماس ایم۔ اے کے قلم سے ---اردو زبان کا سب سے زیادہ ضخیم، دلچسپ، معلوماتی و اسلامی ناول

بڑا سائز، خوبصورت گردپوش، 500 سے زائد صفحات، قیمت 450 روپے

مکتبہ القریش ○ اردو بازار لاہور